...اور اِنسان مر گیا
رامانند ساگر
نیو ہند پبلشر لمیٹڈ بمبئی

..... اور انسان مرگیا

ساگر کی تصنیفات

اردو

جوار بھاٹا	افسانے
آئینے	
میرا ہمدم میرا دوست (زیر طبع)	طویل مختصر افسانے
اور انسان مر گیا	ناول

ہندی

اور انسان مر گیا	ناول
مادھا (زیر طبع)	طویل مختصر افسانے

...اور انسان مرگیا

ناول

رامانند ساگر

۱۹۴۸ء

اگست ۱۹۴۸ء - پہلا ایڈیشن

ناشران:

نو ہند پبلشرز لمیٹڈ - بمبئی

سہیل عظیم آبادی کے نام

بہار کے ہندوؤں نے جس کا سب کچھ لوٹ لیا
لیکن جس کی انسانیت کو کوئی نہ لوٹ سکا۔

راما نند ساگر

(اس ناول کے تمام کردار فرضی ہیں)

فہرس

دیباچہ

از خواجہ احمد عباس

(۱)

اندھیرا۔

چاروں طرف اندھیرا۔ اتنا گہرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ آسمان پر گھرے بادلوں کے پردہ سے ایک ستارہ بھی نہ جھانک رہا تھا۔

اتنا کثیف اندھیرا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ روشنی کا عدم ہی نہیں بلکہ ایک گہری کالی چادر ہے جسے زمین کی قبر پر چڑھا دیا گیا ہے۔

قبر جیسا اندھیرا۔ قبر جیسی خاموشی۔ اور اس خاموشی میں میرے

اپنے قدموں کی آواز جیسے کسی دوسری دنیا سے آرہی تھی۔

اسی اندھیرے میں راستہ بھول کر میں نہ جانے کب سے بھٹک رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آیا تھا۔ نہ جانے میرے قدم منزلِ مقصود کی طرف لے جا رہے تھے یا اس کی مخالف سمت میں۔

اندھیرا۔ خاموشی۔ اور ایک سرد ہوا جو برفیلے تیروں کی طرح میرے جسم میں پیوست ہوتی چلی جارہی تھی۔ پاؤں اور ہاتھ سردی سے سُن ہو چکے تھے۔ کان اور ناک برف کے ٹکڑے بن چکے تھے۔ ڈر تھا کہیں ٹوٹ کر نہ گر پڑیں۔

اندھیرا نہ صرف میرے گرد وپیش پر چھایا ہوا تھا بلکہ میرے دل ودماغ پر بھی۔ کدھر جانا ہے اور کیوں اور کب؟ یہ میں نہ جانتا تھا۔ یاس اور ناامیدی کی تاریکی میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن بھی تو نہ چمکتی تھی —— نہ صرف راستہ ہی کھو گیا تھا، بلکہ منزل بھی فراموش ہو چکی تھی۔

میں کھویا جاچکا تھا —— منزل کو پانے کی آخری امید بھی زائل ہو چکی تھی —— جب مجھے اس اندھیرے سمندر میں روشنی کا ایک ننھا سا موتی چمکتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسی سمت میں قدم بڑھا دیئے۔

وسیع تاریکی میں صرف اسی ایک مکان میں روشنی تھی۔ اور یہاں پر بھی صرف ایک کمرے میں۔ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا میں دروازے تک پہنچا، کھٹکھٹایا اور کسی انجان دوست کی مہربانی سے دروازہ کھول کر مجھے اندر لے لیا گیا۔

کمرے میں ایک کم طاقت کا "ننگا" (یعنی "شیڈ" کی ستر پوشی کے بغیر) بلب اپنا پیلا منہ لئے ہوئے ٹمٹا رہا تھا۔ آتشدان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اور دیواروں پر بیس بائیس آدمیوں کے سائے ناچ رہے تھے۔ دس بارہ سگریٹوں اور ایک پائپ کا دھواں کمرے میں اس طرح بھرا ہوا تھا۔ کہ کسی کی شکل پہچاننا مشکل تھا۔

باہر اندھیرا تھا اور یہاں روشنی۔ باہر بے رحم سردی تھی اور یہاں رفیقانہ، روح پرور آنچ۔ باہر سناٹا تھا ـــــ ایک مہیب اور محیط سناٹا ـــــ اور یہاں جوشیلی آوازیں، نوجوان قہقہے، اشعار کا ترنم۔

یہ کمرہ کیا تھا؟ یہ لوگ کون تھے؟

جب سارے ہندستان پر مجنونانہ قتل و غارت کے بعد مرگھٹ کی سی خاموشی۔ قبرستان جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا تو یہاں یہ زندہ آوازیں کیوں؟ اندھیرے کے میدان میں یہ ایک روشن کمرہ ـــــ تاریکی کے سمندر میں نور کا یہ تنہا جزیرہ ـــــ یہ کس حقیقت کا مظہر تھا؟

یہ کمرہ سری نگر کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں تھا۔ اور اس میں وہ مصنف اور شاعر، اخبار نویس، آرٹسٹ اور فوٹوگرافر جمع تھے جو ہندستان کے کونے کونے سے کشمیر کے جمہوری انقلاب کو مدافعتی جنگ کے شعلوں سے پیدا ہوتے ہوئے دیکھنے آئے تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی اور سکھ بھی۔ وہ بھی تھے جو مغربی پنجاب میں اپنا سب کچھ کھو کر آئے تھے اور وہ بھی جن کو مشرقی پنجاب میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا تھا۔ وہ سب فساد

کی آگ سے جھلسے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سے امید سے منہ موڑ چکے تھے۔ وہ انسانیت کی قبر پر فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ انقلاب کا کریا کرم کر آئے تھے۔ پھر بھی وہ سب کشمیر آئے تھے۔ کیونکہ اس وقت ہندستان کی مہیب اور محیط تاریکی میں یہی ایک روشن کمرہ تھا جہاں انسانیت اور امید کی شمع ابھی تک روشن تھی۔ ٹمٹمار ہی تھی۔ تند ہواؤں کے درمیان لرز رہی تھی ـــــــ مگر روشن تھی ...

جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو کوئی کچھ پڑھ رہا تھا۔ یہ راما نند ساگر تھا، رومان پرست، عاشق مزاج، نفاست پسند، فن کار راما نند ساگر جو چند ہی روز ہوئے شرنارتھیوں کے ایک لٹے کھٹے قافلے کے ساتھ اپنے بال بچوں کو لے کر دہلی پہنچا تھا۔ اور فوراً ہی ان کو وہاں چھوڑ کر کشمیر کے محاذ جنگ پر چلا آیا تھا۔

وہ اپنے ناول کا ایک باب سنا رہا تھا۔ اور سننے والوں میں کچھ کسی خوفناک خواب میں کھوئے ہوئے تھے اور کچھ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ناول کا نام تھا" ... اور انسان مرگیا"

".. اور انسان مرگیا۔!"

بار بار ناول میں بیان کئے ہوئے حادثات اس خوفناک ٹریجیڈی کا اعلان کر رہے تھے" اور انسان مرگیا! اور انسان مرگیا!"

پھر بھی راما نند ساگر اپنے بیوی بچوں کو دہلی کے ایک خالص مسلم علاقے میں گھر لے کر چند غیر معروف غریب مسلمان ہمسایوں کے بھروسے پر

چھوڑ آیا تھا۔

"اور انسان مر گیا!"

وہ سنا رہا تھا اور مجھے وہ انسانیت اور امید کی ایک مجسم شمع دکھائی دے رہا تھا ـــــ گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی کرن بن کر منزل کا راستہ دکھانے والی شمع ـــــ

اب اندھیرا نہیں تھا۔ میں نے نور کا وہ موتی پا لیا تھا ـــــ

"اور انسان مر گیا"

(۲)

"یہ سب انگریزوں کا کیا دھرا ہے"

"سامراجی چال ہے"

"ہندستان کے فسادات میں برطانیہ اور امریکہ کا ہاتھ ہے"

"اس قتل و غارت کے ذمہ دار سرمایہ دار ہیں"

"راجے مہاراجے اور نواب ہیں"

"زمیندار اور تعلقہ دار ہیں"

"برلا، ٹاٹا اور ڈالمیا ہیں"

غرض یہ کہ "فعلِ بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر!" اور یہ بات عام ہے۔

خیریت ہوئی کہ راما نند ساگر کسی پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔ اگر کمیونسٹ ہوتا

تو سامراج اور سرمایہ داری پر لعنت بھیج کر چپ بیٹھ رہتا یا موضوع سخن بدل کر تلنگانہ کے بہادر چھاپہ ماروں کا ذکر شروع کر دیتا۔ سوشلسٹ ہوتا تو کمیونسٹوں کی پاکستان پروری کو گالیاں دے کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے الکشنوں میں مصروف ہو جاتا۔ کانگریسی ہوتا تو مسلم لیگ والوں کو صلواتیں سنا کر شراب بندی کا پرچار شروع کر دیتا۔ مہا سبھائی ہوتا تو گاندھی جی اور کانگریس کی مسلم نوازی کو کوستا۔ اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے ویروں کے گن گاتا۔

مگر خوش قسمتی یا بد قسمتی سے وہ کسی پارٹی کا ممبر نہیں۔ صرف انسان پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ انسانیت کے علمبردار فن کاروں کی اس بلند مرتبت صف کا ایک رکن ہے۔ اسی لئے وہ سیاسی اور ہنگامی تاویلیں تلاش نہیں کرتا۔ اس نے انسانیت کو بہیمیت میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے اور وہ تڑپ اٹھا ہے۔ اور اس درندگی کے لئے وہ ذمہ دار ٹھہراتا ہے ــــــ انسان کو! ہندوستانی کو! ہندو اور مسلمان اور سکھ کو! اونچے طبقے والوں کو اور نیچے طبقے والوں کو! ــــــ آخر نفرت اور خون کے اس سیلاب میں کروڑپتی سیٹھ اور بھوکے کسان سب ہی تو بہہ گئے تھے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" سامراج کا پرانا اصول رہا ہے۔ ہندستان میں فرقہ پرستی کو ــــــ ہندو مہا سبھا مسلم لیگ، اکالی پارٹی اور ایسی ہی دوسری فرقہ پرست جماعتوں کو برطانوی حکومت نے کس کس طرح شہ دی ہے اس سے بھی ہم واقف ہیں "ہندو پانی۔ مسلم پانی"، "ہندو یونیورسٹی۔ مسلم یونیورسٹی"، "ہندو اسکول مسلم اسکول"

اور اسی قسم کی دوسری مذہبی تفریقات سے کس طرح فرقہ وارانہ عناد اور نفرت کو پروان چڑھایا گیا ہے یہ بھی ہم جانتے ہیں۔

مگر نفرت کرنا ایک چیز ہے۔ لیکن اس نفرت کا اظہار مختلف الگ الگ طریقوں سے ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔

امریکہ کے سرمایہ دار کمیونسٹ روس سے کتنی نفرت کرتے ہیں! امریکہ میں کتنا خوفناک پراپیگنڈہ روس اور کمیونزم کے خلاف کیا جا رہا ہے! مگر آپ نے یہ کبھی نہ سنا ہو گا کہ نیویارک کی سڑکوں پر ہر راہ چلتے روسی کو چھرا بھونک کر ہلاک کر دیا گیا یا کمیونسٹ عورتوں کو ننگا کر کے ان کا جلوس نکالا گیا۔

جنگ کے دوران میں برطانیہ اور جرمنی میں کتنی نفرت تھی۔ دونوں طرف سے پراپیگنڈے کا ہر ممکن طریقہ اس نفرت کو پھیلانے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اخبار، ریڈیو، فلم ——— اور پھر اس نفرت کو بمباری سے کتنی تقویت پہنچ رہی تھی۔ نازیوں نے لندن پر بم برسا برسا کر ہزاروں نہتے غیر فوجی شہریوں کو مار ڈالا، لاکھوں کو بے گھر کر دیا۔ انگریزوں نے بھی جرمنی کے شہروں سے پورا پورا بدلہ لیا۔ مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ جرمنوں نے انگریز قیدیوں کا تکا بوٹی کر دیا ہو، یا فتح کے بعد انگریزوں نے جرمن عورتوں کو سربازار بے آبرو کیا ہو۔

ممکن ہے ہم میں سے کچھ ایسے ہوں جنھیں باقاعدہ جنگ کی ہولناک بمباری اور فسادات میں جو کچھ ہوا اس میں کوئی فرق نظر آتا ہو۔ مگر مجھ میں اتنی خود فریبی کی طاقت نہیں ہے۔ میں اپنے ایک محترم کمیونسٹ ساتھی (جو پارٹی

کے لیڈروں میں سے ہیں) کی زبانی یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ کہ ہندو اور مسلمانوں اور سکھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جو کچھ پنجاب میں کیا۔ اس کو وہ کوئی خاص شرمناک واقعہ نہیں سمجھتے اور نہ اس سے ہماری تہذیب اور تمدن پر بٹہ لگتا ہے۔ کیونکہ نام نہاد مہذب یورپین بھی جنگ کے دوسرے طریقوں سے ایسا ہی کرتے ہیں۔

میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

ایٹم بم بے شک ایک ظالمانہ، خوفناک، منحوس ہتھیار ہے۔ مگر میں ان لوگوں کو مقابلتاً زیادہ مہذب سمجھتا ہوں جو ایک ایٹم بم کو گرا کر لاکھوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔ بہ نسبت ان کے جو سربازار دوسرے فرقے کی عورتوں کی شرمگاہوں میں تلواریں ٹھونستے ہیں۔ اور پھر اس شیطانی مذاق پر ہنستے ہیں۔

ساگر کے ناول میں آپ کو بار بار یاد دلایا جائے گا کہ آپ اور میں ہم سب، تہذیب اور انسانیت کے راستے سے کتنی دور ہٹ گئے تھے۔ بار بار انسان کو آئینہ دکھایا جائے گا کہ وہ اپنے شیطانی خدوخال کو پہچان لے۔ اس ناول کو پڑھتے وقت آپ کو انسانیت کی ارتھی کو مرگھٹ تک پہنچانا ہوگا، چتا کے شعلوں میں اُسے جلتے دیکھنا ہوگا۔

شاید انسان کی موت کے بعد ہی انسان ——— اصل انسان ——— پیدا ہوگا۔

خود فریبی کتنی خطرناک ہوتی ہے! - یہ ۴۷ء کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے۔

مہاتما گاندھی (جن سے بہتر قوم کا نباض نہ پیدا ہوا نہ ہوگا) اس خوش آئند فریب میں مبتلا تھے کہ فرقہ پرستی اور نفرت صرف شہروں تک محدود ہے اور گاؤں میں ہندو مسلمان امن اور شانتی اور پریم سے رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان پڑھ کسان طبیعتاً عدم تشدد کے پیرو ہوتے ہیں اور ۴۷ء کے زیادہ ہولناک واقعات دیہاتی علاقوں ہی میں ہوئے۔

پنڈت جواہرلال نہرو (اپنے وسیع مطالعے مگر محدود مشاہدے کی بنا پر) اس فریب میں مبتلا تھے کہ فرقہ وارانہ نفرت کا جذبہ صرف اونچے اور درمیانی طبقوں تک محدود ہے جو نوکریوں اور اسمبلی کی ممبری کی خاطر فرقہ وارانہ سوال اٹھاتے ہیں۔ مگر عوام فرقہ پرستی کے زہریلے تاثرات سے محفوظ ہیں۔

ہمارے کمیونسٹ بھائیوں کا تو بنیادی فلسفہ ہی یہ ہے کہ "عوام معصوم ہیں۔ عوام کبھی کوئی بھول نہیں کرتے"۔ ان کے اعتقاد کے بموجب ہر مزدور اور کسان سوائے طبقاتی کش مکش کے کسی اور بات میں اعتقاد نہیں رکھتا مگر ۴۷ء کی خون ریزی میں مزدور اور کسان (خصوصاً کسان) اور سب طبقوں پر بازی لے گئے۔ ان علاقوں میں بھی قتل و خون کم نہ تھا۔ جہاں کمیونسٹوں کی کسان سبھائیں موجود تھیں۔

اس کی تاویل یوں کی جاتی ہے کہ عوام کو بہکایا گیا تھا۔ کس نے؟

انگریزی سامراج نے! سرمایہ داروں نے! زمینداروں نے!

میں مان سکتا ہوں کہ انگریزی سامراج کے مقاصد ایسی خونریزی سے ضرور پورے ہوتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی طرف سے انھوں نے فرقہ پرستی کو ہر ممکن مدد پہنچائی ہے۔ مگر کیا انھوں نے فرقہ دارانہ جنگ کے طریقے بھی ہمیں سکھائے اور پڑھائے تھے ——— وہ طریقے جو ہم نے ۱۹۴۷ء میں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کئے؟ اور کیا ہم اتنے اندھے، اتنے بے وقوف ہیں کہ ان کے بہکاوے میں فوراً آگئے۔ جب ہم سو برس سے انہی انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے آئے ہیں؟ کیا انگریزوں نے ہمارے کان میں کہہ دیا تھا کہ جو ہندو جہاں ملے اس کا سر اڑا دو۔ جو مسلمان ملے اس کے پیٹ میں چھرا بھونک دو؟ کیا انگریزوں نے ہمیں یہ بھی تعلیم دی تھی کہ مخالف فرقے کی عورتوں کے ساتھ سربازار زنا کرو، ان کے پستانوں اور شرمگاہوں پر، پاکستان یا "جے ہند" کے حروف گُدوا دو ——؟

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی افسروں نے فسادات کو روکا نہیں ——
بے شک۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور کیوں روکتے وہ؟ آزادی ہم نے مانگی تھی پھر ہمیں کیا حق ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہوں تو اس سامراج سے امید رکھیں کہ وہ آکر ہم میں صلح صفائی کرائے؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عوام کی بے پناہ طاقت کو غلط راستے پر ڈال دیا گیا۔ ان کی اقتصادی جنگ کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا گیا۔

گویا یہ بہتر ہوتا اگر ہندو اور مسلمان کسان اور مزدور مل کر سرمایہ داروں کا گلا کاٹتے، زمینداروں کی بہو بیٹیوں کو بے آبرو کرتے، انگریز لڑکیوں کے برہنہ جلوس نکالتے! اور کیوں کہ یہ نہ ہو سکا اس لئے وہ ایک دوسرے پر ہی ٹوٹ پڑے۔

نہ جانے یہ باتیں ہم دنیا کو دھوکا دینے کے لئے کرتے ہیں یا خود کو فریب دینے کے لئے۔

(۴)

فسادات میں جو کچھ ہوا اس کا تجزیہ اور تشخیص کرنے کے لئے تاریخ دانوں، اقتصادیات کے عالموں اور ماہرانِ نفسیات کی ایک کمیٹی مدت تک چھان بین اور غور و خوض کرے تو شاید مفصل طور پر معلوم ہو سکے کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ میں خود کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔ مگر چند بنیادی تاریخی اور سماجی حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو شاید اس ہولناک صورتِ حال کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے درمیان نفرت کا بیج بویا جا چکا تھا۔ اکبر اور دوسرے مغل بادشاہوں نے قومی یگانگت اور اتحاد قائم کرنے کی جو کوششیں کی تھیں ان کا اثر اورنگ زیب کے کٹر مذہبی عقائد کی وجہ سے بہت کچھ زائل ہو گیا تھا۔ شیواجی کو مغلیہ سلطنت سے مدت تک جو جد و جہد کرنی پڑی اس کی وجہ سے

مرہٹوں اور مسلمانوں میں نفرت اور دشمنی ہونا لازمی تھی۔ اسی طرح سکھوں کے فرقے پر جو تشدد کیا گیا اس کی وجہ سے وہ بھی مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے اس زمانے کے عوام سیاست اور اقتصادیات کے مسائل کو نہ سمجھتے تھے اس لئے وہ ہر مسلمان کو ظالم حکومت کا نمائندہ سمجھتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں سکھوں نے مسلمانوں سے بدلہ چکانے کے لئے انگریزوں کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت اور بڑھ گئی۔ آج تک دہلی کے گردونواح کے مسلمان گھرانوں میں بڑی بوڑھیاں اپنے کسی بچے کو چوٹ آجائے تو کہتی ہیں " اب ایسے دور کی سکھ فرنگی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی "

مذہبی تعصب اور کٹرپن ہندوں، مسلمانوں اور سکھوں سب میں موجود ہے۔ اس تعصب میں تشدد کا عنصر بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمان پرانے مجاہدوں اور فاتحوں کے قصے سن سن کر بڑے ہوتے ہیں۔ اور کافروں سے جہاد کرنے کو ثواب سمجھتے ہیں "تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں "۔ عام طور سے ہر مسلمان کے دماغ میں بیٹھا ہوا ہے کہ " ایک مسلمان دس کافروں پر بھاری ہوتا ہے " کیونکہ ایک زمانے میں مسلمان شہنشاہ ہندستان پر حکومت کرتے تھے اس لئے اکثر مسلمان اسلامی حکومت کے خواب دیکھتے تھے۔ اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ مسلمان عوام تب بھی بھوکوں مرتے تھے اور اب بھی مرتے ہیں۔ اسی طرح ہندوں کے اکثر فرقوں میں مسلمانوں سے بدلہ لینے کا خیال تحت الشعور میں ملتا چلا آرہا ہے۔ مرہٹوں،

سکھوں، آریہ سماجیوں، بنگالی دہشت پسندوں کی مذہب آمیز سیاسی تحریکوں میں تشدد اور مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کے شروع میں مسلمانوں کو جہاں تک ممکن ہوا دبایا اور ہندوؤں کو اپنایا۔ اس لئے مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں سے بھی نفرت بیٹھ گئی۔ پھر جب ہندوؤں میں قومی تحریک نے زور پکڑا تو انگریزوں نے مسلمانوں کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور انھیں اپنایا۔ تاکہ ان کو قومی تحریک کے خلاف استعمال کیا جائے۔ فرقہ وارانہ انتخاب کے ذریعہ، فرقہ وارانہ سیاست کو فروغ دیا گیا۔ اور سیاسی اتحاد کے امکانات کو کم کر دیا گیا۔

سامراج کی مہربانی سے ہندستان کے عوام ان پڑھ رہے۔ غریب رہے۔ جاگیرداری نظام ان پر مسلط رہا۔ مذہبیت اور توہم پرستی ان پر غالب رہی۔ صنعتی انقلاب اور تعلیم، جمہوری نظام اور سائنس کی مدد سے ان کو غیر عقلی اثرات سے بچایا جا سکتا تھا۔ مگر سامراج کو کیا پڑی تھی کہ عوام کو تعلیم اور تہذیب دے کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مارے۔

ہندستان کے اکثر دیہاتی علاقوں میں تہذیب اور تمدن میں مستقل ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ بیسویں صدی میں بھی وہاں سولھویں یا سترہویں صدی جیسے حالات پائے جاتے ہیں۔ تمدنی ترقی سے انسانیت میں جو نفاست اور شائستگی تحمل اور رواداری پیدا ہوئی ہے اس سے وہ بڑی حد تک محروم رہے ہے۔ یہ غلط ہے کہ گاؤں کا کسان قدرتاً عدم تشدد کا پیرو ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مدت تک حکومت اور زمینداروں کا ظلم سہتے سہتے اس میں ایک

غلط قسم کا صبر پیدا ہو گیا ہے ۔ بغاوت کا مادہ کم ہو گیا ہے ۔ مگر تشدد کا عنصر اس
میں کم نہیں ہوا ۔ اس لحاظ سے وہ ابھی انسانی ارتقا کے اولین مدارج ہی سے گزر
رہا ہے ۔ کتنی ہی بار آپ سنتے ہیں کہ پنجاب کے کسی گاؤں کے کسانوں میں نہر کا
پانی کاٹنے پر جھگڑا ہو گیا اور آٹھ دس آدمی مارے گئے یا زخمی ہوئے ۔ بیوی پر
آوارگی کا شبہ ہوا اور اس کی ناک کاٹ ڈالی ۔ رقیب کو گنڈاسے کے
ایک وار سے ہلاک کر ڈالا ۔ ایسی باتوں سے عدم تشدد کا ثبوت تو نہیں ملتا
ہاں ایک غیر عقلی بلکہ جنونی حد تک بڑھی ہوئی عزت نفس اور خوفناک انتقامی
جذبے کا پتہ ضرور ملتا ہے ۔ اب اسی جاٹ سے کہہ دیجیے کہ مخالف فرقے والے
اس کے فرقے کی عورتوں کی بے عزتی کر رہے ہیں تو وہ یہ بھی نہ پوچھے گا کہ کس نے
یہ جرم کیا ہے اور کہاں ۔ اور بجائے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے گنڈاسا ہاتھ
میں لے کر نکل پڑے گا ۔ اور مخالف فرقے کا مرد ملے گا تو اس کا سر اڑا دے
گا ۔ عورت ملے گی تو اس کی ناک کاٹ ڈالے گا ۔ یا اس کے ساتھ زنا بالجبر کرے
گا ۔ جب اس جیسے بہت سے جمع ہو جائیں گے ۔ تو مخالف فرقے کے کسی پورے
کے پورے گاؤں پر حملہ کر کے گھروں میں آگ لگا دیں گے ، عورتوں کو برہنہ
کر کے ان کا جلوس نکالیں گے ۔ بچوں کو کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہوں میں
ڈالیں گے ۔ اور غرض یوں اپنی انتقام کی آگ کو بجھائیں گے ۔ چاہے بعد میں
یہی کیوں نہ معلوم ہو کہ وہ پہلی خبر غلط تھی ۔ اور کیونکہ مخالف فرقے میں بھی ایسے
لوگوں کی کمی نہیں ہے اس لئے تشدد اور قتل اور انتقام اور بربریت کا ایک
چکر بندھ جائے گا جس کا کوئی خاتمہ ہی نہ ہو گا ۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کے اکثر حصوں میں جاگیردارانہ نظام کی بدولت تقسیم دولت و زمین نہایت غلط اور غیر منصفانہ طریقے سے ہوئی ہے۔ مثلاً مشرقی بنگال میں زمیندار زیادہ تر ہندو ہیں اور کسان عام طور سے مسلمان۔ پنجاب میں ساہوکار ہندو ہیں اور کسان مسلمان۔ یو پی میں زمیندار اور تعلقہ دار عام طور سے مسلمان ہیں اور کسانوں کی اکثریت ہندو۔ اس وجہ سے اقتصادی کش مکش میں بھی ایک طرح کا فرقہ وارانہ رنگ آ گیا ہے۔ اور فرقہ وارانہ لیڈروں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک کسان کو زمیندار کے خلاف لڑانے میں وقت لگتا ہے۔ مگر مسلمان کسان کو سکھ زمیندار یا ہندو ساہوکار کے خلاف بھڑکانا آسان ہے۔ مذہبی جنون کو جب اقتصادی کش مکش کا بہانہ مل جائے تو اور بھی خوفناک ہو جاتا ہے۔

یہ سب عناصر فسادیں موجود تھے۔ مگر ان کے علاوہ کچھ اور بھی تھا جس کے بارے میں میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا تھا۔ شاید ہندستان کے عوام ابھی تک پوری طرح مہذب اور متمدن ہی نہیں ہوئے ہیں! شاید ہمارے قومی کیریکٹر میں ابھی تک ایک بزدلانہ بربریت اور ایذا پرستی کا مادہ موجود ہے۔ اگر ایسا ہے تو محض سیاسی تبدیلیاں یا اقتصادی انقلاب نہیں بلکہ تعلیم اور کلچر ہی اس کا توڑ کر سکتی ہیں۔ شاید ہمارے عوام کی جنسی زندگی کی گھٹی ہوئی خواہشیں قتل و غارت اور جنسی ایذا پرستی کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ اور پھر یہ مکروہ جذبات کوئی ان پڑھ کسانوں یا جاہل غنڈوں ہی تک تو محدود نہ تھے۔ بمبئی کے سینڈہرسٹ روڈ پر جب کسی مسلمان کو شکار کیا جاتا تھا تو متوسط درجے کی عورتیں بالکنی میں کھڑی

ہو کر تماشہ دیکھتی تھیں اور ہنستی تھیں۔ شیخوپورہ میں جب ہندوؤں کا قتل عام ہو رہا تھا تو مسلمان عورتیں ہنسی خوشی اپنے گھروں کی چھتوں سے، اپنے ہندو ہمسایوں کے مکان جلنے کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اِکا دکا واقعات ضرور ہوئے ہیں جو امید دلاتے ہیں کہ انسانیت کی چنگاریاں ابھی بھی نہیں ہیں۔ اور ان واقعات کو منظر عام پر لانا چاہئے۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیشہ کے لئے انسان کا انسان پر بھروسہ ہی ختم ہو جائے۔ مگر عام طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم میں سے بیشتر اس خون اور نفرت کے جنون میں گرفتار تھے۔ جو خود قتل اور لوٹ اور عورتوں کو بے آبرو کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے وہ دوسروں کی ان حرکتوں کو سراہتے تھے، ان کی داد دیتے تھے، ان کی مدد کرتے تھے۔ جرم، اقدام جرم یا مجرم کے ساتھ ہمدردی رکھنا ایک ہی بات ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ "فسادات کے زمانے میں ہم نے اپنی انسانیت کو قائم رکھا تھا"؟

(۵)

یہ سب میں اپنی رائے لکھ رہا ہوں۔ رامانند ساگر کے ناول میں یہ باتیں نہیں لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن جب سے میں نے یہ ناول پہلے سنا اور پھر پڑھا ہے تب سے یہ خیالات میرے دماغ میں آرہے ہیں۔ اور جب آپ پڑھیں گے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی یہ خوفناک شکوک اور شبہات ستائیں گے، شاید میری طرح آپ کی نیند اڑا دیں گے، آپ کا چین آرام حرام کر دیں گے۔

رامانند ساگر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے انسان اور انسانیت کو مرتے دیکھا۔ مگر خود ساگر کی انسانیت ختم نہیں ہوئی۔ یہ انسانیت، یہ انسان دوستی آپ کو اس ناول کے ہر باب، ہر صفحے، ہر سطر میں نظر آئے گی۔ ان کرداروں میں نظر آئے گی جو فرضی ہونے کے باوجود اصلی ہیں، جو ناول میں یکے بعد دیگرے مر جانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں — اوشا۔ آنند۔ مولینا۔ کشن چند اور نرملا — اپنی اپنی جگہ ان میں سے ہر ایک رامانند ساگر کی انسان دوستی کا مظہر (Symbols) ہے۔ مگر ان سب سے بڑھ کر اجاگر سنگھ کا کردار ہے۔ جس نے اپنے بیوی بچوں کو اپنے ہاتھوں مارا ہے، جو ایک ٹین کا ٹکڑا ہاتھ میں لئے مسلمانوں کی تلاش میں پھر رہا ہے جو جنون میں چلاتا رہتا ہے "میں بچ گیا — میں بچ گیا" گویا طنز مجسم ہو کر انسانیت کی لاش سے کہلوا رہی ہے "میں بچ گیا — میں بچ گیا"۔ یا پھر اننتی کا کردار ہے — وہ عورت، وہ ماں، بھارت ماتا، مادرِ ہند — جس کو اسکی اپنی اندھی، دیوانی، شیطانی اولاد نے بے آبرو کیا ہے اور جس کے دماغ پر برہنہ جلوس کا ہولناک منظر اس بری طرح طاری ہے کہ وہ اب بھی اپنی دھوتی کو شرمگاہ سے اوپر اٹھا کر چیختی ہے "لو دیکھ لو۔ لو دیکھ لو"

اس ناول کے اکثر مناظر آپ برداشت نہ کر پائیں گے۔ میری طرح آپ کی آنکھوں سے آنسو بہیں گے۔ اور آپ کتاب بند کر دیں گے۔ لیکن پھر اسے پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔

اس کے دیوانے کردار بھوتوں کی طرح آپ کے دماغ میں منڈلاتے

رہیں گے۔ آپ کے کانوں میں کبھی اجاگر سنگھ کی مجنونانہ پکار آئے گی "میں بچ گیا۔ میں بچ گیا"، کبھی انتی کی آواز فضاؤں کو تھرا جائے گی۔ کبھی آنند کے آخری الفاظ ——— جب اس کارواں کا آخری انسان بھی مر گیا ——— سنائی دیں گے "تم سب انسان ہو۔ تم سب انسان ہو ... میں انسان کو مار ڈالوں گا ... ... "

ایسے بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک واقعات آپ نے پہلے بھی سنے ہیں اور پڑھے ہیں۔ لیکن ایسا اثر آپ پر پہلے کبھی نہیں ہوا۔ یہ فن کار کا نہ صرف ادبی کمال ہے بلکہ اس کے خلوص اور انسان دوستی کا نتیجہ ہے۔ یہ ہنگامی لٹریچر نہیں۔ ایک کلاسیک ہے۔

اس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت ہیں۔ وہ اس ناول کے ذریعہ ——— اس کے کرداروں کے ذریعہ آپ کو آئینہ دکھا رہا ہے کہ اس میں آپ انسان کے یعنی اپنے مسخ شدہ خدوخال دیکھ لیں۔ خوب پہچان لیں کہ انسانیت کے مرنے کے بعد انسان کی کیا شکل ہو جاتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس ناول کے خونیں صفحات قلمبند کرتے وقت ساگر پر کیا گزری ہوگی، اُسے ہر مقتول کے ساتھ قتل ہونا پڑا ہوگا۔ ہر مظلوم عورت کے ساتھ آبرو کھونی پڑی ہوگی۔ بچہ بن کر وہ سنگینوں سے گدا ہوگا۔ بوڑھا ہو کر اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی اولاد کو ذبح ہوتے دیکھا ہوگا۔ تب یہ ناول لکھا گیا

ہوگا۔ مگر اس کی حساس طبیعت کو جانتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ یہ ناول نہ لکھتا تو اس پر اس سے بھی بری گذرتی۔ فن کار اور دوسروں میں یہی فرق ہے۔ فن کار کے لئے جو درد ہے وہی اس کی دوا بھی ہے۔ راما نند ساگر نے یہ ناول لکھ کر اوروں پر نہیں اپنی ذات پر احسان کیا ہے۔

مگر کیونکہ اس کا درد انسانیت کا درد ہے اور اس کا غم انسانیت کا غم، اس لئے اس کی آواز انسانیت کی آواز بن گئی ہے۔

"اور انسان مرگیا"

یہ اعترافِ شکست نہیں اعلانِ جنگ ہے ـــــ ان منحوس شیطانی قوتوں کے خلاف جنھوں نے انسان کا خون کیا!

عذرِ گناہ

نفرت میں جتنی طاقت ہے۔ اتنی پیار کے جذبہ میں نہیں!

میں اس ناول کے ذریعہ آپ میں نفرت کے جذبات بیدار کرنا چاہتا ہوں
تاکہ ان میں طاقت بھی زیادہ ہو اور پائندگی بھی۔

موجودہ دور میں مہاتما گاندھی اور ان جیسی دیگر عظیم ہستیوں اور ماضی
میں بڑے سے بڑے پیغمبروں اور اوتاروں نے آپ کو محبت کرنا سکھایا ہے۔
انسانیت سے، نیکی سے پیار کرنے کی تعلیم انھوں نے دی ہے۔ لیکن آپ نے
اپنے کئی ہزار سال کے مسلسل چلن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ کہ آپ
کی نفرت پائندہ ہے، محبت نہیں۔ زور دینے پر محبت کو ایک بیرونی پردے

کی طرح آپ وقتی طور پر اوڑھ سکتے ہیں۔ لیکن آزادی ملتے ہی آپ اس نقاب کو نوچ پھینکنا چاہتے ہیں۔ اور پھر آپ اپنے من چاہے کھیلوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت آپ ہر گزشتہ جنگ سے بڑی ایک اور جنگ لڑتے ہیں، نفرت کی فسادانگیز اور قحط خیز سیرگاہوں میں انسانی خون کے سرخ فوارے آسمان کی بلندیوں کو فتح کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں اور کسی شاہجہاں کی آنکھ سے محبت اور وفا کے نام پر بہائے گئے اُس ایک آنسو ــــــ تاج محل کو منجمد سفید خون سے بنائے گئے پتھروں کا ایک ڈھیر بنا دیا جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے نہیں ہوتا کہ آپ کو انسانیت سے دشمنی ہے (کیونکہ آخر انسان آپ ہی تو ہیں، اور اپنی تباہی کسی کو عزیز نہیں ہوتی) بلکہ شائد آپ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں۔ کہ آپ کو پیار کے وعظ ہی سے نفرت ہے۔ ایک معصوم بچے کی طرح (آپ کی فطری معصومیت اور اس وسیع قدرت کے اُس ان دیکھے ربِ بست وکشاد کے مقابلہ پر آپ کے اور اپنے بچپنے کا میں پوری طرح قائل ہوں۔) آپ اپنی ضد منوانے کی خاطر اپنے ہی نقصان کی بھی کوئی پرواہ نہیں کر رہے۔ چنانچہ ماہرینِ نفسیات کی جدید تعلیم کے پیشِ نظر میں آپ کو مذہبی اپدیشوں کے تازیانوں سے پیٹنے کے بجائے آپ ہی کی ضد مان لیتا ہوں۔ آپ کی بات رکھنے کے لئے میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ ہی کا جذبہ صحیح ہے۔ اسی کی نشوونما کیجئے۔ میں آپ کے سامنے نفرت کا وعظ کرتا ہوں ــــــ وحشی پن سے، بہیمیت سے

غیر انسانی پن اور تشدد سے نفرت کا وعظ۔ آپ کو نفرت ہی کرنا ہے تو ان سے نفرت کیجئے۔ اور اس طرح آپ نفرت کی راہ سے ہی صحیح راستے پر آجائیں گے۔

آپ ہی کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے میں نے آپ کو اس ضد کا آخری انجام دکھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے اُن جذبات کی جن کو آپ قدرتی اور زیادہ طاقت ور کہتے ہیں، صحیح تصویر بنا کر آپ کے سامنے پیش کر دی ہے ـــــ اس امید پر کہ آپ کو اسی طاقتور جذبے سے نفرت ہو جائے (آخر آپ کو نفرت ہی تو چاہیئے) میں نے آپ کے سچے کارناموں کی عکاسی کرتے وقت ذرہ برابر جھجک سے کام نہیں لیا۔ حالانکہ یہ میرے کچھ نفاست پسند دوستوں کو حقارت کی حد تک گراں گزرا ہے اور گزرے گا۔ لیکن میں ان کی پرواہ نہیں کروں گا۔ میں آپ کے ساتھ آپ ہی کے پسندیدہ راستہ پر اس آخری حد تک چلا آیا ہوں۔ جہاں اس راستے کی آخری منزل ہے ـــــ خودکشی۔

نفرت میں زہر کی سی طاقت ہے۔ یہ دوسرے کو تو مارتی ہے لیکن اپنے کو بھی نہیں چھوڑتی۔ یہی میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ تشدد، قتل اور ہر نیک جذبے کی عصمت دری کا شوق جب اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا تو اس کا واحد انجام اس ناول کے مولّف کے الفاظ میں یہی ہو سکتا ہے کہ ... ... ان قاتل قوموں کے گھر آئندہ بچوں کی جگہ لاشیں ہی پیدا ہوں ـــــ مرے ہوئے لڑکے اور عصمت دریدہ لڑکیاں ہی اس قوم

کی کوکھ سے جنم لیں۔ اور ساری کی ساری قوم اپنی ہی دہشت اور نفرت کے مارے دریاؤں میں کود کود کر مر جائے "۔ اور انسان آئندہ کے اندر موجود انسان کی طرح خودکشی کرے۔

اگر میں نے بنیادی طور پر اس انجام، اس قتل و غارت، اس غیر انسانی پن کے خلاف آپ کے دل میں نفرت پیدا کر دی ہے تو میں سمجھوں گا کہ میں کامیاب ہوں۔ یقیناً وحشی پن سے یہ نفرت آپ کو انسانیت کے قریب لے آئے گی۔ اگر اس ناول کی سان پر چڑھ کر آپ کی اس نفرت کی تلوار کو اس قدر تیز دھار مل جائے۔ کہ آئندہ جب کبھی آپ کا ہاتھ کسی عورت کی عصمت پر اٹھنے لگے، یا کبھی ننھے آدم کی گردن تک آپ کا خنجر پہنچنے لگے تو نفرت کی یہی تیز تلوار آپ کے اس اٹھتے ہوئے ہاتھ کو کاٹ ڈالے، یہ لوہا اس خنجر کے لوہے کو کند کر دے۔ تو میں سمجھوں گا کہ میرا قلم سپھل ہو گیا۔ میرا کام پورا ہو گیا۔

⁂ ⁂ ⁂

اوپر کی سطور ان لوگوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جو نفرت کی خدائی پر ایمان رکھتے ہیں۔

اُن کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں جو دوسری طرف کی انتہا پر ہیں۔ جہاں خوش فہمی ہی خوش فہمی ہے۔ جہاں یاس اور ناامیدی ایک گناہ ہے۔

ایسے ہی ایک دوست نے اس ناول کا مسودہ پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا تھا۔ اور ممکن ہے کہ چند اور دوست بھی کہیں گے کہ " اس میں ناامیدی زیادہ ہے۔ یاس ہے۔ قنوطیت ہے اور آشا واد کی جھلک تک نہیں "

خواجہ احمد عباس نے بھی چند ہی روز پہلے بمبئی کے مشہور اخبار "بھارت جیوتی" کے کالموں میں انسانیت پرستی کی کچھ تازہ مثالیں دے کر مجھے پبلک طور پر مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ دیکھو ساگر۔ ابھی انسانیت زندہ ہے۔ مری نہیں ...."

اُن دوستوں سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ انھوں نے ناول کو سطحی طور پر دیکھا ہے۔ اس کی گہرائیوں میں تڑپنے والی روح تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اگر مجھے انسانیت کی موت کا یقین ہو جاتا تو میں شائد یہ ناول ہی نہ لکھتا۔ اور اگر لکھتا بھی تو اس میں مولینا کا وہ سب پر چھا جانے والا کردار نہ ہوتا۔ اس میں کشن چند نہ ہوتا۔ اس میں آشاواد اور رجائیت پسندی کی وہ عظیم Symbol نرملا نہ ہوتی۔ جو جسمانی، ذہنی اور روحانی طور پر سب کچھ لُٹا چکنے کے بعد بھی جب امید اور انسانیت کے اس سرچشمے —— آنند کے پاس پہنچتی ہے تو خود رجائیت پرستی کا سب سے بڑا اور سب سے معصوم Symbol بن جاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ اس میں خود آنند جیسا کردار ہیرو نہ ہوتا۔ جس کی بنیاد ہی انسانیت اور پیار کے فلسفے پر قائم ہے۔ جو بذاتِ خود اس یقین کا اظہار ہے کہ بنیادی طور پر انسان نیکی پسند ہے۔ عمل اور بلندی کو پسند کرتا ہے۔ شر پسند نہیں اور نہ بے عملی اور پستی کا طالب ہے۔ آخر میں آنند نے جو کچھ کیا صرف اسی سے اس کے تمام گزشتہ خیالات، اس کا سارا فلسفہ جھوٹ اور "کچھ نہیں" ہو کر نہیں رہ جاتا۔ بلکہ میرے قلم میں جتنی تھوڑی بہت طاقت ہے اسے پوری طرح استعمال کر کے میں نے آپ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ بتلانے کی کوشش

کی ہے کہ نفرت اور تشدد کا انجام کتنا بھیانک ہو سکتا ہے۔ وہ انجام ——— جب آنند جیسا انسان بھی چلا اُٹھتا ہے کہ "اگر انسان خود کشی نہیں کرے گا تو میں اُسے مار ڈالوں گا" جب انسان انسان کا گلا گھونٹ کر خود کشی کر لیتا ہے اور جب مہاتما گاندھی کو گولیاں مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

آنند اکیلا نہیں ہے۔

اپنے ملک کے صحیح واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ ایسے حالات، ایسی یاس، ایسی ناامیدی نے آنند جیسے لاکھوں انسانوں کو آنند کی طرح انسان کا قاتل بنا دیا ہے۔ اور مہاتما گاندھی اور مولینا جیسے لاکھوں انسان خود انسان کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کو یہ بُرا لگا ہو۔ تو اِسے روکئے۔ اس ناامیدی کو، اس یاس کو دُور کیجئے۔ جو بچ گیا ہے اُسے بچا لیجئے ——— یہی مجھے کہنا ہے۔ اگر میں نے بنیادی طور پر اس مرتے ہوئے انسان ——— آنند سے آپ کی ہمدردی پیدا کر دی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں کامیاب ہوں۔ اور تب اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ میں نے قنوطیت، یاس اور ناامیدی کا پراپگینڈا کیا ہے۔

ہاں مَیں نے محض زبانی آشاواد یا رجائیت پسندی کا ڈھونگ نہیں رچا، جس میں محض خوش فہمی ہی خوش فہمی ہے اور عمل بہت کم۔ میں نے کسی بھی طریقے سے آپ کو عمل پر ابھارنے کی کوشش کی ہے اور اگر میری وہ کوشش کامیاب ہے تو مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ میں اس کے عوض ہر تنقید ہر بُرائی اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔

✽ ✽ ✽

آنند کا ذکر اوشا کے کردار کے بغیر ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔ اوشا، جو ایک روح کی طرح سارے ناول پر چھائی ہوئی ہے۔ لیکن جو خود سارے ناول میں بمشکل ایک آدھ باب میں نمودار ہوتی ہے۔ اوشا ایک Symbol، ایک نشان ہے اُس ازلی تشنگی کا جسے غمِ جاناں کہتے ہیں، بلکہ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے غمِ دوراں یا غمِ زندگی بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہی تشنگی جس کے متعلق نیاز حیدر نے کہا تھا کہ۔

تشنگی نام ہے جینے کا مجھے جینے دے
تشنگی روزِ ازل سے ہے رفیقِ دلِ و جاں
تشنگی وجہِ طلب، ذوقِ طلب حسنِ طلب

وہ ازلی تلاش ——— سچائی کی، پیار کی یا ہر اس utopian آدرش کی تلاش جو فنکار کو ہمیشہ آگے سے آگے دھکیلتی چلی جاتی ہے۔ وہی جو اُسے اپنے کسی بھی شاہکار، اپنے کسی بھی محبوب سے کبھی پوری طرح مطمئن نہیں ہونے دیتی، جو خود کبھی اس کی گرفت میں نہیں آتی۔ لیکن جو ایک کبھی نہ بجھنے والی شمعِ امید اس کے راستے میں رکھ کر اسے ہمیشہ یہ کہہ کر عمل کی راہ پر دھکیلتی رہتی ہے کہ "ابھی نہیں ابھی منزل ہزار کوس ہے دور" اور اسے زندہ رکھتی ہے، اس کی تڑپ کو برقرار رکھتی ہے۔ جو آنند کو اپنے صحیح میدانِ عمل تک پہنچنے سے پہلے ایک لمحے کا چین نہیں لینے دیتی۔ جب

کے دائمی خیال سے یا اپنے آپ کو جس کا اہل ثابت کر سکنے کی کوشش میں انسان عظیم زین کارنامے سرانجام دے سکتا ہے اور دیتا ہے وہی ہے اُوشا۔ یہ کبھی نہ بجھنے والی پیاس، کسی انتہائی آدرش کی یہ پاگل مانگ، جو کبھی بس نہیں ہوتی۔ موت کے سائے اس پر سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن وہ سائے بھی اس کی چمک کو ماند نہیں کر سکتے، وہ ازلی روشنی پھیکی نہیں پڑتی!....
لیکن اس کا راستہ فرائض اور پابندیوں اور ایسی ہی سخت اور تلخ راہوں سے ہو کر جاتا ہے۔ جس پر چلنے کے لئے ایک چٹان کا سا یقین اور طوفان کا سا عزم چاہئے۔ اسی لئے کبھی کبھی اس کی طوالت سے تنگ آ کر یا جھنجھلا کر کوئی چھوٹا راستہ تلاش کرنے کی کوشش میں انسان بے راہرو بھی ہو جاتا ہے بھٹک بھی سکتا ہے۔

اور اگر آنند بھٹک گیا ہے۔ تو اس سے ہمدردی کیجئے۔ یہ آپ کے لئے عمل کی پکار ہے۔ کہ انسان کے راستے سے ان تلخیوں کو، اس زہر کو دور کیجئے۔ رو پہلی دھند میں لپٹے ہوئے اُن دیووں کو مٹا ڈالئے جو آنند اور اوشا کے درمیان —— انسان اور اس کے آدرش کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور انسان کو پھر اس قابل کر دیجئے کہ وہ آج سے ہزار سال بعد آنے والے انسان کو خوبصورتی اور پیار کا پیغام دے سکے۔

✱ ✱ ✱

بایں ہمہ مجھے اس میں یاس و تلخی کی موجودگی سے انکار نہیں۔ اور اس

بارے میں مجھے صرف یہ کہنا ہے۔ کہ یہ یاس محض وقتی جذباتیت کا نتیجہ نہیں ۔
کیونکہ یہ ناول کوئی ڈیڑھ سال کے عرصے میں لکھا گیا ہے اور اتنے طویل عرصے
میں وقتی جذباتیت کے جوش کو ٹھنڈا ہو جانے کے لئے یقیناً بہت کافی وقت
مل گیا ہوگا ۔ چنانچہ یہ حقیقت اور واقعات کا نتیجہ ہے ۔ میں ان رجائیت پرستوں
اور ان کے ساتھ ہی ان لمبے لمبے بیانات دینے والے اپنے لیڈروں سے پوچھتا
ہوں کہ انھوں نے ہندستان یا پاکستان میں ان مہاجرین اور شرنارتھیوں کے
دلوں میں امید کی شمع جلائے رکھنے کی کون سی کامیاب کوشش کی ہے ؟ اور
کیوں وہ ابھی تک شرنارتھی اور مہاجرین ہی کہلاتے ہیں ؟ آج بھی وہ انسان
جو انسان سے پناہ ڈھونڈنے کی خاطر اپنے شہروں اور گھروں کو چھوڑ کر بھاگے
تھے ، اسی طرح نیم عریاں حالت میں چھوٹی بڑی ٹولیاں بنائے بے سروسامانی
کی حالت ، برستے پانیوں اور کڑکتی دھوپوں میں کہیں پناہ ڈھونے کی خاطر
اس وسیع ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مارے مارے
پھر رہے ہیں ۔ لیکن ہندستان یا پاکستان میں کسی بھی جگہ انھیں صحیح معنوں میں
اب تک پناہ نہیں مل سکی ۔ کیوں ؟ ۔

آج بھی میں نے بارشوں میں تیرتے ہوئے اور آندھیوں میں اڑتے
ہوئے ریفوجی کیمپوں میں رہنے والے لاکھوں شرنارتھیوں میں سے کئی ایک
کو یہ کہتے سنا ہے کہ " اس زندگی سے تو ان دنوں مذہب کے نام پر کسی دشمن
کے ہاتھوں قتل ہو جانا بہتر تھا " ۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ۱۵ اگست ۴۷ء
کی تاریخی آزادی کے بعد بھی مایوسی کی یہ انتہا ایک حقیقت نہیں ہے ؟ تو اس

صورت میں کیا آپ محض میٹھی میٹھی آشا وادی باتوں سے حقیقت کو جھٹلا سکتے ہیں ؟ ۔ نہیں! بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس کے برعکس لکھتا تو اپنے کاز سے غداری کرتا، ان لاکھوں خانماں بربادوں سے غداری کرتا اور سچائی سے غداری کرتا ——— پھوڑے میں سے نکلتی ہوئی پیپ گھناؤنی ضرور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھوڑے کا منہ بند کر کے اسے چھپا دینے سے تو اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔

ہندستان اور پاکستان ——— دونوں ملکوں میں کئی لوگوں کو میں آج ان شرنارتھیوں اور مہاجرین پر Desperate غیر مہذب اور بدتمیز ہونے کا الزام لگاتے دیکھ اور سن رہا ہوں۔ مجھے وہ نرملا کے خاوند کی طرح کمینے دکھائی دیتے ہیں۔ جو اس کی حفاظت کے وقت خود بزدلوں کی طرح بھاگ گیا تھا۔ لیکن اس کی بہادرانہ واپسی پر اس کے اخلاق اور اپنے خاندان کی عزت کا منصف بن بیٹھا۔

یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ میں پاکستان کے قیام کو بصد خوشی قبول کرتا ہوں۔ میں نے سیاسی نقطۂ نظر سے اس ناول میں کچھ بھی نہیں کہا اور نہ کہوں گا۔ کیونکہ میرے نزدیک وہ مسئلے نہایت چھوٹے اور گریزپا ہیں۔ اگر آپ انسان کو اس طرح آزاد اور زندہ رہنے دیں جس سے اسے کسی بھی شے، کسی بھی سکھ کی کمی نہ ہو تو میری طرف سے آپ لاکھ بٹوارے کیجئے، لاکھ نئے ملک بنائیے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے بات کرتا ہوں اور اسی نقطۂ نگاہ سے میں ہندستان اور پاکستان کے ان بڑے سے بڑے

راہنماؤں کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ جو اپنی اپنی سیاسی کامیابی کے نشے میں اس طرح مست ہو گئے کہ جنھوں نے ان کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دی تھیں، اپنے ان ساتھیوں اور پیرؤوں کو غیر ملک کے وحشیوں کے درمیان اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی اپنی راجدھانیوں میں جشن منانے چلے گئے۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ معزز لیڈر اور سماجی آداب اور مذہب کے وہ ٹھیکیدار بھی اسے پڑھیں، تاکہ انھیں اس امر کا کچھ تھوڑا سا اندازہ تو ہو سکے کہ شرنارتھی ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان میں سے اگر کوئی آنند کی جگہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ یا وہ کیا کرتا؟ میں نے آنند کو پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر لاکر ایک سوالیہ نشان کی طرح کھڑا کر دیا ہے۔ اُسے آگے نہیں بڑھا سکا۔ کیونکہ مجھے دونوں ملکوں میں سے ایک بھی ملک کی طرف سے امید اور آشا کی ہلکی سی روشنی بھی آتی دکھائی نہیں دی جس کے سہارے میں اس ملک کی طرف اس کا راستہ بنا دیتا۔

آشا اور رجا پسندی کا وہ Symbol نرملا بھی اس مقام پر پہنچ کر اس صدمے سے مفلوج زبان سے یہی سوال پوچھ رہی ہے "کہ کیا اب نراش ہونے کا وقت آگیا ہے؟" اور اس سوال کا جواب وہ آپ سے چاہتی ہے۔ آپ جو اسے پڑھ رہے ہیں، آپ جو نسل انسانی کے جانشین ہیں، اور آپ سے بھی ــــــ جو اس ملک کے لیڈر ہیں، جو اس آزاد، حکومت کی گدی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جواب دیجئے ـ!

※ ※ ※

مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہو سکتا ہے کہ اس تلخی اور یاس میں میری اپنی مایوسیاں اور اندرونی درد بھی جھانک رہے ہوں۔ کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ کوئی فن اپنے خالق کے عکسِ ذات (Self - Projection) سے مبرا نہیں ہوتا۔ بلکہ درحقیقت فن کی بنیاد ہی کسی فن کار کی اظہار خود کی کوشش سے پڑتی ہے۔ ذاتیات اور فن میں فرق صرف یہ ہے کہ جب فن کار اپنے درد کو اپنی بلند مقام روح کی گہرائیوں میں گھول کر اتنی بلندیوں Sublimation پر لے جاتا ہے کہ اس کے جگر کا درد بنیادی طور پر سارے جہاں کا درد معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور وہ اسے اپنے سے بالکل الگ کر کے objectively پیش کرتا ہے۔ تو وہ فن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ یہ قدرتی معلوم ہوتا ہے کہ جو زہر، جو تلخی مجھے اکثر اپنی روح میں دکھائی دیتی ہے۔ اسی کی جھلک میں اس ناول میں جا بجا پا رہا ہوں۔ وہ درد، جو کبھی کبھی اچانک اس طرح چمک اٹھتا ہے کہ ساری زندگی اسی کی تلخ روشنی سے منور دکھائی دیتی ہے، وہ زہر جو کبھی ساری زندگی میں ایک نیلا رنگ بھر دیتا ہے۔ اسی کی جھلک آپ بھی اس ناول میں پائیں گے۔

دوسری طرف اس کی الٹی صورت بھی اتنی ہی صحیح ہے۔ یعنی کہ اس ناول نے مجھ میں بے حد یاس اور تلخی بھر دی ہے۔ اوّل تو گزشتہ ڈیڑھ

برس کے تباہ کن اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سے پیدا شدہ تناؤ ہی کافی تھا۔ اس پر ناول لکھنے کے لئے مجھے ذہنی طور پر ان سب حادثات اور واردات میں سے پھر اپنے آپ کو گزارنا پڑا۔ ناول کے مختلف کرداروں کی زندگیاں ذہنی طور پر خود بھی بتانی پڑیں ——— ان کے ساتھ پاگل ہونا پڑا، ان کے ساتھ رونا پڑا، ان کے ساتھ ننھے معصوم بچوں کو قتل کرنا پڑا اور ان کے ساتھ کئی بار خود مرنا بھی پڑا۔ اس دوران میں میری (nerves) پر جس قدر شدید تناؤ پڑا ہوگا۔ اس کا ہلکا سا اندازہ تو آپ کر ہی سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ گزشتہ تیرہ برس کی جدوجہد اور مشکلات بھی میرے چہرے سے جو شگفتگی اور میری ہنسی سے جو شیرینی نہ چھین سکی تھیں، وہ اس ڈیڑھ برس نے چھین لی ہے۔

اس ظالم ڈیڑھ برس نے جوانی ہی میں میرے چہرے پر پکی عمر کے نشان چھاپ دیئے ہیں۔ میری ہنسی زہر خند ہو کر رہ گئی ہے، بال سفید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اپنی ڈیڑھ برس پہلے کی تصویریں دیکھ کر جب آئینہ اٹھاتا ہوں تو میرے اندر کا حسن پرست رونے لگتا ہے۔ میرے نقصان کا اندازہ کون کر سکتا ہے جسے اپنی جوانی نذر کرنا پڑی ہے۔

میں پچھلے سال انجانے کو مخاطب کر کے حسن و عشق کی ایک بہت زوردار کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ میں اسے پکارنا چاہتا تھا کہ "اے انجانے حسن، اے ان دیکھے محبوب ——— میں ساگر ہوں، میں اکیلا ہوں، میں جانے کس ازل سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں، تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں ——— تم کہاں ہو؟" تب کیوں مجھ جیسے رومانی فن کار کو زندگی کی اس سب سے بڑی خواہش کو زہر کے گھونٹ

کی طرح پی جانا پڑا ؟ کیوں اُسے قربان کر کے مجھے یہ ناول لکھنے پر مجبور ہونا پڑا ؟ کیوں ؟

کیا اب میں وہ کہانی کبھی لکھ سکوں گا ؟ میں جس کے خواب دیکھا کرتا ہوں، مجھے جس کا بچانے کس ازل سے انتظار رہے، اس کا پیار پانے سے پہلے ہی مجھے کیوں لوٹ لیا گیا ہے ؟ اب اگر وہ آج ہی آجائے تو میں اسے کیا نذر کروں گا۔ یا یوں ہی سوچئے کہ جن اچھے حالات کے لئے، جس آدرش کے لئے میں گزشتہ تیرہ برس سے لڑ رہا ہوں ـــــــ انسان ہزاروں برس سے لڑ رہا ہے، اگر وہ آج مجھے میسر آجائے تو ان سے محظوظ ہونے کے لئے وہ رنگین اور جوان دل کہاں سے لاؤں گا۔

چند سال ہوئے مجھے بے حد حساس طبیعت کے باعث دِق ہو گیا تھا۔ لیکن راجندر سنگھ بیدی کے بقول دق نے میری طبیعت کو زیادہ حساس بنا دیا۔ اسی طرح زندگی کے چند تلخ تجربوں نے یہ ناول لکھوایا لیکن اس ناول کے لکھنے سے زندگی تلخ تر ہو گئی ہے۔

آنند اکیلا نہیں ہے۔ اسی طرح میں اکیلا نہیں ہوں،

میری طرح کے کئی لاکھ ہوں گے جو جانے کس ایک تمنا کے سہارے زندہ تھے۔ کون سی شمعِ امید ان کے راستے میں روشنیاں بکھیرتی چلی جا رہی تھی۔ ان کی وہ شاخیں ہی کیوں کاٹ دی گئی ہیں جن پر انھوں نے اپنی امیدوں کے آشیانے بنا رکھے تھے۔ ان کے چراغ محبت، بجھا کر زندگی کے ان اندھیرے راستوں میں آندھیوں کو کیوں کھلا چھوڑ دیا گیا ہے!

Scanned with CamScanner

اگر آپ کو ہم سے ہمدردی ہوتی ہے۔ ہماری اس تلخ زندگی پر رحم آتا ہے۔ تو اے رحیمو، اے کریمو، میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ آئندہ کسی شرنارتھی کی ،غلطیوں، کے منصف بننے یا مہاجرین پر کوئی فقرہ کسنے سے پہلے ہمیں یاد کیجئے۔ اجاگر سنگھ کو یاد کیجئے، انتی کو نہ بھولئے، لال قلعے میں جانوروں کی طرح بند ہزاروں مسلمانوں کا تصور کیجئے اور سوچئے کہ شاہد احمد کے جن ساتھیوں کو محض زندہ رہنے کی خاطر اپنے ہی بچوں، بہنوں اور بیویوں کی لاشوں سے بہا ہوا خون چاٹ چاٹ کر اپنی پیاس بجھانا پڑی ہے۔ اُن بدنصیبوں کے ساتھ، جن کے اندر کا انسان مر گیا ہے، آپ کو کیا سلوک کرنا ہو گا؟ ... ... ؟

میں اسی سوال پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ جواب دینا آپ کا کام ہے سو آپ جانیں۔

* * *

آخر میں مجھے اُن کا اور ان حالات کا ذکر کرنا ہے جنھوں نے یہ ناول لکھنے میں میری مدد کی۔ اور ان کا بھی، جنھوں نے اس راہ میں روکاٹیں ڈالیں۔

جب ۳ مارچ ۴۷ء کو پنجاب کے فسادوں کی بسم اللہ لاہور میں ہوئی، تو میں وہیں تھا۔ اور اس کے بعد کئی مہینے لاہور میں رہا۔ حتیٰ کہ ان مشہور ہنستے گاتے پُر رونق رومانی گلی کوچوں کی خوفناک ویرانی سے تنگ آ کر اور خود بھی زخمی ہونے کے بعد مجھے مجبوراً وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس کتاب کے لئے میں نے ان ہی دنوں Notes لینے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اس کی تحریک

کے ذمہ دار مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی ہیں۔ جنھوں نے بار بار اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے ابھارا۔ اور پھر ان کے خطوط کی زبان کچھ ایسی ہوتی تھی کہ انھوں نے خواہ مخواہ میری انا (ego) کو اس حد تک ابھار دیا کہ اس وقت تو مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ میرے سوا سارے ہندستان میں اس موضوع پر لکھنے کے لئے دوسرا کوئی موزوں ہی نہیں۔ گو اس کے بعد سے اب تک اس موضوع پر میرے ہمعصروں نے جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھ کر اپنی ساری شیخی کرکری ہو گئی ہے۔ لیکن تب تک تو میں اس دلدل میں پھنس چکا تھا۔ اور اچھے یا برے انجام تک پہنچے بغیر اب اس سے بچ نکلنا محال تھا۔

بہرحال لاہور سے نکل کر میں جموں ہوتا ہوا کشمیر گیا۔ جہاں گھر کے لوگ پہلے سے پہنچ چکے تھے۔ میرے ساتھ تھر بارتھی قسم کے رشتہ داروں کا ایک چھوٹا سا قافلہ بھی تھا۔ چنانچہ میں سرینگر میں اپنے والد صاحب کے گھر پر زیادہ عرصہ نہ ٹھہر کر گلمرگ کے نیچے تنگمرگ چلا گیا۔ وہ مقام مجھے تب سے بے حد عزیز ہے جب میں کبھی مریضِ دق کی حیثیت میں وہاں کے سینے ٹوریم میں تھا۔ وہاں پولیس چوکی کی بغل میں ایک مکان لے کر ہم سب لوگ رہے۔ اور میں یہ ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہوا اپنے دماغ کو وقتی جذبات کے جوش سے آزاد کرنے کی کوشش میں وہاں کے خوبصورت جھرنوں، رومان خیز گھاٹوں اور چیل کے گھنے جنگلوں میں کچھ عرصہ گھومتا رہا۔ جہاں چند سال پہلے کبھی کرشن چندر بھی میرے ساتھ گھوما کرتا تھا۔ ان دنوں بھی کشمیر کے مشہور افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی اور محمود ہاشمی اپوربا سوم ناتھ اور چند اور ادب نواز کبھی کبھی وہاں میرے پاس آتے رہے

لیکن میرا یہ فرار مکمل نہ تھا۔ کیونکہ وہاں میرے ساتھ ایک ریڈیو بھی تھا۔ جو ہر
رات مجھے پھر اُن جلتے ہوئے شہروں اور مرتے ہوئے انسانوں کے درمیان
پہنچا دیتا تھا۔ اور اس ٹریجیڈی کا کہیں خاتمہ ہوتا دکھائی نہ دے رہا تھا۔

مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ میرے notes کبھی مکمل نہ ہوں گے
اتنا کچھ ہو رہا تھا۔ اور کتنا کچھ ہونے کو ابھی باقی تھا۔ حتیٰ کہ ۱۵ اگست کے بعد وہ
قیامت بھی برپا ہو گئی جب ماں کو بیٹے کی خبر نہ رہی۔ خاوند کو بیوی کی سدھ
نہ رہی۔ لوگ آوارہ آندھیوں کی طرح بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ایک دوسرے
کو پکار رہے تھے۔ لیکن کوئی کسی کو اپنی خبر تک نہ پہنچا سکتا تھا۔ صبح سے شام
تک کئی مرتبہ ریڈیو پر لوگ اپنے ساتھیوں، اپنے بچوں، اپنے والدین اور اپنی
بیویوں کی کچھ خبر جاننے کے لئے چلاتے رہتے۔ حتیٰ کہ کئی مسلمان اور ہندو
دوستوں نے لاہور اور دہلی کے ریڈیو اسٹیشنوں سے خود میرے متعلق کئی بار
تشویش بھرے سندیسے براڈکاسٹ کئے۔ لیکن میں اس محشر میں انھیں اپنی
خیریت کی خبر تک نہ پہنچا سکتا تھا۔ کشمیر سے ڈاک تار کے تمام سلسلے منقطع
ہو چکے تھے۔ اور وہ ایسی سیاسی نبرد آزمائیوں کے چکر میں پھنس چکا تھا جس
سے اب تک وہ پوری طرح چھٹکارا نہیں پا سکا۔ اسی دوران میں ۵ اگست
سنہ ۴۷ء کو میں نے یہ ناول 'فساد اور امن' کے نام سے لکھنا شروع
کر دیا تھا۔

پہلے حصے لکھتا جا رہا تھا۔ اور ایک انجانے اختتام کے لئے
notes بھی لینا جا رہا تھا۔ کیونکہ یہ میں جان گیا تھا۔ کہ حالات اس رفتار سے

تبدیل ہو رہے ہیں۔ کہ ابھی سے اس کا کوئی پورا پلان تیار کر لینا سخت حماقت ہوگی۔ اسی لئے اس کی ترتیب میں نے کچھ اس طرح رکھی کہ چاروں حصوں کا کینواس بتدریج پھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہاں میں اتنا عرض کر دوں کہ فسادات کے باعث میری مالی حالت اس قدر تباہ ہو چکی تھی کہ اگر اس وقت میرے کرم فرما لالہ دینا ناتھ چوپڑہ اپنی مشکلوں کے باوجود میرا ہاتھ نہ پکڑتے۔ تو میں اس یکسوئی سے وہاں بیٹھ کر کام بھی نہ کر سکتا۔ ان کے علاوہ مجھے مشہور شاعر جناب فیض احمد فیض اور ڈائریکٹر وجاہت مرزا کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جو ان دنوں مجھ سے ٹنگمرگ میں ملے اور جنھوں نے اس ناول کے لئے مجھے ۱۵ اگست کے بعد سے لاہور اور پاکستان کے حالات پر بیر حاصل اطلاعات بہم پہنچائیں۔

بہرحال ابھی اس کے دو حصے ہی لکھے گئے تھے۔ کہ گلمرگ میں برفباری ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی کشمیر پر پٹھانوں نے دھاوا بول دیا۔ عورتوں اور بچوں کو آخری لاری میں بھیج کر ہم لوگوں کو سرینگر کی طرف پا پیادہ روانہ ہونا پڑا۔ اور پھر سرینگر میں وہ قیامت کا آخری ہفتہ بھی گزارا جب پٹھان لوٹتے، مارتے اور آگ لگاتے سرینگر کی دیواروں تک آ پہنچے۔ ان دنوں میں وہاں انقلابِ فرانس کا سا انقلاب بھی میں نے دیکھا۔ کہ جب مہاراجہ اور اس کے تمام ڈوگرہ افسروں کے بھاگ جانے پر حکومت عوام کے ہاتھوں میں آ گئی۔ جنھوں نے خود ساختہ عوامی قانونوں کے مطابق وزیروں کی بھی سر بازار تلاشیاں لیں۔ اور یہ بھی دیکھا۔ کہ شیخ محمد عبداللہ

کا سا ایک مردِ خدا اپنی مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے کس طرح ایسے نازک ترین وقت میں سینہ تان کر آگے بڑھتا ہے۔ اور کس طرح اس شیرِ کشمیر کی للکار پر ایک بزدل اور ڈرپوک سمجھے جانے والے ملک کے جانباز اسٹالن گراڈ کے بہادروں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

اکتوبر کے آخری ہفتہ میں میں اپنے ننھے سے قافلے کے ہمراہ ہوائی جہاز میں دہلی پہنچا۔ اور وہاں لاکھوں دیگر شرنارتھیوں کے ساتھ اپنے اور بچوں کے لئے رہنے کی کسی جگہ کی تلاش میں کھو گیا۔ ابھی دوستوں کی ہمدردی کا امتحان ہی لینا پھر رہا تھا۔ یا ناول کے نقطۂ نگاہ سے شرنارتھی کیمپوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ ۲۳ر نومبر کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک ڈیلیگیشن حکومت ہند کے تعاون سے کشمیر کے محاذ کا مطالعہ کرنے کے لئے آٹے کی بوریوں سے لدے ہوئے ایک ہوائی جہاز میں بھیجا گیا۔ اور میں اس کے ساتھ پھر کشمیر چلا گیا۔

وہاں مختلف محاذوں پر گھومنے کے بعد ہمیں شدید برفباری میں لاریوں کے ذریعہ جموں لایا گیا۔ جہاں کے نئے ریڈیو اسٹیشن سے ترقی پسند ادیبوں کے نام ایک اپیل براڈ کاسٹ کرنے کے بعد میں ۱۵ر دسمبر کو ہوائی جہاز سے دہلی واپس آ گیا۔

وہاں ایک مہینہ پھر گھریلو قسم کی پریشانیوں اور بھاگ دوڑ میں گذارا۔ اس دوران میں کشمیر کے متعلق بھی چند مضامین اردو اور ہندی میں لکھے۔ جو دہلی۔ بمبئی اور کلکتہ کے رسائل میں شائع ہوئے۔ میں کشمیر کی موجودہ

جدوجہد پر ایک پوری کتاب لکھنے کے لئے Hutchinson سے کرسی آیا تھا لیکن اس پناہ گزینی کے دور کی پریشانیاں تو اس نامکمل ناول کو بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔

یہ پھر ایک نازک وقت تھا۔ گو اب تک اس ناول کی شہرت خالص ادبی حلقوں میں خاصی حد تک ہو چکی تھی۔ کیمبرج میں ڈیلی گیشن کے ممبروں کے سامنے میں نے اس کے کچھ حصے سنائے تھے۔ جس کے بعد اردو حلقے میں خواجہ احمد عباس اور اس کے اس مضمون کے ذریعہ جو اس نے بمبئی کرانیکل، میں اس کے متعلق لکھا تھا۔ اور ہندی حلقوں میں شری موہن سنگھ سینگر ایڈیٹر وشال بھارت کلکتہ کے زبانی پراپیگنڈہ کی وجہ سے بہت سے لوگ اس ناول کی ترقی میں دلچسپی لینے لگے۔ جن میں ادیبوں کے علاوہ کچھ جرنلسٹ اور لیڈر لوگ بھی تھے۔ میں ان دوستوں کا شکریہ پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یقیناً ان باتوں نے، جیسا کہ قدرتی تھا، مجھ میں وہ ہمت، خود اعتمادی اور طاقت پیدا کر دی۔ جو شائد اس ناول کی تکمیل کے لئے کچھ کم ذمہ دار نہیں۔ لیکن اس وقت تو مجھے اس ناول کے متعلق اپنے ساتھیوں کی تعریف سے زیادہ کسی ایسے پبلشر کی ضرورت تھی۔ جو مجھے کچھ رقم پیشگی دیتا۔ تاکہ میرے چند روز آرام سے کٹ سکتے اور میں اپنی توجہ اسے ختم کرنے کی طرف دے سکتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہندوستان میں اردو ادیب کا مستقبل بالکل تاریک ہو گیا ہے۔ اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا۔ جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ میں شائد اب کبھی اردو میں چھپ ہی نہیں سکوں گا۔

اس دوران میں ہندی والوں نے مجھے بڑے کھلے دل سے خوش آمدید کہہ کر میری بہت ہمت افزائی کی لیکن میں نے اردو کے جس میدان میں تھوڑا بہت نام پیدا کیا تھا۔ اسی میدان سے ہٹ کر اس طرح ہندی کی گود میں ایک شرنارتھی ہو کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس خیال ہی سے میری خودداری پر ایک چوٹ لگتی تھی۔

چند سال ہوئے مولینا صلاح الدین احمد نے "ادبی دنیا" میں میرے متعلق یہ تشویش ظاہر کی تھی کہ "دیکھیں انھیں بھی کب ہندی والے اغوا کر کے لے جاتے ہیں"۔ اور میں نے اتنے سال ان کی تشویش کو بے بنیاد ثابت کرنے کی سعی کی تھی۔ لیکن آج خود اردو والے جیسے مجھے ادھر ڈھکیل رہے تھے۔ اور میں اس معاملے میں اسٹیفن زوائیگ Stephen Zweig کی طرح یاس اور دل شکنی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ تک میرا کچھ لکھنے کو جی ہی نہیں چاہا۔ اور ناول اسی طرح پڑا رہا۔ اس سلسلہ میں میں ان اردو پبلشروں کے نام نہیں لکھنا چاہتا۔ جن سے مجھے شکایت ہے۔ لیکن ان کی فہرست دہلی سے لے کر بمبئی تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور ستم ظریفی تو دیکھیے کہ جنھوں نے اس وقت ایک مرتے ہوئے ادیب کو بچانے کی کوشش نہ کی، وہی آج، جب کہ یہ ناول پریس کو جا رہا ہے، مجھے کہتے ہیں کہ "ہمیں آپ سے شکایت ہے۔ ناول آپ نے ہمیں کیوں نہیں دیا"۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

ویسے بھی میرے دیگر حالات اس حد تک خراب ہو گئے تھے کہ اگر

ان ہی دنوں منشی پریم چند کے وہ معصوم صورت صاحبزادے شری امرت رائے ایڈیٹر ہنس (ہندی) آکر مجھے وقتی طور پر نہ سنبھال لیتے تو میں نہیں جانتا کہ کیا ہو جاتا۔ امرت رائے نے دہلی آکر مجھ سے اس ناول کو ہندی میں شائع کرنے کا معاہدہ کیا۔ اور مجھے ایک اچھی رقم پیشگی دے گئے۔ اس رقم نے وقتی طور پر مجھے پھر سے زندہ کر دیا۔ اور میں دہلی میں بچوں کے رہنے کا کچھ الٹا سیدھا انتظام کر کے خود جنوری میں بمبئی کی طرف بھاگا۔ کہ یہاں فلمی دنیا میں پرانے تعلقات کی وجہ سے مجھے کچھ آمدن کی سبیل ہونے کی توقع تھی۔

یہاں ایک اور بات کہنے کا موقعہ مل رہا ہے اور میں اس لالچ کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ نجانے کیوں سرکاری نوکری یا ایک پکی قسم کی ملازمت سے میں ہمیشہ کتراتا آیا ہوں۔ جس میں کوئی Adventure نہیں۔ بس ایک، وشس، قسم کی بندھی بندھائی زندگی ہے، وہ نجانے مجھے کیوں نہیں بھاتی شعوری طور پر اس کے بالکل برعکس میں نے کئی بار یہ خواہش کی ہے کہ کوئی دائمی قسم کا ذریعہ آمدن ہو۔ جو مجھے ان روز کی مالی قلابازیوں سے نجات دلا سکے تاکہ میں اپنے لکھنے پڑھنے کا کام بڑے سکون سے کر سکوں۔ لیکن لاشعور میں کچھ ہے جو ہمیشہ ہی میرا راستہ روک لیتا ہے، میرے قدموں کو اس طرف بڑھنے ہی نہیں دیتا۔ چند سال ہوئے ایک ریڈیو اسٹیشن کے اسٹیشن ڈائرکٹر نے مجھے ریڈیو میں آجانے کو کہا۔ لیکن میں عین موقعہ پر پیچھے ہٹ گیا۔ بلکہ تب سے آج تک پہلے سے لکھی ہوئی میری ایک دو کہانیاں تو ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوئی ہیں۔ لیکن

خاص فرمائشیں ہونے پر میں ریڈیو کے لئے کبھی کچھ نہیں لکھ سکا۔ کیوں ؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔

اب کے بھی بمبئی آنے سے قبل دہلی میں ایک دو اچھی سرکاری نوکریوں کی امید مجھے دوستوں نے دلائی تھی۔ بلکہ کچھ ہمدردوں نے تو بہت دور دور سے میرے لئے سفارشیں بھی بھجوائی تھیں۔ اور میں درخواست دینے سے پہلے ہی چند متعلقہ افسروں سے مل کر پڑا امید وعدے بھی لے آیا تھا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے ہر بار سوچنے سوچنے ہی میں درخواست بھیجنے کی آخری تاریخیں گزار دیں اور بعدازاں دوستوں کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ میں نے درخواست ہی نہیں بھیجی۔ خود میرے والد صاحب کئی سالوں سے مجھے یہی سمجھاتے چلے آرہے ہیں کہ "بیٹا، کسی برساتی ندی میں کناروں سے باہر تک اچھلتے ہوئے باڑھ کے پانی سے وہ ننھا سا چشمہ ہزار درجہ بہتر ہے جو تھوڑا پانی دیتا ہے لیکن سارا سال دیتا رہتا ہے"

دماغ سے ان کی دلیل نہیں کٹ سکتی۔ لیکن عملی طور پر میں کبھی اس کا قائل نہیں ہوا۔ ایسا کیوں ہے، اس کا تجزیہ میں خود بھی نہیں کر سکتا تو انھیں کیا سمجھاؤں۔ شاید میرے لاشعور کی گہرائیوں میں وہ واقعہ بری طرح بیٹھ گیا ہے۔ جس کا ذکر میں نے "تپ دق کے ایک مریض کی ڈائری" میں بھی کیا ہے۔ کہ کس طرح دق کا ایک تیسرے درجے کا مریض جب بوٹوں کا ایک نیا جوڑا خریدنے گیا تو اس کی مضبوطی پر بہت زور دینے لگا۔ گویا موت کی راہ بھی انھیں پہن کر ہی طے کرنی ہو، یا شاید میرے اندر کا جو فنکار ہے وہ اپنے

لئے نت نیا مسالہ، نت نیا تجربہ حاصل کرنے کی خاطر نہایت خود غرضی سے میں نے آرام اور سکون کی قربانی دیتا چلا جا رہا ہے۔

خیر۔ بمبئی آکر دیکھا کہ ان دنوں فلمی دنیا کا کاروبار بہت مندا ہے، لیکن پھر بھی دن رات بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ اور اب تک اسی چکر میں سرگرداں ہوں۔ ویسے بھی، جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اردو پبلشروں کی مہربانی سے ناول کے بارے میں میرا دل بالکل کھٹا ہو چکا تھا۔ اور میں امرت رائے سے وعدہ کرنے کے باوجود اسے لکھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ کہ اچانک ۳۰ر جنوری ۴۸ء کی شام کو دنیا کی تاریخ کا وہ عظیم ترین سانحہ ہوگیا، ——— مہاتما گاندھی کو پستول سے ہلاک کر دیا گیا! اور اس واقعہ نے مجھے اس قدر ہلا دیا کہ میں نے دوسرے دن ناول کے ادھورے مسودے پر ساتویں باب کے درمیان کہیں یہ لکھا۔ کہ "مہاتما گاندھی کو قتل کر کے انصاف اور پیار کی آواز کو زبردستی خاموش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ آج جب کہ وہ دیوا من جو اکیلا لاکھوں کا کام کر سکتا تھا نہیں رہا۔ تو ہم جیسے حقیر ذرّوں پر ذمہ داری آگئی ہے۔ کہ اس بڑے کام میں اپنا اپنا حصہ نہایت ایمانداری سے ادا کریں۔ تاکہ قطرہ قطرہ مل کر اس باہمی محبت کے دریا کے بہاؤ کو قائم رکھ سکے۔ اور اسے سوکھنے نہ دے۔ چنانچہ جب تک یہ ناول ختم نہ ہو جائے اسے ہر روز لکھنے کا عہد کرتا ہوں ... " اور اس کے بعد میں نے بہر صورت یہ عہد قائم رکھنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ کام ڈھونڈنے کی بھاگ دوڑ سے اگر کبھی رات کے ایک بجے بھی گھر لوٹتا ہوں، تو

اس کی چند سطور ضرور لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسے دوران سفر میں فرنٹیر میل میں بھی بیٹھ کر لکھا ہے۔ اور ویسے بھی تب سے آج تک شاید ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا۔ جسے میں چھٹی کا دن کہہ سکتا۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے مہاتما گاندھی کی یاد میں یہ حقیر سا تحفہ ہی پیش کیا ہے۔

یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ میں اس عظیم تعلیم کو بھول گیا تھا۔ کہ فن کار تو فن کی تخلیق ہی اس لئے کرتا ہے کہ اُسے اپنے کام سے عشق ہے۔ اچھے بُرے نتیجے کی آشا کر کے تو وہ اپنا راستہ ڈھونڈنے نہیں نکلتا۔ چنانچہ ہلکے پن کی طرف جاتا ہوا میرے اندر کا فن کار جیسے مہاتما جی کی موت کی چوٹ کھا کر پھر سے سنبھل گیا۔ اور بے راہرو ہونے سے بچ گیا۔ اس کے لئے میں کس کا شکریہ ادا کروں؟ بمبئی پہنچنے کے بعد جس عظیم ہستی نے مجھے باقاعدہ لکھنے میں میری سب سے زیادہ مدد کی۔ وہ ہے پرتھوی راج۔ جسے عام لوگ محض ایک فلمی اداکار کے طور پر ہی جانتے ہیں۔ لیکن پچھلے چند سالوں کی دوستی میں میں نے اس فنکار کو ان معدودے چند عظیم روحوں میں سے ایک پایا ہے۔ جن کی عزت کرنے سے بھی کچھ آگے بڑھ کر جن سے پیار کرنے کی بلکہ جن کا پیار پانے کی تمنا میں نے ہمیشہ کی ہے۔ لیکن پتہ نہیں کہ ہر جگہ پیار کے معاملے میں جب میری باری آتی ہے۔ تو یہ سب ظالم پہلے سے بہت زیادہ مصروف کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ پرتھوی راج بھی ... لیکن میں آگے کچھ نہیں لکھوں گا کیونکہ میرا ارادہ ایک دن اس کے متعلق ایک کہانی لکھنے کا ہے۔ اور میں اس کہانی کے قیمتی مسالے کو یہاں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں، تو بمبئی پہنچنے پر

سب سے پہلے پرتھوی راج نے میرے ساتھ اپنے مشہور پرتھوی تھیٹرز کے لئے ایک ڈرامہ لکھنے کا معاہدہ کیا۔ لیکن کچھ اس طرح کا کہ وہ تو مجھے اسی دن سے ہر ماہ ایک مقررشدہ قسط کی رقم دیتا چلا جائے۔ اور میں پہلے اپنا ناول آرام سے ختم کروں۔ اور پھر ڈرامہ کی طرف توجہ دوں۔

یہاں مجھے اپنے دوست بجن کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے۔ جس نے بمبئی کی اس مردم کش گہما گہمی میں بھی اپنے اس پرسکون "تھریس ولا" میں پناہ دیکر مجھے اس ناول کو سڑک کی پٹڑیوں پر بیٹھ کر لکھنے سے بچا لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی نیلو بھابی اور پاربتی بھابی (مسز داس) کا بھی، جنھوں نے اکثر یہ دیکھ کر کہ یہ پگلا تو لکھنے کے شوق میں کھانے کے لئے بازار تک آنے جانے کا وقت برباد نہیں کرے گا۔ اور اسی طرح بھوکا ہی بیٹھا کام کرتا رہے گا۔ کئی بار چپکے سے کھانے کی تھالی کچھ ایسی اپیل اور رحم کے ملے جلے انداز میں میرے سامنے لاکر رکھ دی ہے گویا میں کچھ کھا لوں گا تو ان پر کوئی بہت بڑا احسان کر دونگا۔ اور اس طرح انھوں نے کئی بار لیلا کی غیرموجودگی کے احساس کو بھی میرے دل میں کھٹکنے نہیں دیا۔ لیلا ــــــ جو شادی کے بعد آج تیرہ سال سے ایک محافظ فرشتے کی طرح میری کچھ ایسی حفاظت کرتی آئی ہے۔ کہ اب اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر وہ میری ہمراہ نہ ہوتی تو تپ دق سے اس طرح صاف بچ نکلنا تو کجا، میں اگر اچھا بھلا بھی ہوتا تو جن مصائب کو میں نے اس کے ساتھ ہنستے ہنستے سہہ لیا وہی مجھ اکیلے کو دق کی خوراک بنا دینے کے لئے کافی ہوتیں۔

ان حالات میں اب تک دو وقت کی روٹی ملتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ میں

نے ۴ر مئی ۴۷ء کو ناول کا آخری حصہ بھی ختم کر دیا۔ اور اب اینٹی کلائمکس دیکھئے۔ کہ دوسرے ہی دن جو کرشن چندر سے میری ملاقات یوں ہی بر سر راہے ہو گئی۔ تو وہ بڑی تاکید کرتا ہوا کہنے لگا کہ "دیکھو، ناول تم کسی اور پبلشر کو نہ دینا اسے نَوھند والے شائع کریں گے"۔ چنانچہ یہ جو کتاب اب آپ کے سامنے ہے۔ اس کی ظاہری خامیوں یا کمزوریوں کے ذمہ دار ناشران ہیں اور باطنی کا میں اور میرے حالات۔

⁂ ⁂ ⁂

یہ ناول پریس کو جا رہا ہے۔ اور میں پھر اداس ہوں۔ اس سلسلے میں میں ایک خط کا اقتباس پیش کر کے آپ کے صبر کا امتحان ختم کرتا ہوں یہ میں نے چند روز ہوئے ایک دوست کو لکھا ہے۔

"... ... البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اس ہنگامی دور میں جن کرداروں نے ڈیڑھ سال تک نہایت وفاداری سے ہر اچھے بُرے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ ان کا ساتھ چھوٹتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ ان میں سے کچھ تو نہایت دردناک حالات میں ناول کے دوران میں مر گئے۔ اور جو باقی بچے ہیں۔ انھیں کل پبلشر کے حوالے کر دوں گا۔ اور میں ان کے بعد پھر ایک اکیلاپن اور اُداسی محسوس کر رہا ہوں۔

اس خلا کو پُر کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ کہ کچھ نیا لکھنا شروع

کر دوں۔ اور لکھنے کو ہے بھی بہت کچھ، جو اندر ہی اندر مچل رہا ہے۔
لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب میں ایک طویل عرصے تک
خالص ادبی طور پر کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔ کیونکہ اس ذہنی یا قلبی خلا کو
پُر کرنے کے بجائے پیٹ کے اس وسیع خلا کو پُر کرنا دردناک حد تک
ضروری ہو رہا ہے ... ... "

۳۱ر جولائی ۱۹۴۸ء
وتھرلیس ولا،
آرلم چرچ۔ ماروی روڈ
ملاڈ۔ بمبئی

راماننـد ساگر

پہلا حصہ

سُرخ فوّارے

پہلا باب

ہال میں ایک چھوٹی سی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اور ناچنے والی کے پاؤں یک لخت رک گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر رقص کرتا ہوا وہ پنجابی گیت بھی۔

نہ کر گوریئے میلیاں اکھیاں کل پردیسیاں ٹُر جانا
ندی ناؤ سنجوگی میلے کون جانے کد مڑ آنا

(اے حسینہ۔ اپنی آنکھیں میلی نہ کر۔ ہم پردیسی لوگ تو کل چلے جائیں گے۔ ندی اور ناؤ کی مانند ہمارا ملاپ سنجوگ

قسمت اور اتفاق کے بس میں ہے۔ چنانچہ کون جانے
کب واپسی ہو (یا نہ ہو) }

گیٹ کے بند ہوتے ہی آنند کو ایک دھچکہ سا محسوس ہوا۔ گھوم کر دیکھا تو ہال پر ایک ویرانی سی چھائی نظر آئی۔ کیفے کے اس وسیع ہال میں جہاں ایک سو سے زیادہ ٹیبل بچھے ہوئے تھے۔ صرف سات آدمی بیٹھے تھے۔

"کرفیو ——— !" بجانے کس نے یہ لفظ نہایت آہستہ آواز میں کہا۔ اور پھر ہوا کی ایک ہی رَو نہایت راز داری کے انداز میں اُسے ہر ایک کے کان تک پہنچا آئی۔ اُن سب نے بیک وقت گھڑی کی طرف دیکھا۔ اور پھر کاؤنٹر کی طرف۔ جہاں سے بل لے کر بہرے اپنے اپنے ٹیبل کی طرف لمبے لمبے قدم بڑھا رہے تھے۔

اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے خود اس کی طرح ہر ایک کی نگاہوں میں جھلکتی ہوئی بے بسی کسی سے یہ کہنا چاہتی ہے کہ "اتنی جلدی کیوں؟۔ اور پھر اس جگہ کرفیو آرڈر کی کیا ضرورت ہے؟؟ ——— مال روڈ کے اس کیفے میں ہم نے ہمیشہ تہذیب کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کئے ہیں۔ یہاں ہم نے کبھی اونچی آواز میں باتیں تک نہیں کیں۔ بلکہ بوٹوں کی آواز سے بھی کسی کے آرام میں مخل ہونے سے احتراز کیا ہے۔ یہاں ہم نے ہر عورت کو پہلے گزرنے کے لئے ہمیشہ راستہ دیا ہے۔ چاہے وہ شلوار پہنے

ہوئے تھی یا ساری یا فراک۔ اُنھیں ناملائم نگاہوں سے کبھی گھورا نہیں، یہاں اگر کوئی بھولے سے بھی ہماری میز پر آگیا ہے۔ تو اُسے ہم نے نہایت خلوص سے شریکِ پیالہ ہونے کی دعوت دی ہے۔ پھر یہاں کرفیو آرڈر کیوں ——؟ اور اگر یہ نہایت ضروری ہے تو ابھی کیوں۔؟

تھوڑی دیر اس لڑکی کو اور گانے دو وہی گیت

ندی ناؤ سنجوگی میلے کون جانے کد مُڑ آنا

لیکن اس طرح اُڑی اڑی رنگت اور اُکھڑی اُکھڑی آواز کے ساتھ نہیں۔ جس طرح آج بار بار گھڑی کی طرف دیکھتی ہوئی یہ کوئی تلخ فرض پورا کرتی دکھائی دے رہی ہے۔ بلکہ اس طرح جس طرح یہ اُن دنوں گایا کرتی تھی۔ جب رات کے بارہ بجے کے بعد اس کی آواز میں ایک نیا لوچ، اس کی رنگت میں ایک نیا نکھار اور اس کے قدموں میں ایک نئی تھرکن پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ جب آدھی رات کے بعد اس کیفے میں ایک نیا دن انگڑائی لیتا تھا۔ جب حسین عورتوں کے بالوں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی خوشبوئیں ہال کے کونے کونے میں بہا بہاری ہوتی تھیں۔ اور یہ لڑکی ہر دعوت دینے والے کی ٹیبل پر جاکر اس کے جام سے چند گھونٹ پی آیا کرتی تھی ... لیکن آج جب کہ سارے ہال میں ایک عورت بھی دکھائی نہیں دے رہی۔ ہمیں غیر مہذب ہو جانے کا ڈر ہے۔ اسے کہو کہ ابھی اور ناچے اور گائے۔

نہ کر گوریئے میلیاں اکھیاں کل پردیسیاں ٹر جانا

ہاں ــــ کون جانتے کہ کل ہم میں سے کون لوٹ کر یہاں نہ آ سکے ۔ فسادی کا چھرا کس کا انتظار کر رہا ہو ۔ یہ کس کی آخری رات ہو ۔ اس لئے آج تو یہاں اتنی جلدی کرفیو نہ لگاؤ ... "

لیکن بہرہ اس کے سامنے بل رکھ کر میز پر پڑی ہوئی پلیٹیں اور گلاس اٹھا رہا تھا ۔ اس نے بل ادا کیا اور باہر نکل آیا ۔

⁂ ⁂ ⁂

باہر شہر کی حسین ترین سڑک مال روڈ پر کس مپرسی کی حالت طاری تھی ۔ میونسپل لیمپوں کی اداس روشنی اور رات کی بھیانک تاریکی دونوں مل کر جیسے اُسے کھائے جا رہی تھیں ۔ اور سڑک کا چہرہ ایک لاش کی طرح زرد پڑ گیا تھا ــــ آج اس میں وہ خون کہاں تھا ۔ جو اس کے سینے پر چہل قدمی کرنے والے انسانوں کی رگوں میں دوڑا کرتا تھا ۔ اور جو پیار بھری نگاہوں کے ٹکراتے ہی اس کے دل کی دھڑکن بن جایا کرتا تھا ۔ آج اُسے مال روڈ کا سینہ پتھر کا بنا ہوا دکھائی دیا ۔ جس میں وہ دھڑکنے والا دل کہیں بھی محسوس نہ ہوتا تھا ۔ اسے پہلی مرتبہ اس حقیقت کا احساس ہوا کہ ۔ مال روڈ بھی انسان کی طرح ہمیشہ سے ایسی نہ تھی شروع میں وہ محض جنگل کی ایک پتھریلی راہ گذر تھی ۔ اور انسان ایک سنگدل وحشی ــــ ! اس کی زندگی میں بھی رونق اور روشنی اسی دن آئی ۔ جب تہذیب نے انسان کو اپنا سب سے بڑا عطیہ محبت کی صورت میں عطا کیا ــــ پھر انسان نے خوف اور غصے کو قابو میں کر کے اس سڑک

کو نازک ریشمی لباسوں کی خوشبوؤں میں بسایا۔ اسے معصوم بچوں کی کلکاریوں اور رومانی قہقہوں سے نورانی بنادیا۔ اور کنارے کے ریستورانوں سے نکلتی ہوئی رقص و موسیقی کی تانیں اس کی فضاؤں میں تیرنے لگیں۔ جنگل کی اس پُرخار اور پُرخطر پگڈنڈی کو ایک مہذب شہر کی زندہ اور نورانی شاہ راہ بنانے کے لئے انسان نے ہزاروں سال ان تھک کوشش کی۔ چاہے اس کے لئے آسے عیسے، محمد اور بدھ جیسے اپنے عظیم ترین ساتھیوں کی قربانی بھی دینا پڑی ... ... اور آج ـــــ ہزاروں سالوں کی ان کوششوں اور قربانیوں کے بعد چند مقامی آدمیوں نے چند ہی دنوں میں پھر اس کا سارا خون چوس لیا تھا۔ انسان پھر وحشی ہو گیا تھا اور ڈرنے لگا تھا" وہ سوچنے لگا کہ ، شائد وحشت ہی کا نام ڈر ہے ـــــ لیکن "۔ وہ سوچتا گیا اس کمزوری میں بھی کتنی طاقت ہے۔ کہ ہزارہا سالوں کی محنت پر چند گھنٹوں میں پانی پھیر دیتی ہے ... اور پھر اگر ایک لاہور کی مال روڈ کا خون چوس لینے سے سارے پنجاب کی سڑکوں پر مردنی چھا جاتی ہے۔ تو سارے پنجاب کی یہ موت دہلی کے خاندانی چوک کو کب چھوڑے گی۔ اور پھر اس کی موت نیویارک کے سٹی سکوائر، لندن کے ٹریفالگر سکوائر یا ماسکو کے ریڈ سکوائر کو زندہ رہنے کا حق کب دے گی۔ پھر اس طرح ایک دن سب مرجائیں گے ـــــ! نہیں ـــــ نہیں ... ... " وہ اس خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ لیکن حقیقت کو وہ کب تک جھٹلا سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہونے لگے، کہ "کیا ہزاروں سال تک انسان

محض ریت کا ایک قلعہ تیار کرنے میں مصروف رہا؟ اور پھر آج سے ہزاروں سال بعد بھی کیا انسان کو اسی طرح بہار اور نوا کھلی کے پُر خار جنگلوں اور دریاؤں میں ننگے پاؤں گھوم گھوم کر وحشیوں کو سمجھانا پڑے گا؟ تاکہ ان کا ڈر اور وحشت دور کی جا سکے۔ اور پھر کیا اس کے ساتھ بھی اسی طرح جھوٹے وعدے کئے جائیں گے۔؟ تو کیا یہ سب کچھ محض جھوٹ ہے اور فریب ——— محبت اور اخوت کے پیغامبر کیا محض فریب کار تھے ———؟ تو کیا تاج محل کو محبت اور وفا کے نام پر بہائے گئے آنسوؤں سے تعمیر نہیں کیا گیا؟ کیا وہ محض سفید پتھروں کا ایک ڈھیر ہے ... ... "

اور اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے مٹھی بھر آدمی مل کر لاکھوں انسانوں کی مشترکہ کوشش سے بنے ہوئے تاج محل کو توڑ رہے ہوں محنت اور کاریگری سے تراشے ہوئے اس کے پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چاروں طرف بکھر رہے ہوں۔ اور وہ تاریک اور سنسان سڑک پر چلتا ہوا پریشان ہو گیا۔ وہ چاہنے لگا۔ کہ کاش کوئی شاہجہاں پھر سے پیدا ہو جائے جو پتھر کے ان ٹکڑوں کو گرمیٔ عشق سے پگھلا کر پھر آنسوؤں کے قطرے بنا دے اور آنسو کا ہر قطرہ ایک تاج محل بن جائے ... ... لیکن گو اس وقت اسے اپنے چاروں طرف آنسوؤں کا ایک سمندر دکھائی دے رہا تھا ——— بیواؤں اور یتیموں کے کروڑوں آنسوؤں کا ایک سمندر۔ مگر وہ سب مل کر ایک بھی تاج محل نہ بنا سکے تھے۔ البتہ اس سمندر کے

چپہ چپہ پر خون کے سرخ فوارے ناچ رہے تھے۔ فسادی کے چھرے اور پولیس کی گولیوں سے قتل ہونے والوں کے گرل گرل کر کے بہتے ہوئے خون کے فوارے۔ جن کے دھارے بھوک اور مصیبت کی آگ میں جلنے والے یتیموں اور بیواؤں کے آنسوؤں میں جذب ہو رہے تھے۔

خون کے دھاروں کا تصور آتے ہی اسے اپنے محلے کا وہ نوجوان اجیت یاد آگیا۔ جو چوبیس گھنٹے تک آگ سے لڑتا رہا تھا۔ مسلمانوں نے ان کے محلے کو آگ لگا دی تھی۔ اور آگ بجھانے والوں پر پتھراؤ کے علاوہ وہ لوگ مسلم پولیس کی موجودگی میں اس پر آگ بجھانے والے پمپ کے ذریعہ پانی کی بجائے مزید پٹرول ڈال رہے تھے۔ لیکن اس نوجوان نے آگ کو ایک مکان سے آگے بالکل نہ بڑھنے دیا تھا۔ اس کی شادی کو ابھی صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ اس کی بیوی کی کلائیوں میں ابھی سرخ چوڑا موجود تھا۔ لیکن وہ برابر آگ سے لڑتا رہا۔ حتیٰ کہ آگ پر قابو پا لیا گیا۔ مگر اتنی دیر میں ہوا نے رُخ بدلا۔ اور آگ کی لپٹوں نے بڑھ کر بازار کے اُس پار مسلمانوں کے ایک مکان کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہا۔ تو اس بہادر نے کھڑکی میں سے آدھا دھڑ باہر نکال کر اُس مکان پر بھی پانی پھینکنے کی کوشش کی۔ لیکن عین اس وقت سامنے کے کوٹھے پر بیٹھی ہوئی مسلم پولیس پکٹ کے سپاہی نے رائفل کا گھوڑا دبا دیا ـــــــ گولی اس کے ماتھے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

وہ نظارہ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے سے پھر گیا۔ جب انھوں نے اجیت کو ہسپتال لے جانے کے لئے چارپائی پر ڈالا۔ اس کے ماتھے سے بھی گرل گرل کرتا ہوا خون ایک فوارے کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ اس کی بیوی کی کلائی میں پڑی ہوئی چوڑیوں کے رنگ کا سا خون۔ ہسپتال تک پہنچنے سے قبل خون بند ہو گیا تھا۔ اور اس کے دماغ کی پلپلی چربی باہر کو لٹک آئی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ لیکن آنکھوں کے پپوٹے اور ہونٹ سیاہ نیلے ہو گئے تھے۔ بالکل اس شرک کی پھیکی سی زرد روشنی اور تاریک نیلے آسمان کے بے جوڑ سے امتزاج کی طرح۔ اور پھر اسے اس سنسان فٹ پاتھ کے پتھروں پر اپنے بوٹوں کی آواز کچھ اس طرح کی معلوم ہونے لگی۔ جیسے کہیں سرخ چوڑیاں ٹوٹ رہی ہوں۔ اور پھر جیسے ان ٹوٹنے والی چوڑیوں کے ٹکڑے ایک سرخ فوارے کی طرح ہوا میں ناچنے لگے ......

اسے یہ بھی یاد آیا۔ کہ اس واقعہ کے بعد محلے کے چودھریوں کو صرف اس بات کی فکر لاحق ہوئی تھی، کہ وہ بھی کسی طرح چند ہندو سپاہیوں کی پکٹ اپنے محلے میں بٹھالیں۔ اور دو ہی چار دن کی دوڑ دھوپ کے بعد اعلیٰ افسروں نے ان کے محلے میں ایک ہندو پولیس پکٹ کا انتظام کرا بھی دیا۔ چنانچہ اس طرح صرف چند ہزار روپے خرچ کرنے کے بعد یہ عالم ہو گیا تھا۔ کہ کرفیو کے دوران میں بھی اگر ضرورت پڑتی۔ تو خود پولیس کے سپاہی کو کہا جاتا۔ کہ فلاں جگہ سے اتنے بم اور اسلحہ لا دو۔ تو وہ سرکاری

طور پر گشت کرتا ہوا جاتا۔ اور مقصودہ چیزیں لا دیتا۔ ان حالات میں امن کے امکانات قطعاً مفقود ہو گئے تھے۔ ہر روز اعلیٰ افسر اور لیڈر امن کمیٹیاں قائم کرنے میں بھی لگے رہتے اور ہر روز دونوں طرف سے ایک دوسرے پر کئی کئی مرتبہ حملے بھی کئے جاتے ....

اچانک اسے خیال آیا۔ کہ اُسے محلے سے نکلے ہوئے تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں اس دوران میں وہاں کیا ہو گیا ہو۔ کیا جانے کہ بازار کے اُس پار والے مسلمان آج ہی آگ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ اور اس کا تو سب کچھ اس کے مکان ہی پر تھا۔ اس کی سب سے بڑی جائداد اس کے چند مسودے میز پر کھلے پڑے تھے ـــــ ان نظموں کے مسودے۔ جو اُس نے صرف اپنی محبوب کی خاطر لکھی تھیں۔

یہ خیال آتے ہی چہل قدمی کی ساری لچک جاتی رہی اور اُس نے اپنے محلے کی طرف رُخ کر کے تیز تیز ڈگ بھرنے شروع کئے۔

⁂ ⁂ ⁂

پیڈن روڈ سے گزرا تو صرف دو چار آدمی تیز تیز قدم اٹھاتے ادھر سے جاتے دکھائی دیئے۔ کنارے کے ایک مکان سے ریڈیو کی آواز آ رہی تھی۔ ع

ساون آیا تم نہیں آئے۔ تم بن رسیا کچھ نہیں بھائے"

ہجر کا یہ گیت سنتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ۔ ان چند صدیوں سالوں میں انسان نے شاعر کی صورت میں اپنا مقام خدا اور دیوتا

سے بھی کہیں اونچا بنا لیا ہے۔ چنانچہ آج جب کہ مسلمان اپنے جنت مکانی خدا کی فتح کا نعرہ لگانے کے لئے اور ہندو اپنے سورگباشی پرماتما کی جے جے کار کرنے کے لئے اپنے پہلو بہ پہلو چلنے والوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ اس وقت بھی شاعر ہزاروں لاکھوں میل دور گئے ہوئے اپنے ساتھی کو پکار رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے بغیر اُسے برسات کی بہاریں بھی کوئی دلچسپی یا رنگینی دکھائی نہیں دیتی۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ دنیا کو آج سیاست دانوں کی نہیں بلکہ شاعروں کی ضرورت ہے۔ ان سیاستدانوں کی بجائے جو ہر مسئلے کو اگلے انتخاب کی ووٹوں کی ترازو میں رکھ کر تولتے ہیں۔ ہمیں ان شاعروں کی ضرورت ہے جنھیں عہدوں کا لالچ نہیں۔ جو آدمیوں کو انسان بننے کی تعلیم دے سکیں۔ جو انھیں اپنے ساتھیوں کو محبوب بنا لینے کا گر سکھا سکیں۔ جس طرح ٹیگور نے کہا تھا۔

میں اس انتظار میں ہوں۔ کہ شاید کوئی دو دل آپس میں
مل جائیں۔ اور آنکھوں کے دو جوڑوں کو مہر سکوت
توڑنے اور اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے
میرے گیتوں کی ضرورت ہو

...

کسی کے پاس مسکراہٹیں ہیں۔ میٹھی اور سادہ
اور کسی کے پاس وہ آنسو ہیں۔ جو اس نے تاریک
تنہائیوں میں چھپا رکھے ہیں۔

اُن سب کو میری ضرورت ہے۔ چنانچہ میرے پاس
ماورار زندگی کے متعلق سوچنے کے لئے کوئی وقت
نہیں ہے "۔

اور جیسے کسی رومانی بادل کے سینے میں دفعتاً بجلی کوند جائے۔
اس کے ذہن میں اس گیت کے ساتھ ہی کرفیو کا خیال اچانک چمک اٹھا
گھڑی دیکھتے ہی اُسے احساس ہوا کہ کرفیو لگنے میں اب صرف اتنی دیر
تھی کہ اُسے گرفتاری سے قبل گھر پہنچنے کے لئے قریب قریب بھاگنے
کی ضرورت تھی۔

٭ ٭ ٭

جب وہ گھر پہنچا۔ تو محلے کی کوچہ بندی کی مرمت مکمل ہو چکی تھی،
نئے آہنی دروازے پر ایک موٹا سا قفل لگا دیا گیا تھا۔ اور اندر کی جانب محلے
کے چار نوجوان آہنی سموں والی لاٹھیاں لئے، سروں پر فولادی ہیلمٹ
پہنے پہرہ دے رہے تھے۔ محلے کے اندر پہنچتے ہی اُس نے دیکھا۔ کہ
محلے کے سب سے بڑے سیٹھ کشور لال کی اس بیٹھک میں تمام مرد جمع تھے
جہاں تک عام حالات میں ان آدمیوں کی رسائی بہت مشکل تھی۔ بلکہ اس کی
کھڑکیوں میں سے بھی معمولی آدمی کی نگاہ اندر جانے کی مجال نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ
وہاں اکثر سیٹھ کی نوجوان لڑکیوں کا جھرمٹ اپنی کلولوں میں مصروف ہوتا
تھا۔

سنگِ مرمر پر ایرانی قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ اور ان پر محلے

کے نوجوان کچھ اس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گویا اس فرش کے ایک ایک انچ پر حسن کے لمس کی مہریں لگی ہوں۔ اور اس ایک ایک انچ پر مکمل جسمانی قبضہ کرنا ہی ان کا مقصدِ حیات بنا ہو۔

سیٹھ جی اچانک بے حد خلیق اور ملنسار واقع ہو چکے تھے پچھلے چند دنوں سے انھوں نے محلے کے ہر ایک آدمی سے بات کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اتنا ہی نہیں۔ کہ وہ نمستے کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دینے لگ گئے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی خود بھی پہلے نمستے کر لیتے تھے جب سے فساد شروع ہوا تھا خصوصاً محلے کے نوجوانوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ پہلے کے بالکل برعکس ——— کسی نوجوان کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خوش آمدید کا سا انداز پیدا ہو جاتا۔ سنا گیا تھا کہ سیٹھ جی کی تجوریوں میں بلیک مارکیٹ کا دو اڑھائی لاکھ روپیہ نقد پڑا ہوا تھا۔ اور وہ فساد کے باعث بنک نہ کھلنے کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔

سیٹھ کشوری لال نے آنند کو آتے دیکھا تو مسکرا کر کہا "آؤ شاعر جی کدھر سے آ رہے ہو"

"بس یوں ہی مال روڈ تک گیا تھا۔"

"اچھا ——؟" سیٹھ نے حیرت سے پوچھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں ان دنوں مال روڈ تک جانے کے لئے آدمی کے دل میں رستم کی طاقت ہونی چاہئے تھی "تو سنایئے شہر کا حال چال۔ کوئی نئی

تازہ خبر "

"کوئی نئی بات نہیں سیٹھ جی۔ بس ویسی ہی حالت ہے"

حسب معمول شاعر کے مختصر سے جواب سے سیٹھ جی کی تسلی نہیں ہوئی۔ ہر ایک سے یہی سوال پوچھنا جیسے ان کی عادت ہو گئی تھی۔ اور اکثر لوگ محض اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر سیٹھ صاحب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کا شرف حاصل کرنے کے لئے شہر کے معمولی سے معمولی واقعے کو بھی خوب طول دے کر بیان کرتے تھے۔ لیکن سیٹھ جی جیسے کوئی بھی تسلی نہ کر سکتا تھا۔ وہ ہر ایک سے یہ بھی پوچھا کرتے۔ کہ "اچھا تمھارا کیا خیال ہے۔ لاہور ہندوستان میں رہے گا یا پاکستان میں، اور ہر کوئی اپنی اپنی پسند کے مطابق جواب دیا کرتا۔ لیکن انھیں تو چاہیئے تھی کوئی قطعی اطلاع۔ البتہ محلے میں ایک ہی شخص کی اطلاعات انھیں کسی حد تک متاثر کر سکتی تھیں۔ اور وہ تھا سرداری لال، جسے یار لوگ "سینہ گزٹ" کے نام سے پکارا کرتے۔

اتنے میں سامنے سے وہی سرداری لال آتا دکھائی دیا۔ سیٹھ جی نے فوراً چہرے پر ایک مسکراہٹ چسپاں کر کے ادھر کا رخ کیا۔ اور شاعر کو تکلف کی قید سے رہائی ملی۔ اتنے میں ایک کونے میں بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں نے اُسے پکارا۔

"آنند۔ ادھر آجاؤ"

اور وہ ان کی طرف چلا گیا۔

ادھر سردار ی لال نے چھوٹتے ہی اونچی آواز میں کہنا شروع کیا۔ کہ "سخت لڑائی ہو رہی ہے"

"کہاں ___؟" ایک ساتھ کئی آوازوں نے پوچھا

"رنگ محل میں"

اور سب لوگ آگے کو جھک کر اس کی باتیں سننے لگے۔

"ایک سکھ نے ڈبلی بازار میں تین مسلمانوں کو مار ڈالا ہے۔ اور پانچ زخمی ہوئے ہیں۔ لاشیں ابھی ابھی پولیس ہمارے بازار میں سے لے کر گئی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر رنگ محل پر حملہ کر دیا۔ جب ہندو مقابلے کو نکلے تو مسلم پولیس نے جو پہلے ہی سے مکانوں پر چھپی بیٹھی تھی۔ ہندوؤں پر گولیاں چلانا شروع کر دیں"

اتنے میں کچھ ایسی آوازیں آئیں۔ جیسے ان کے سروں پر ہی چند پٹاخے پھٹے ہوں

"یہ دیکھا۔ تھری ناٹ تھری کی رائفلیں استعمال کی جا رہی ہیں" کسی نے کہا اور پھر سارے مجمع میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے سردار ی لال کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور کچھ لوگ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر چپ چاپ جوتے پہن کر اپنے اپنے مکانوں کی طرف کھسک گئے۔ سیٹھ صاحب نے اپنے نوکر کو آوازیں دینا شروع کیں۔

"اوئے سنتو کے بچے۔ وہ دودھ جو رکھا ہوا ہے۔ تجھے کیوں

نہیں لاتا۔ تجھے وہ اِن سب لڑکوں کو پلانے کے لئے کہا تھا"
"آیا شاہ جی۔" اوپر سے آواز آئی
"اور وہ دس سیر برف بھی رکھی ہے۔ وہ ساری اس میں ڈال کر لانا۔ گرمی بہت ہے۔ اور یہ بیچارے صبح سے اسی طرح پہرے پر بیٹھے ہوئے ہیں"

اُدھر رائفلوں کی تڑاخ پٹاخ کے ساتھ ساتھ اپنے نشانوں کی طرف جاتی ہوئی گولیوں کی "شوں" سی لمبی آوازیں بھی برابر آ رہی تھیں۔
"لیکن گولیوں کی آواز سے تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے دونوں طرف سے آ جا رہی ہوں" کسی نے کہا

سرداری لال نے جھٹ جوڑ دیا "ہاں ہاں۔ دونوں طرف سے اِدھر بھی بالا بندوق لئے بیٹھا ہے۔ اور کبھی کبھی ہندو اس کی مدد کو پہنچ رہے ہیں۔ وہ بھی کسی ہندو سپاہی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جسے وہ ایک ہزار روپے تک دینے کو تیار ہیں۔ لیکن درحقیقت اکیلے بالے ہی نے وہ مورچہ جیت لیا ہے۔ اب تک تین مسلمان سپاہیوں کو وہ کوٹھے سے گرا چکا ہے۔ کیا نشانہ ہے اس کا۔!"

اتنے میں گولیوں کی آواز بند ہو چکی تھی۔ لوگ پھر ذرا پیچھے ہٹ کر اپنی اپنی نشستوں پر ذرا آرام سے ہو بیٹھے۔ سرداری لال کچھ اور کہہ رہا تھا۔ کہ اچانک سیٹھ جی کو کچھ یاد آ گیا۔ اور انھوں نے زور سے آواز دی۔

"او ئے سنتو"

"جی، دودھ میں برف ڈال دی ہے۔ بس آرہا ہوں"۔ سنتو کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

"اوئے سُن۔ اس میں سے دو چار سیر برف میرے لئے رکھ لینا۔ اور آدھا دودھ بچوں کے لئے اوپر ہی چھوڑ آنا۔ آج تیری بی بی نے بھی روٹی نہیں کھائی۔ اس کے لئے بھی کچھ رکھ لینا۔"

سنتو کی آواز آئی ـــ "بہت اچھا شاہ جی ـــ!"

⁂ ⁂ ⁂

اُدھر آنند نوجوانوں کے درمیان بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اجیت مرحوم کی بیوی کا ذکر ہو رہا تھا۔

پرکاش نے کہا کہ "بھئی سچ تو یہ ہے کہ ان پھٹے کپڑوں میں بھی اس کا حسن چمک اٹھتا ہے"

"لیکن اس کی شادی پر اچھے اچھے کپڑے تو بنے ہوں گے۔ وہ انھیں کیوں نہیں پہنتی ـ ؟" ایک نیم جوان لڑکے نے پوچھا۔

"اس کا خاوند جو مر گیا ہے۔ اب وہ کس کے لئے رنگین کپڑے پہنے"

"ہم جو قدرداں بیٹھے ہیں۔ پھر اُسے کس بات کی کمی ہے" پرکاش نے کہا۔

"کمی تو بہت ہے" کسی نے ہمدردانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا

"سنا ہے کہ سسرال والوں نے اُسے یہ کہہ کر الگ کر دیا ہے۔ کہ اس نصیب جلی نے آتے ہی ان کے بیٹے کو کھا لیا ہے۔ اب اس کی حیثیت وہاں محض نوکرانی جیسی ہے"

"ان کے لئے نوکرانی ہو گی۔ اپنے لئے تو دل کی رانی ہے۔ کیوں شاعر؟" نرونم نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنند کو مخاطب کر کے کہا۔

جواب میں آنند محض مسکرا دیا۔ اُسے وہ دن یاد آگیا۔ جب وہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ سسرال آئی تھی۔ اجیت سے چند قدم پیچھے وہ دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیوں سے گھونگھٹ کو ذرا سا کھول کر راستہ دیکھنے کی کوشش کرتی ہوئی نپے تلے قدم رکھتی گلی میں داخل ہوئی تھی۔ اتفاق کی بات کہ اُسی وقت ریڈیو پر کوئی "ہیر" گاتا ہوا وارث شاہ کے ان مصرعوں پر پہنچا تھا۔

گھنڈ حسن دی آب نوں مار دیندا گھنڈ لاہ دے منہ توں ڈاہڈیئے نی
وارث شاہ نہ دیئے مونہیاں نوں تے پھُل اگ دے وچ نہ ساڑیئے نی

اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک ثانیئے بھر کے لئے ایک ایسی شوخ سی چمک پیدا ہوئی تھی۔ اور اس کی چال میں ایک نامحسوس سی لڑکھڑاہٹ کے ساتھ اس کا گھونگھٹ لمحے بھر کے لئے کچھ اس طرح کھل گیا تھا۔ کہ آنند کو وارث شاہ پر رشک آنے لگا تھا۔ جس کی شاعری کو اس ایک لمحہ میں اتنا بڑا خراج ادا کیا گیا تھا۔

"اجیت مفت میں مر گیا۔ اُس نے تو ایک بھی اینٹ نہیں

چلائی تھی۔ کہتا تھا۔ کہ میں صرف آگ بجھانے کا کام کروں گا۔" گفتگو کا مرکز اتنے میں قدرے تبدیل ہو گیا تھا۔

دوسرے نے کہا "بھئی۔ وہ کوٹھے پر آنے سے ڈرتا تھا۔ کہ کہیں کوئی اینٹ پتھر نہ لگ جائے"

"لیکن وہ تو بڑا گاندھی بھگت بنا پھرتا تھا" کسی نے کہا

"ڈرپوک اور کائر اسی طرح کے بہانے ڈھونڈا کرتے ہیں اور پھر بن آئی موت بھی نہیں مرتے ہیں" قریب سے نروتم نے کہا "ہمیں دیکھو۔ اس دن چھ گھنٹے تک برابر کوٹھے سے اینٹیں چلاتے رہے ہیں۔ اور رات کو آگ کے گولے مسلمانوں کے مقابلے میں برابر پھینکتے رہے ہیں"

"مگر یار۔ لڑکیوں نے بھی اس روز کمال کر دیا۔ سات بھر وہ اینٹوں کو توڑ توڑ کر روڑے بناتی رہی ہیں۔ اور انھیں کپڑے میں باندھ کر پٹرول کے ٹب میں ڈالتی رہی ہیں۔ ہم تو صرف انھیں آگ لگاتے تھے۔ اور بازار کے اس پار مسلمانوں کے محلے میں پھینک دیتے تھے"

"بھئی سچ پوچھو۔ تو مجھے تو چند گولوں میں سے حنا کی بو آرہی تھی۔ ہائے کن نازک ہاتھوں کے بنے ہوئے تھے وہ کہ انھیں پھینکتے وقت جانے کہاں سے اتنا زور آجاتا تھا"

برابر میں بیٹھا ہوا وہی نیم جوان لڑکا بول اٹھا "اس دن تو سیٹھ کی تینوں لڑکیاں بھی ننگے پاؤں کام کرتی پھر رہی تھیں"

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ سیٹھ اپنے بال بچوں کو ہر دوار بھیج رہا ہے،" ایک نوجوان نے کچھ ایسے انداز میں پوچھا۔ جیسے اس بات کا خیال ہی اس کی ہمت پست کر رہا ہو۔

"ارے ابھی کہاں۔ ابھی اسٹیشن تک پہنچنا ہی کون سا آسان کام ہے،" کسی نے جواب دیا۔

"لیکن ریلیف کے ٹرک جو ہیں،" اس نے پھر پوچھا

"ان ٹرکوں پر ہی تو بم بھی گرتے ہیں نا۔ اور پھر ہندو مسلمان دونوں کے ریلیف ٹرک اسلحہ ڈھونے کا کام زیادہ کرتے ہیں۔ مصیبت زدگان کو لانے لے جانے کا کم۔"

"بم کی بات کہو تو ٹھیک ہے۔ وگرنہ ریلیف ٹرک غریبوں کے لئے نہ سہی۔ امیروں کے کام کو تو نہ نہیں کر سکتے۔"

اور پھر گفتگو کا رخ بموں کی طرف بدل گیا۔

پرکاش کہنے لگا کہ "کاش میرے پاس ایک ایٹم بم ہوتا۔ تو میں سارے پنجاب کے مسلمانوں کو ایک ہی بم سے ختم کر دیتا۔"

آنند اس پر ہنس دیا۔ "تو اس طرح کیا ہندو بچ جاتے۔"

"تم بھی نرے شاعر ہو۔ ارے میاں۔ میں تمام ہندوؤں کو ایک گھنٹے کے لئے پنجاب سے باہر نہ نکال لیتا۔"

"صرف آدمیوں کو باہر نکالنے سے کیا ہوتا،" آنند سنجیدہ ہو گیا "ان کے مکان، ان کی گلیاں ان کی روائتیں اور ان کے پُرکھوں

کی داستانیں جو اس سرزمین کے چپے چپے سے وابستہ ہیں۔ ان کے بزرگوں کی یادگاریں اور تہذیب اور ان کا تمدن ــــــ کیا سب کچھ پنجاب میں نہ رہ جاتا۔ اس صورت میں تمہارا ایٹم کیا مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کا سب کچھ بھی تباہ نہ کر دیتا۔ اور پھر جنہیں تم اپنی ہزاروں سالوں کی روایات و تمدن سے محروم اور ننگا کر کے پردیس میں جا پٹکتے۔ ان کی حالت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہو۔ کیا تم نے پنجابی کی وہ مثال نہیں سنی ... کہ "شالا پردیسی کوئی نہ ہووے تے ککھ جنہاں توں بھارے"۔ میرے دوست غریب الوطنی میں انسان تنکے سے بھی ہلکا ہو جاتا ہے"

اس کے خطیبانہ انداز سے اُوب کر نروتم نے بیچ میں ٹوک دیا۔

"ارے چھوڑو بھی۔ تم لوگ تو کتابی قسم کی گفتگو میں مبتلا ہو گئے ہو۔ البتہ اگر میرے بس میں ہو۔ تو ایک بم کم از کم اس مجسٹریٹ کے سر پر تو ماروں۔ جس نے اُس روز دو سو ہندوؤں کو ایک قتل کی تفتیش کے بہانے ایک بڑے احاطے میں اکٹھا کر کے ان پر کسی مسلمان سے بم پھنکوا دیا!"

"تو کیپٹن سے ایک بم مانگ کیوں نہیں لیتے" اسی نیم جوان لڑکے نے جواب دیا۔

اس بات سے تمام لڑکے چونک پڑے۔ پرکاش نے جھٹ اس کی بات کاٹی۔

"کیپٹن کے پاس کہاں سے آیا بم!"

وہ لڑکا یہ سمجھ کر چپ ہو گیا، کہ اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے

جو اسے نہ کہنی چاہیے تھی۔ دوسرے تمام نوجوانوں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ درحقیقت وہ لوگ اس راز کو دوسرے لوگوں پر عیاں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ خصوصاً قریب ہی بیٹھے ہوئے لالہ بنواری لال پر۔ جو اس طرح اسلحہ وغیرہ رکھنے کا کٹر مخالف تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ان چھوکروں کے ہاتھ میں محلے کی باگ ڈور دے کر بڑی غلطی کی گئی ہے۔ یہ کسی روز محلے پر کوئی نہ کوئی آفت لے آئیں گے۔ اور اسی روز سارے محلے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی "۔ وہ محلے کا سب سے بڑا امن پسند تھا اور امن کمیٹی کا ممبر بھی۔ اس کی امن پسندی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز جب ساتھ والے محلے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ تو اس نے اپنے مکان میں سے جس کے دروازے دونوں محلوں میں کھلتے تھے۔ نہ صرف ان نوجوانوں کو راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ جو آگ بجھانے کے لئے جانا چاہتے تھے۔ بلکہ دوسرے محلے کی ان عورتوں اور بچوں کو بھی منع کر دیا جو بڑھتی ہوئی آگ کے باعث اس محلے میں پناہ لینے آنے تھے۔ کیونکہ اسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ساتھ والے محلے میں پولیس کا ایک دستہ آنے والا ہے۔ اور ہر امن پسند کی طرح وہ پولیس سے بے حد ڈرتا تھا۔ چنانچہ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ۔

"کرفیو کے وقت میں میں تم لوگوں کو اس طرح ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانے نہیں دوں گا۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔ اور پھر جب کہ تمہارے پاس سگریٹوں کے یہ ڈبے موجود ہیں۔ جن میں تم

نے بم چھپا رکھے ہیں "

اُن نوجوانوں کو اس کی ایک ایک بات یاد تھی۔ چنانچہ نردتم نے اس نیم جوان لڑکے کو راز میں لیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا: "یہ بات کہتے وقت تمھیں خیال نہ آیا۔ کہ تمھاری بغل میں ایک مہا تما گاندھی بیٹھا ہوا ہے۔ جو ابھی ہم سب کو پولیس کے حوالے کر دے گا "

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا۔ جس کے ختم ہونے سے پہلے پرکاش نے سرگوشی کے عالم میں کہا۔ کہ "سنا ہے مہا تما اپنی لڑکیوں کے بارے میں بھی بالکل امن پسند واقع ہوا ہے۔ وہ کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کرتا۔"

"کیا اس کے لئے بھی ثبوت کی ضرورت ہے" ایک لڑکا بولا۔ "سیٹھ کشور لال کے لڑکے پردمن کو نہیں دیکھا۔ کس طرح کھلم کھلا کملنی کو اپنے اوپر والے کمرے میں بٹھلائے رکھتا ہے۔ مہا تما اور کشور شاہ دونوں اس بات کو جانتے ہیں "

اس پر نردتم نے چوٹ کی کہ: "اگر سیٹھ کو اپنے لڑکے پر اعتراض نہیں تو پھر وہ اپنی اوشا کے سلسلہ میں آنند سے کیوں بگڑتا ہے "

"لیکن آنند کوئی لکھ پتی کا لڑکا تو نہیں ہے" ایک لڑکے نے آنکھ مارتے ہوئے کہا: "تم نے دیکھا نہیں کہ جب رائے بہادر گنگا سنگھ کے لڑکے آتے ہیں۔ تو ان کے لئے تمام دروازے کس طرح کھل جاتے ہیں۔ کہ جو راستہ پسند آئے۔ اسی سے داخل ہو جائیں "

اس پر پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن آنند اپنے عشق کا تذکرہ تک برداشت نہ کر سکتا تھا۔ وہ اس معاملے میں بہت حساس تھا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک کر لالہ بنواری لال والی ٹولی میں ہو بیٹھا۔

وہاں مزدوروں کا ایک خود ساختہ لیڈر پریتم سنگھ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ باتیں سنا رہا تھا۔ جو اس نے خود نہیں سوچی تھیں۔ بلکہ پارٹی کی ایک اور رکن پشپا سے سنی تھیں۔ اور جو غالباً اس نے بھی کسی پارٹی پمفلٹ میں سے پڑھ کر زبانی یاد کر رکھی ہوں گی۔

"ہمارے ہاں کے پرولتاری لوگ اس طرح ساری طاقت ایک دوسرے کے خلاف ضائع کر کے اپنا کس قدر نقصان کر رہے ہیں۔ کاش وہ لوگ یہی طاقت بورژوا طبقے کے خلاف ایک "کلاس وار" کے لئے استعمال کرتے تو آج ہندستان پاکستان کا جھگڑا ہی نہ رہتا۔ بلکہ سب لوگ ایک پرولتاری اسٹیٹ کے سائے میں خوشی سے زندگی بسر کرتے ہوتے۔"

لالہ بنواری لال اُن کتابی الفاظ کے معنی بالکل نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے جا رہے تھے۔ انھیں صرف لفظ "وار" کے معنی سمجھ میں آئے۔ اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ یہ لیڈر پارٹی بھی کس قدر عقلمند پارٹی ہے جو شاید ان ہی کی طرح جنگ میں مدد دے کر ٹھیکے حاصل کرنے میں مدد کر سکتی ہے۔ اور پھر جنگ کے ٹھیکیداروں سے زیادہ خوش حال دُکون ہو سکتا تھا۔

مزدور لیڈر کا انداز بیان زیادہ پُر زور ہوتا جا رہا تھا۔ لالہ بنواری لال کی توجہ بڑھتی جا رہی تھی اور وہ دونوں بہت خوش تھے۔

* * *

سیٹھ کشور لال نوجوانوں کو ایک طرح سے دودھ کی دعوت دے کر خود ایک ضروری کام سے اوپر کی منزل پر جا بیٹھے تھے اور ان کا ایک نوکر لوگوں کو چاندی کے گلاس میں پانی پلا رہا تھا۔

گلی کے اندرونی حصے سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آ رہی تھیں وہاں کیپٹن چمن لال ایک لوہار کو ساتھ لئے لاٹھیوں کے سروں پر لگانے کے لئے برچھیاں تیار کر رہا تھا۔ دو چار خاص نوجوانوں کے علاوہ اس طرف جانے کی اجازت کسی کو نہ تھی۔ کیونکہ گلی والوں سے چندہ لیتے وقت کیپٹن نے اس بات کا وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اس سے خرچ کی تفصیل نہیں پوچھیں گے۔ اور جب محلے کے چودھریوں نے خراب تر ہوتے ہوئے حالات کے پیش نظر محلے کی کمان کسی نوجوان کے ہاتھ سونپنے کا فیصلہ کیا تھا، تو سب نے حلف اٹھایا تھا کہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود نوجوان کیپٹن کو صرف اسی روز مکمل کنٹرول حاصل ہوتا۔ جس روز شہر کی حالت خراب سنی جاتی۔

بیٹھک کے سامنے کھلے برآمدے میں بیٹھا ہوا سینہ گزٹ، سامعین کے ایک بہت بڑے مجمع کو دن بھر کے مختلف واقعات سنا رہا تھا۔

"آج ہمارا ایک دوست بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہے۔ وہ ایک مسلمان علاقے سے گزرتا ہوا کچھ اس طرح ڈر گیا۔ کہ اپنے ایک مسلمان دوست کے ہاں پناہ لینے کی غرض سے چلا گیا۔ وہ دونوں بچپن سے دوست ہیں۔ اور جوانی میں یہ رشتہ مضبوط تر ہو گیا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ شخص اُسے جلدی سے اندر لے گیا۔ اور بڑے تکلف سے اپنی بیٹھک میں بٹھا کر خود باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا۔ تو اپنے دوست سے کہنے لگا کہ۔

"مجھے افسوس ہے دوست۔ حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ پرانے اصولوں اور اخلاق کے قاعدوں کو مجبور ہو کر بدلنا پڑ گیا ہے۔

"کیا مطلب؟" ہندو نے وضاحت کے لئے پوچھا

اس نے جواب دیا کہ "مختصر بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں سکھوں اور ہندوؤں نے میرے دو بھائیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اور جب سے یہ خبر آئی ہے۔ میں نے عہد کر رکھا ہے۔ کہ مجھے سب سے پہلے جو چار ہندو ملیں گے انھیں اس چھری سے قتل کر دوں گا" اور یہ کہہ کر اس نے کرتے کے اندر چھپائی ہوئی ایک تیز چھری نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ جسے ہاتھ میں گھماتا ہوا وہ کہتا گیا "تم جانتے ہو کہ میں باہر لڑائی جھگڑے میں جانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ لیکن اللہ کارساز ہے۔ اس نے خود ہی تمھیں میرے گھر بھیج دیا ہے۔ چنانچہ بسم اللہ تمھیں سے ہو گی"

"لیکن تم تو میرے بچپن کے دوست ہو" ہندو نے کہا

"مگر وہ دونوں میرے ماں جائے بھائی تھے"
"لیکن انھیں میں نے تو نہیں مارا"
"مارنے والے تمھارے مذہبی بھائی تھے۔ جس طرح اپنے مقتول بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا مجھ پر فرض ہے۔ اسی طرح اپنے قاتل بھائیوں کے عمل کا خمیازہ تمھیں اٹھانا پڑے گا"
یہ کہ کر وہ آگے بڑھا تو ہندو نے کہا "تمھاری آنکھوں کا پانی اس طرح مر گیا ہے۔ کہ اتنی پرانی دوستی کا کچھ بھی پاس نہیں رہا تمھیں"
"ہاں۔ اس کے لئے میں اب بھی یہ کر سکتا ہوں کہ اس آخری وقت میں تم جو کھانا پینا چاہو۔ میں حاضر کر سکتا ہوں"
"اچھا" ہندو نے قدرے توقف سے کہا "تو وہ مٹر اور آلو والا پلاؤ جو بچپن سے مجھے تمھاری والدہ اپنے ہاتھ سے بنا کر کھلاتی آئی ہے۔ پھر ایک بار کھلاؤ۔ تاکہ آخری وقت بھی دوستی کی ایک پرانی رسم تو پوری ہو جائے"
"دل و جان سے — تم سے پلاؤ اچھا ہے"۔ کئی بار کے دہرائے ہوئے فقرے اس کی زبان پر بے ساختہ آگئے۔ اور وہ اسے باہر سے کنڈی لگا کر چلا گیا۔
کوئی ایک گھنٹے بعد وہ لوٹ کر آیا۔ ایک ہاتھ میں پلاؤ کی رکابی لئے وہ جونہی اندر داخل ہوا۔ تو ہندو نے جو پہلے سے دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ ایک بھاری کرسی زور سے اس کے سر پر ماری۔ اس

کے دوست کا چکرا کر گرنا تھا کہ اُس نے وہی چھری اس کے ہاتھ سے کھینچ کر اس کے سینے میں اتار دی۔ اور خود اُسے باہر سے کنڈی لگا کر شام کے دھندلکے میں چپ چاپ نکل آیا ... ... "

سب لوگ انگشت بدنداں ہو کر سرداری لال کی باتیں سن رہے تھے۔ کہ اچانک ایک طرف سے آواز آئی۔

"کیپٹن آ گیا — "

چمن لال دو اور لڑکوں کے ساتھ لاٹھیوں کا ایک بہت بڑا گٹھا اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوا۔ اور سب کی توجہ اسی جانب مبذول ہو گئی۔ کیپٹن نے لاٹھیاں ایک طرف رکھوا کر حاضری کا رجسٹر نکالا۔

* * *

مجلس کے دوبارہ مجتمع ہوتے ہی چندہ کا سوال پیش کیا گیا۔ آدھے سے زیادہ آدمیوں نے ابھی چندہ نہیں دیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کے ناموں کی فہرست پڑھی جا رہی تھی۔ کہ کہیں قریب سے ایک زور کے دھماکے کی آواز آئی۔ مجلس میں ایک کھلبلی سی پیدا ہو گئی۔ کیپٹن نے اسی وقت دو لڑکوں کو ساتھ کے محلے میں پتہ لگانے کے لئے بھیجا۔ کہ دیکھیں بم کہاں پھٹا ہے۔

اتنی دیر میں تمام لوگ کمرے سے باہر نکل آئے۔ چند نوجوانوں نے برچھی لگی لاٹھیوں کو ہاتھوں میں لے لے کر تولنا شروع کر دیا۔ باہر ایک انتشار کا عالم تھا۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا، کہ کیا ہونے والا ہے۔

Scanned with CamScanner

لوگ اسی پریشانی کے عالم میں باہر تھڑوں پر بیٹھ گئے۔ اور جو موضوع سامنے آیا اسی پر کچھ نہ کچھ کہنا شروع کر دیا۔

لالہ بنواری لال ایک تھڑے پر بیٹھ کر ان لوگوں کے خلاف بہت کچھ کہنے لگ گئے تھے۔ جنھوں نے ابھی چندہ نہیں دیا تھا۔ جب وہ بہت زیادتی پر اتر آئے تو ان کے سامنے بیٹھے ہوئے کلرک نے کہا کہ۔

"ہم نے انکار تو نہیں کیا۔ صرف یہی کہا ہے، کہ اس فساد کے باعث ایک مہینے سے دفتر نہیں جا سکا اور نہ تنخواہ ہی ملی ہے۔ دو دن کے بعد پہلی تاریخ ہے۔ تنخواہ ملتے ہی ادا کر دوں گا۔ آخر میں آپ کی طرح کوئی سیٹھ نہیں۔ کہ جھٹ تجوری سے نکال کر دے دوں"

"تو پھر آپ کے آٹے دال کے لئے بھی کیوں نہ چندہ کرلیں"
بنواری لال نے طنزاً کہا۔

"دیکھئے صاحب۔ کسی کی عزت پر حملہ کرنے کا حق آپ کو نہیں"
کلرک تنک گیا۔

"یہ تو ویسی ہی بات ہے"۔ بنواری لال نے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا "آخر ہم خیرات تو نہیں مانگ رہے۔ یہ تو قوم کا کام ہے۔ اگر آپ کے پاس اپنے کھانے کے لئے اور بچوں کا دودھ لانے کے لئے ہے۔ تو کیا قوم کے لئے ہی کچھ نہیں۔ آپ بی اے پاس ہیں۔ کیا آپ کو بھی یہ باتیں سمجھانا پڑیں گی"

اس پر ایک نوجوان سے نہ رہا گیا۔ تو اس نے کہہ ہی دیا، کہ "آپ

باتیں تو اتنی بنا رہے ہیں۔ لیکن چندہ نہ دینے والوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام آپ ہی کا ہے"

اس پر سیٹھ بنواری لال بہت لال پیلا ہوا۔ اور کیپٹن کی طرف لال لال آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"کس گئو ہتیارے نے چندے سے انکار کیا ہے"

"انکار تو آپ نے نہیں کیا۔ لیکن آپ بیس روپے چندہ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ امتیاز بے انصافی ہے سب سے ایک جتنا لینا چاہیئے۔ اور ویسے بھی چندہ دیتے وقت آپ اپنے کو بالکل غریب سمجھنے لگ جاتے ہیں" کیپٹن نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سارا بھانڈا ہی پھوڑ دیا۔

لالہ بنواری لال نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ سے اپنی چابیاں نکال کر زمین پر پٹک دیں۔

"لیجئے۔ جتنا آپ کا جی چاہے۔ تجوری سے نکال لیجئے۔ کون حرامی ہے جو انکار کرے"

معاملہ طول پکڑتا دیکھ کر سیٹھ کشور لال نے انھیں اپنی بغل میں لے لیا اور ایک طرف کو لے چلے۔

"شاہ جی آپ ہی کے بھروسے پر تو محلے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نہیں دیں گے تو اور کون دے گا۔ خیر چھوڑیئے اس بات کو صبح دیکھا جائے گا"

اتنے میں ان دونوں نوجوانوں نے کیپٹن کو آکر اطلاع دی، کہ "بم ساتھ والے محلے میں پھٹا ہے۔ دراصل وہی مسلمان مجسٹریٹ ایک پولیس کے دستے کے ہمراہ گشت کر رہا تھا۔ کہ ایک نوجوان نے اپنی بالائی منزل سے اس پر بم پھینکا۔ بدقسمتی سے وہ بم اس کے پاؤں تلے سے ڑھک کر قریب کی نالی میں جا پڑا ہے۔ اور پھٹا نہیں۔ ادھر بم پھینکنے کے بعد وہ نوجوان گھبراہٹ کے عالم میں جو بھاگنے لگا ہے۔ تو اس کی ٹھوکر لگ جانے سے امونیا لیکر کی ایک بوتل پھٹ گئی۔ اور اسی دھماکے سے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سگرٹ کا ڈبہ" بھی پھٹ گیا"۔

"وہ خود تو زخمی نہیں ہوا"۔ کیپٹن نے گھبرا کر پوچھا

"ہاں۔ بہت زخمی ہوا ہے"

"اور پولیس ۔۔۔ ؟" لالہ بنواری لال نے فوراً سوال کیا

"پولیس کوچے کے اندر آگئی ہے۔ لیکن کوچہ بندی کھولنے سے پہلے اس مکان کی بالکل صفائی کر دی گئی ہے"۔ اس نوجوان نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا سارا سامان ضائع کر دیا گیا ؟" کیپٹن نے پھر پوچھا

"نہیں۔ ٹب میں ڈال کر فی الحال کنوئیں میں لٹکا دیا گیا ہے"۔

لالہ بنواری لال نے سیٹھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "یہ چھوکرے ہندوؤں کو تباہ کر کے ہی دم لیں گے۔ ایک دن دیکھ لینا۔ سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں گی"۔

سب لوگ الگ الگ ٹولیوں میں اس واقعہ پر تبصرہ کرنے لگے۔

چند نوجوانوں نے ایک علیحدہ جھرمٹ سا بنا لیا تھا۔ اور وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

"مگر اس کی قسمت اچھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ تیسرا حملہ ہے۔ لیکن اب کے بھی بال بال بچ گیا ہے"۔

دوسرے نے قدرے افسردہ ہو کر کہا "کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم اس شخص کا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جس نے چار روز پہلے چیلنج دے کر ہندؤں کی سب سے بڑی مارکیٹ تک جلوا دی"

"سنا ہے کہ اُسے اس علاقے سے تبدیل کر دیا گیا ہے" ایک نے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ تم جانتے نہیں کہ یہ سب گورنر کی شرارت ہے۔ ورنہ اس معمولی سے مجسٹریٹ کی کیا طاقت ہے ——— اِدھر ہندو جل رہے تھے۔ اور اُدھر اس شخص نے کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں آگ بجھانے والوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیا۔ کیا کوئی اور آدمی یہ کر سکتا تھا۔ اُسے فوراً موقوف نہ کر دیا جاتا۔ یہ سب انگریزوں کی چال ہے۔ وہ تمہیں آزادی کے بدلے یہی کچھ دیں گے"

چوتھے نے بات کا رخ پھر اصل موضوع کی طرف بدلتے ہوئے کہا کہ "کچھ بھی ہو۔ یہ میں تمہیں بتا دوں۔ کہ وہ بچے گا نہیں۔ اس وقت بھی کچھ نوجوان ایسے ہیں۔ جو اس کے پیچھے برابر لگے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال

ہے کہ جب یہ عدالت کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہو۔ اس وقت اُسے شوٹ کیا جائے "

" جی ہاں ۔ میں تم لوگوں کی ہمت جانتا ہوں " دوسرے نے طعنہ دیا " تو میری بات بھی یاد رکھو۔ کہ وہ تمھارے سامنے پاکستان میں چیف جسٹس بنے گا ۔ وہ لوگ کام کرنے والوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ وہاں ایک ہندو کو چھرا مارنے والے کو پچاس روپے ملتے ہیں۔ اور آگ لگانے والے کو دو سو۔ تمھارے ہاں کیا ہے۔ خود تمھارے محلے میں کئی نوجوان ایسے ہیں۔ جو روزانہ کماتے تھے اور روزانہ کھاتے تھے، آج ایک مہینے سے جو وہ کوئی کام نہیں کر رہے۔ اور محلے کی پہرے داریاں کر رہے ہیں ۔ ان کا دھیان کسے ہے۔ الٹا تمھارے ہاں کے ساہوکار یہ کہتے ہیں کہ سب سے چندہ برابر لیا جائے۔ وہ لوگ شہر چھوڑ کر کیوں نہ چلے جائیں۔ ان کا یہاں کیا رکھا ہے۔ نہ مکان نہ جائیداد جہاں جا کر کام کریں گے کما کھائیں گے۔ اور پھر یہ سیٹھ لوگ جو چلے جانے والوں کی باتیں سن کر انھیں طعنے دیتے ہیں۔ خود اسی انتظار میں بیٹھے ہیں۔ کہ کب وہ اپنی جائداد حفاظت سے نکال سکیں۔ اور خود چلے جائیں ۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کشورلال قوم کی خاطر یہاں بیٹھا ہوا ہے ۔ تو یہ تمھاری بھول ہے۔ وہ تو اس روز میٹنگ میں آنند سے کہہ دیا تھا کہ اگر محلے کے کسی بڑے آدمی کے گھر سے ایک نفر بھی چلا گیا۔ تو ہم سب چلے جائیں گے ۔ وگرنہ کب کے انھوں نے اپنے بال بچے شملے بھیج دیئے

ہونے - سنا ہے وہاں ایک کوٹھی بھی خرید لی ہے انھوں نے "

"یہی تو ہندؤں میں کمزوری ہے - روپے کے لالچ نے سب کو خود غرض بنا دیا ہے "

"وہ ہمارا بھی تو ایک جج ہے نا ہائیکورٹ میں - خود اس کے خاندان کے اسی افراد کو مسلمانوں نے قتل کر دیا - لیکن اس نے آج تک ایک کو بھی پھانسی پر نہیں لٹکایا "

" اگر ہندؤں میں یہ دیا دھرم والی کمزوری نہ ہوتی تو ان کا راج ہی کیوں چھنتا "

" دیا دھرم نہیں - بلکہ ہندو ڈرتا ہے - اُسے روپے کا لالچ ہے اُسے ملازمت کا لالچ ہے "

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ان میں شامل ہوگیا تھا - اُس نے کہا -

" یہ کمزوری صرف ہندو میں نہیں ، مسلمان میں بھی ہے - کھاتا پیتا مسلمان بھی نہیں لڑتا - یہ تو ان کا غنڈہ اور جاہل عنصر ہے - جو فساد کر رہا ہے - اور چونکہ ان میں ایسے آدمیوں کی تعداد زیادہ ہے ... "

اچانک ان سب کی توجہ اس لڑکے نے اپنی جانب کھینچ لی - جو بھاگتا ہوا یہ خبر دینے آیا تھا - کہ پولیس ساتھ والے محلے کی تلاشی لے کر ادھر آ رہی ہے

پلک جھپکتے ہی ساری گلی خالی ہوگئی - سب لوگ آس پاس کے مکانوں میں چلے گئے تھے - ہر چہار طرف بالکل خاموشی طاری ہوگئی

تھی۔ اور تمام لمپ بجھا کر بالکل اندھیرا کر دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد گلی کے باہر سے گزرتے ہوئے دستے کے قدموں کی آواز آئی۔ وہ لوگ سیدھے نکل گئے۔ اور تھوڑی دیر میں ان کے قدموں کی آواز پھر خاموشی میں سما گئی۔

ایک ایک کر کے دروازے کھلنے شروع ہوئے۔ پھر اپنی پیشانیوں پر سوالیہ نشان لئے چند چہرے نمودار ہوئے۔ اور آہستہ آہستہ اِکا دکا کر کے سب لوگ باہر نکل آئے۔

⁂ ⁂ ⁂

بہت دیر ہو چکی تھی۔ چنانچہ حاضری لگا کر مختلف لوگوں کی ڈیوٹیاں مقرر کرنے کا فیصلہ ہوا۔

حاضری کے وقت پتہ چلا۔ کہ ساٹھ آدمیوں میں سے پچیس غائب تھے۔ اس پر پھر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ان کے لئے مختلف سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ تارا چند کہنے لگا کہ "آج چار مہینوں سے قسم کھانے کو ہم نے ایک روز بھی اپنے گھر میں سو کر نہیں دیکھا۔ اور بنواری لال جیسے لوگ ہیں۔ کہ ذرا موقعہ ملا۔ اور جا گھسے بیوی کی گود میں"۔

"آخر بیوی کے پاس بھی تو جانا ہوتا" ایک اور نے مذاق کیا۔

"لیکن ہماری کیا بیویاں نہیں ہیں؟" کسی نے کہا

"کوئی آنند سے بھی پوچھے۔ جو آج چار مہینوں سے ایک رات کو بھی نہیں سویا"۔ پرکاش نے ایک پرمعنی نگاہ اُس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس کے احسان کا بدلہ کون چکا سکتا ہے۔ صرف وہ ایک شخص ہے۔ جو اکیلا رات بھر جاگ کر ہر مورچے پر پہرہ دے رہا ہے" آنند کے ایک ہمدرد نے کہا۔ اور سب نے خاموشی سے اس کی تائید کی۔ لیکن پرکاش نے دبی آواز میں صرف اپنے ساتھیوں کو سنانے کے لئے کہا۔

"اور وہ بھی فسادیوں کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ جن کی مہربانی سے وہ رات رات بھر ان کے کوٹھے پر رہتا ہے۔ جن کے ہاں کبھی دن میں بھی وہ داخل نہ ہو سکتا۔"

نردیم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ "اس فساد نے کیوں کو اپنوں سے بچھڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور کئی ایک کو میل ملاقات کے وہ مواقع بخشے ہیں۔ جو انہیں شائد زندگی بھر نصیب نہ ہوتے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ہمارے کیپٹن نے بھی پہرے کے لئے خاص طور پر لاجو کا گھر منتخب کیا ہے۔ اور وہاں ڈیوٹی دینے والوں میں سے جب کوئی نہ آئے۔ تو فوراً اپنے آپ کو پیش کر دیتا ہے۔ بلکہ اوسطاً ہفتے میں چار ڈیوٹیاں وہی دیتا ہے"

موتی نے جواب دیا "آخر کچھ خدمت تو کرتے ہیں وہ قوم کی تمہاری طرح اس بہانے وہ جوا تو نہیں کھیلتے"

ان کی سرگوشیوں کے باوجود آنند ان کی ساری باتیں سن رہا تھا۔ اتنے میں کیپٹن نے اس کا نام پکارا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی ڈیوٹی آج محلے کے کونے والے مکان پر لگائی گئی تھی۔ تاکہ بازار کے اس

پار مسلمانوں کے محلے کی تمام حرکات وسکنات پر نظر رکھ سکے۔

آنند کو اس بات سے ایک طرح کی خوشی ہوئی کہ اس کی ڈیوٹی سیٹھ کے مکان کی بجائے اس کے سامنے والے مکان پر لگائی گئی ہے۔ جہاں وہ ان نوجوانوں کی نگاہوں سے بھی بچ سکے گا۔ اور ساتھ ہی سامنے کے کوٹھے پر سوئی ہوئی اوشا کو بھی دیکھتا رہ سکے گا ...

* * *

ڈیوٹیاں مقرر کرنے کے بعد بہت سے لوگ ان آدمیوں کو گھروں سے نکالنے کے لئے باہر نکلے۔ جو موقعہ ملتے ہی بھاگ گئے تھے۔ باہر گلی میں آتے ہی انھوں نے دیکھا۔ کہ تمام گلی کسی زوردار روشنی کے عکس سے منور ہو رہی ہے۔ کہیں قریب ہی آگ لگی ہوئی تھی جس کے شعلوں کی روشنی وہاں پہنچ رہی تھی۔ لیکن ایسے واقعات اب ان میں کوئی سنسنی پیدا نہیں کرتے تھے۔ اب یہ ان کے لئے ایک طرح کا معمول ہو چکا تھا۔

ایک صاحب کو آوازیں دی گئیں۔ تو ان کی بیوی نے اوپر سے جواب دیا کہ

"وہ اوپر نہیں ہیں"

اس پر ایک منچلا بغل والے مکان کی چھت سے ان کے مکان میں گھس گیا۔ اور انھیں رضائی میں لپٹے لپٹائے اٹھالیا۔

"لو صاحب۔ آپ اوپر نہیں۔ بلکہ بیوی کی چارپائی کے نیچے تھے۔"

ایک قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن لالہ بنواری لال جسے خود ابھی ابھی بیسیوں آوازیں دینے کے بعد کوٹھے سے اتارا گیا تھا۔ نہایت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"آخر یہ کیا مذاق ہے۔ ایسے آدمیوں کو سولی پر چڑھا دینا چاہیے جو وقت پر اپنی قوم کے کام نہ آ سکے۔ وہ اگر پیاسا بھی مر رہا ہو۔ تو قوم اس پر رحم کیوں کرے"۔

دُوسرا باب

... ... رات کی تاریکیوں میں اپنی نگاہیں گاڑے اپنی ڈیوٹی پر بیٹھا ہوا آنند بار بار سوچ رہا تھا کہ "بعض مرتبہ قومیں بھی انسان پر کس قدر تلخ فرض عائد کر دیتی ہیں۔ اور اُسے وہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جو اُسے نہ کرنا چاہئے ... "

سامنے حدِ نگاہ تک لاہور ایک لاش کی طرح خاموش پڑا ہوا تھا۔ دوج کا چاند ایک بیمار عورت کی طرح لاغر و نحیف تھا۔ اور اس کی

تاریک روشنی میں ستاروں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

ابھی ابھی کہیں دور سے ایک زور کے دھماکے کی آواز آئی تھی اور پھر "اللہ اکبر" اور "ہر ہر مہادیو" کے نعرے آسمان کی تاریکیوں کو چھوکر لوٹ چکے تھے۔ اور پھر سے شہر پر خاموشی طاری ہو چکی تھی ——— ایک مکمل سکوت۔ جس نے خوف اور دہشت کے پردے تلے زندگی کی ہر آواز کو دبا رکھا تھا۔

تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کچھ مکانوں کے اوپر سبز بتیاں جل رہی تھیں۔ جنھیں مختلف علاقوں کے درمیان سگنل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کسی علاقے میں خطرہ پیدا ہوتے ہی سبز بتی سرخ ہو جاتی۔ اور پھر یہ اشارہ شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتا۔ ایک بیمار کی نبض کی طرح گلی کوچوں میں تیزی سے ایک حرکت پیدا ہوتی۔ لاٹھیاں اور برچھے باہر نکل آتے۔ نوجوان پوشیدہ مقامات میں سے سامان نکال کر تیار ہو جاتے۔ سروں پر فولادی ہیلمٹ چڑھ جاتے بچے چونک کر ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹ جاتے۔ اور عورتیں اپنے پہلو خالی پاکر اندھیرے میں آنکھیں گاڑے کچھ سوچنے لگ جاتیں کہیں کہیں چند نعرے بھی بلند ہوتے ——— "اللہ اکبر" ——— "ہر ہر مہادیو"

ان دنوں اللہ اور مہادیو کے نام سن کر لوگ اس طرح کانپ اٹھتے تھے۔ گویا وہ خدا نہیں کوئی جن بھوت تھے ...... پھر نعرے بند ہو جاتے۔ اور فضا میں ایک ارتعاش سا باقی رہ جاتا۔

۔۔۔ ۔۔۔ حتیٰ کہ پھر سے آہستہ آہستہ بیمار کی نبض بیٹھنے لگتی۔ اور آخرکار اس پر پھر ایک مردنی چھا جاتی۔ اس بھیانک خاموشی کے عالم میں اسے وہ سنسنان بتیاں لاہور کی آنکھیں محسوس ہونے لگیں۔ جو بوچڑخانہ میں بندھی ہوئی بھیڑوں کی طرح سہمی سہمی سی نگاہوں سے قصاب کا راستہ تاک رہی ہوں۔ اور جب کبھی کہیں کوئی سرخ بتی چمک اٹھتی تو یوں محسوس ہوتا۔ جیسے قصائی کی چھری دیکھتے ہی کسی آنکھ سے خون کا ایک آنسو ٹپک پڑا ہو۔

وہ اس خاموشی کے سینے میں چھپی ہوئی چیخوں اور آہوں کو ٹٹولنے کی کوشش میں اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھا رہا۔ بازار کے اس پار مسلمانوں کے محلے کے سرے پر بنی ہوئی مسجد میں کوئی روشنی دکھائی نہ دے رہی تھی، اور اس کے سائے میں بسا ہوا مسلمانوں کا محلہ بھی سہما ہوا دکھائی دیتا تھا اس سے پرے حدِ نگاہ تک تمام مکان اور بڑی بڑی عمارتیں دبکی ہوئی پڑی تھیں۔ اس نے ذرا داہنی طرف گھوم کر دیکھا۔ شمال مغربی کونے پر جہاں شہر کی سطح کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ کلکتے والوں کے مندر کا اونچا کلس اور اس کی بغل میں بادشاہی مسجد کے مینار شرم سے سر جھکائے کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے آگے وہ ایک انچ بھی نہ گھوم سکا۔ وہ اس طرف دیکھنے سے بھی ڈرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈبی بازار کے ایک علاقے میں جو آگ آج پانچ روز سے لگی ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک وہاں بھڑک رہی ہو گی۔ اور اس مظہرِ تمدن شہر کے سینے میں لگی ہوئی اس آگ کو جسے بجھانے والا

کوئی نہ تھا۔ دیکھنے کا یارا اس میں نہ تھا۔

وہاں ہندوؤں کا ایک ہی محلہ تھا۔ اور وہ اپنے مسلم ہمسایوں سے منہ موڑ کر اپنی قوم کے لوگوں کے ہاں پناہ لینے کے لئے تمام مکان خالی کر آئے تھے۔ حتیٰ کہ وہاں آج آگ بجھانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اُسے پھر اپنی قوم کا خیال آیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ آخر اس کی قوم کون سی تھی۔ کیا اس محلہ میں بسنے والے یہ دکاندار ساہوکار اس کی قوم میں سے تھے۔ جن میں سے ایک بھی شاعر نہ تھا۔ ایک بھی شعر فہم اور صاحب دل نہ تھا۔ جن کی بھیڑ میں گھرا ہونے کے باوجود وہ اکیلا تھا۔ کیا یہ اس کی قوم تھی۔ جس کے افراد آگ بجھانے کی کوشش میں شہید ہو جانے والے اجیت کو ڈرپوک اور کائر سمجھتے تھے۔ اور خود انسان کے خون کی پیاسی برچھیاں اٹھائے پھر رہے تھے۔ کیا یہ لوگ اس کی قوم تھے۔ جو اس وقت تک تو جوانوں سے دودھ پلانے کا وعدہ کرتے تھے۔ جب تک ان کی جائداد کو خطرہ نظر آتا تھا۔ جو ہندو پولیس کی پکٹ بٹھانے کے لئے ہزاروں خرچ کر سکتے تھے۔ لیکن جن کی آنکھوں کے سامنے شہید اجیت کی بیوی ایک ملازمہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی، کیا یہی تھے اس کی قوم کے لوگ جو ان ہی کی خاطر مر جانے والے کی بیوی کے حسن اور جوانی کی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اگر یہی اس کی قوم ہے۔ تو ان میں اور اس مسلمان میں کیا فرق ہے۔ جس نے اس شخص کو گولی مار دی۔ جو مسلمانوں ہی کے مکان کو لگی ہوئی آگ بجھا رہا تھا ——— "نہیں یہ میری قوم نہیں ہو سکتی "۔ وہ قریب قریب

بڑبڑانے لگ گیا تھا ۔ جو لوگ شاعر اور ادشا کو ایک دوسرے کے لئے خاموشی سے تڑپنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتے۔ جن کے نوجوان صرف اس صورت میں شاعر کو خراج تحسین ادا کرتے۔ جب وہ ادشا کو خراب کرنے میں کامیاب ہو کر اس ڈینگیں مارتا پھرتا۔ لیکن اس طرح ایک دائمی روگ لگا کر ان کی آنکھوں میں نہ کھٹکتا۔ وہ لوگ اس کے ہم قوم نہیں ہو سکتے اور پھر اُسے جالندھر اسٹیشن کا وہ واقعہ یاد آ گیا۔ جہاں راولپنڈی کے علاقے سے آنے والے سکھ پناہ گزینوں کے لئے کسی دانی نے لنگر کھول رکھا تھا۔ والنٹیر اپنی قوم کے درد سے بے حد متاثر ہو کر بڑے جوش و خروش سے پناہ گزینوں کی سیوا کر رہے تھے۔ اس بھیڑ اور گہما گہمی میں ایک شخص جس کی داڑھی مسلمانی شرع کے عین مطابق ترشی ہوئی تھی۔ بار بار اپنا پیالہ لے کر سامنے آتا تھا۔ اور ہر بار کوئی نہ کوئی والنٹیر دھول دھپے سے اس کی خدمت کر کے اسے مجمع سے باہر نکال دیتا۔ چنانچہ وہ ایک طرف کھڑا ہو کر اپنے ہی آنسوؤں سے اپنے پیالے کو بھرنے لگا۔ اس میں اپنی زبان سے کچھ بھی کہنے کا حوصلہ باقی نہ تھا۔ حتیٰ کہ ایک شخص نے والنٹیروں کو بتایا کہ یہ بھی ہمارا ہم قوم ہے۔ مسلمانوں نے زبردستی اس کے کیس اور داڑھی کاٹ دی۔ لیکن یہ بہادر اپنی قوم کی خاطر طرح طرح کے لالچ ٹھکرا کر ان کے ہاں سے بھاگ آیا ہے ...."

ہائے کتنی کھوکھلی بنیاد تھی قومیت کی۔ جہاں کسی کے دلی جذبات کی کوئی قیمت نہیں۔ قیمت ہے تو صرف ظاہری بھیس کی۔

آنند بیرونی مظاہر پر مبنی اس قومیت کے دردناک کھوکھلے پن پر غور کرنے لگا۔ اور اس نے فیصلہ کیا۔ کہ "ہندو یا مسلمان کے ہاں پیدا ہو جانے سے کسی کی قوم کی حد بندی کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کی قوم اس کے ذہنی ساتھیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ خواہ ساری دنیا میں اس کا ساتھی ایک ہی ہو۔"

اتنے میں سامنے سیٹھ کشید لال کے مکان پر کچھ کھٹکا ہوا۔ شاید اوشا چارپائی سے اٹھی تھی۔ اس نے فوراً نگاہیں اس طرف کچھ اس طرح گاڑ دیں۔ کہ وہ اندھیرے کو چیرتی ہوئی اس کوٹھے کے ایک ایک کونے تک پہنچ گئیں۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ شاید اوشا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اور وہ چارپائی پر کروٹیں لے رہی تھی۔ یہ سوچ کر اس نے دبی ہوئی کھانسی کی آواز پیدا کی۔ اور کتنی ہی دیر کسی کی جوابی کھانسی کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ لیکن پھر کوئی آواز پیدا نہ ہوئی ... ...

خاموش وقت نہایت دھیمی رفتار سے گزرتا رہا۔ اور وہ آہستہ آہستہ پھر اپنے پہلے خیالات کی رَو میں بہنے لگا۔ اب کے وہ اپنے ہم قوم ساتھیوں کی فہرست تیار کرنے لگا۔

سب سے پہلا نام اس کے ذہن میں بابو لابھ سنگھ کا آیا ——— جالندھر کانگرس کمیٹی کا وہ صدر جسے اس وقت قتل کیا گیا۔ جب وہ لڑتے ہوئے فسادیوں کے عین درمیان کھڑا ہو کر انہیں اخوت و محبت کا پیغام دے رہا تھا۔ آنند سوچنے لگا کہ "بابو لابھ سنگھ میرا ساتھی تھا۔ اشوک میرا ساتھی تھا

جس نے ہمیشہ کے لئے جنگ و جدل بند کرنے کی کوشش کی۔ اکبر میرا ساتھی تھا۔ جس نے مختلف مذاہب کو ملا کر ایک بین القومی مذہب کی بنیاد رکھنے کی سعی کی۔ میرا ساتھی وہ اقبال تھا۔ جس نے کہا تھا کہ

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں

غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو ہونا

یا وہ ٹیگور جس نے کہا تھا کہ "محبت پر اعتبار کرو۔ خواہ اس کے لئے تمہیں غمگین ہی ہونا پڑے"

وہ میرے ساتھی تھے۔ اور آج ——— آج بھی میرا قریب ترین رشتہ دار سہیل عظیم آبادی ہے۔ جس نے بہار کے فسادات میں ہندوؤں کے ہاتھوں بالکل تباہ و برباد ہو جانے کے بعد لکھا ہے کہ

"لوگوں کو یہ فکر ہے کہ ہندو مر رہا ہے۔ مسلمان مر رہا ہے۔ اور مجھے یہ فکر ہے کہ ہندستان مر رہا ہے۔ انسانیت مر رہی ہے۔ اور وہ شریف جذبات مر رہے ہیں۔ جو ہزاروں سال کے ارتقا کے بعد آدمی نے پیدا کئے تھے۔

مجھے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مرنے کی ذرا فکر نہیں، یہ تو ہزاروں نہیں سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ بلکہ مرنے ہی کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں کو مارنے کے لئے مسلمانوں کو اور

مسلمانوں کو مارنے کے لئے ہندوؤں کو کسی قسم کی
تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ جب بات پر
رونا آتا ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی شخصی زندگی
سے اور بچی ہوئی شئے کی بربادی ہے۔ اور وہ ہے انسانیت
تمدن اور اخلاق ... ... "

میری قوم میں کرشن چندر شامل ہے۔ جس نے بنگال کے
درد سے دکھی ہوکر ایک چیخ بلند کی تھی۔ اور اس چیخ کا نام تھا "ان داتا"
سوچتے سوچتے اُسے اپنے محلے کے ان لوگوں کا بھی خیال آیا
جنھوں نے اُسے اپنی قوم میں شامل کر کے ایک مورچے پر بٹھا دیا تھا
جو لوگ برچھے کلہاڑیاں اور بم لئے اپنی قوم کی خدمت کے نشے میں چور
دکھائی دیتے تھے۔ ان کے درمیان اُسے اپنی تنہائی اور بے چارگی کا
احساس بُری طرح ہونے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ
اندرونِ افریقہ کے کسی حبشی قبیلہ میں گھر گیا ہے۔ اور وہ ایک وحشی ناچ ناچ
رہے ہیں۔ جس کے بعد اُسے قتل کیا جائے گا ——— انسان کو قتل
کیا جائیگا یہ ٹھیک ہے۔ اور پھر اس کا جی چاہنے لگا۔ کہ کسی طرح وہ یہاں سے بھاگ
جائے ۔ یہ فولادی ہیلمٹ جو دشمن کی گولی سے بچنے کے لئے اس کے
سر پر پہنایا گیا ہے اتار کر پھینک دے۔ پاس رکھی ہوئی تیزاب کی بوتلیں
کو توڑ ڈالے اور انسان کو آزاد کر دے۔ لیکن ... ... اس کے
ساتھ ہی اُسے ان معصوم بچوں اور عورتوں کا خیال آیا۔ جن کی

حفاظت کا انحصار اس کی چوکسی پر تھا۔ اُسے ادشا کا خیال آیا۔ اور اس کا دماغ لڑکھڑانے لگا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

اسی حالت میں اُس نے یہ بھی سوچا۔ کہ اگر اسے یہی کچھ کرنا تھا۔ تو پھر وہ گزشتہ جنگ میں بھرتی کیوں نہ ہو گیا تھا۔ جب کہ اُسے بھرتی کے ایجنٹوں نے کئی بار کمیشن دلانے کو کہا تھا۔ اس وقت کیوں وہ انسانیت سے غداری کرنے کے خیال سے کترا گیا تھا۔ اس وقت کیوں اس نے ان لیڈروں کا کہنا مان لیا تھا اور وہ لیڈر جو اس وقت انگریز کی جنگی سنگینوں کے سامنے سینہ تانے دکھائی دیتے تھے۔ آج اپنے بھائیوں کی چھریوں سے کیوں دور بھاگ رہے تھے۔ آج ان میں سے ایک بھی ایسا کیوں نہ نکلا۔ جو آگے آ کر یہ کہتا۔ کہ اپنے کسی پنجابی بھائی کے سینے میں چھرا گھونپنے سے پہلے اپنے خنجروں کو میرے سینے میں اتار دو ....

شاید انھیں اس بات کی فرصت ہی نہیں۔ کیونکہ اس وقت تو انھیں تقسیم پنجاب کے بعد آدھے پنجاب کی وزارتوں پر قبضہ کرنے کے لئے بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ اور اسے بے حد افسوس ہونے لگا کہ اُس وقت اس نے ان لالچی لیڈروں کی باتوں پر کیوں دھیان دیا۔ جو صرف وزارت کی ہڈی کے لئے اپنا خون بہا سکتے ہیں۔ اور جو محض سیاسی اہمیت حاصل کرنے یا اپنے منافع بخش "سودیشی سٹور" چلانے کے لئے مہاتما گاندھی اور ان کی اہنسا کے گُن گاتے پھرتے ہیں۔

آج ان اہنسا وادیوں کے ہوتے ہوئے بھی پنجاب میدانِ جنگ

سے کیا کم تھا۔ اور پھر میدانِ جنگ میں بھی تو اُسے یہی کچھ کرنا تھا۔ جو کچھ کرنے کے لئے وہ آج تیار بیٹھا ہوا ہے۔ بلکہ اس سے بہتر طریقے پر اور بہتر ہتھیاروں کے ساتھ۔ اس صورت میں آج کی طرح اُسے مالی پریشانیوں سے بھی دوچار نہ ہونا پڑتا۔ اور پھر وہاں وہ جی بھر کر گولیاں بھی چلاتا۔ اور اس کے عوض فسادی کے لعنت آفرین لقب کی جگہ اُسے ہیرو مانا جاتا۔ اس کے سینے کو اعزازی تمغوں سے سجایا جاتا۔ جنھیں دیکھ کر وائسرائے کو بھی سلام کرنا پڑتا ...

رات گزرتی رہی۔ اور وہ سامنے کی مسجد میں چھائے ہوئے اندھیرے میں نگاہیں گاڑے روشنی ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا رہا ...

تیسرا باب

صبح ہوتے ہوتے لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر دن کے اولیں کام میں لگ گئے تھے۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی وہ یہ گننے کے لئے اوپر آ جاتے تھے۔ کہ آج شہر میں کتنے مقامات پر آگ لگی ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو شہر کے مختلف کونوں کی طرف اشارے کر کے کوئی نہ کوئی نئی آگ دکھا رہا تھا۔ کوئی کوئی آگ پرانی تھی۔ جو انھوں نے کل بھی دیکھی تھی۔ کوئی ایسی بھی تھی۔ جسے وہ کئی روز سے دیکھ رہے تھے

اور اکثر وہ تھیں جو آج رات ہی میں بھڑکی تھیں۔ علاوہ ازیں کرفیو کھلتے ہی چند ایک مقامات پر ایک باریک سی رسی کی طرح چکر کھاتا ہوا دھواں آسمان کی طرف اٹھنا شروع ہوا۔ دیکھتے دیکھتے دھواں نیلے خاکستری رنگ میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد گہرے بھورے رنگ کا گاڑھا دھواں کسی رومانی دیو کی پھنکاروں کی طرح ہوا میں اُچھلا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں کالے بادلوں کی طرح امنڈتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ہی ساتھ آگ کی لپٹیں بھی آسمان کی طرف اپنے نکیلے ہاتھ اٹھا اٹھا کر جیسے فریاد کرنے لگیں۔

ابھی سورج نکلا ہی تھا۔ کہ لوگ نیچے اتر آئے۔ اور برتن اور ڈول کنڈیاں لے کر بازار کو چلے گئے۔ تاکہ اگر وہاں کوئی سبزی یا دودھ والا آیا ہو، تو لے آئیں۔ ہر ایک دوسرے سے آگے جانے کی کوشش میں تھا۔ تاکہ کم از کم اُسے تو مل جائے۔ چند عورتیں اپنے بھاگتے ہوئے شوہروں کو پیچھے سے آوازیں دے رہی تھیں۔ کہ

"اگر سبزی نہ ملی۔ تو کسی سے کچھ دال وال ہی مانگ لا دینا۔ گھر میں اب پکانے کو کچھ نہیں رہا"۔

کہیں سے کسی بچے کی آواز بھی آئی ــــ "میرے لئے آج تو لیلی پوپو ضرور لانا"

اور جیسے یہ کہتے ہی سے کئی دنوں کے بعد اُسے لیلی پوپو مل گئی ہو وہ تالیاں بجا بجا کر کسی سامنے کھڑے ہوئے بچے کو ترنم سے سنانے لگا تھا

آج میرے پاپا لیلی پو پو لائیں گے
آہا جی لیلی پو پو لائیں گے ......

آنند کہیں نہیں گیا۔ وہ اس انتظار میں چھت ہی پر کھڑا رہا کہ ابھی اوشا جاگے گی۔ اور پھر ایک خاموش سلام اِدھر سے اُدھر جائے گا۔ اور ادھر سے ایک حسین سی مسکراہٹ کو ساتھ لئے لوٹے گا۔

لیکن اس سے قبل کہ اس کی صبح جگمگا اٹھتی نیچے گلی میں سے مار پیٹ اور گالی گلوچ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ فوراً نیچے کو بھاگا۔

گلی میں پہنچا تو دیکھا کہ محلے کے نوجوانوں اور بزرگوں نے اُس کلرک کو گھیر رکھا ہے۔ جو اُس دن چندہ دینے کے لئے مزید مہلت مانگ رہا تھا۔ برتنوں کی ایک بوری گرنے سے پھٹ گئی تھی۔ اور کچھ برتن لڑھک کر نالی میں گر گئے تھے۔ ایک کنستر زمین پر کھلا پڑا تھا۔ جس میں پڑا ہوا دو چار سیر آٹا باہر کو جھانک رہا تھا۔ دو تین بستر لوگوں کے پیروں میں لتاڑے جا رہے تھے۔ کلرک کی قمیص پھٹ گئی تھی۔ اور اس کے دانتوں سے خون نکل آیا تھا۔ اس کی بیوی ایک چھوٹی سی گٹھری بغل میں دبائے ایک طرف سہمی سی کھڑی تھی۔ اور اُسے ایک ادھیڑ عمر کا رنڈوا تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گھورے جا رہا تھا۔

ایک نوجوان جسے دو آدمیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ اپنے بکھرے ہوئے لمبے بالوں کو ٹھیک کرتا ہوا اونچی آواز میں کہہ رہا تھا کہ ہم مر جائیں گے۔ لیکن ایک بھی آدمی کو یہاں سے ڈر کر بھاگنے نہیں دیں گے۔ ہم

ہندوؤں میں یہ بزدلی نہیں پیدا ہونے دیں گے"
کلرک کو سب دیکھ رہے تھے ۔ لیکن اُسے پکڑا کسی نے نہیں تھا۔
اس نے اپنے دانتوں سے خون پونچھتے ہوئے کہا کہ " سیٹھ بنواری لال جو اس روز اپنی تجوری کی چابیاں پھینک رہا تھا ۔ اگرچہ روپے کی ایک پائی تک دیئے بغیر آج تڑکے ہی اپنا سارا سامان لے کر جا سکتا ہے ۔ تو میں بھی ضرور جاؤں گا ۔ آپ مجھے غریب سمجھ کر زبردستی نہیں کر سکتے "
" یہ بات نہیں " سیٹھ کشور لال نے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا : " اگر بنواری لال ہمارے جاگنے سے پہلے چلے گئے ہیں ۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سب بھاگ جائیں ۔ اس طرح تو ہندو تباہ ہو جائیں گے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ جہاں جہاں سے لوگ مکان خالی کر کے آئے ہیں ۔ وہیں محلوں کے محلے جلا دیئے گئے ہیں ۔ اگر ہم بھی اسی طرح کریں گے ۔ تو ہمارا محلہ بھی نہیں بچ سکتا "
" نہیں بچ سکتا تو نہ بچے ۔ میرا اس میں کیا ہے ۔ میرا یہاں کوئی مکان نہیں ۔ اس وقت آمدنی کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ۔ کہیں اور چلا جاؤں گا ۔ کام کروں گا تو کم از کم بھوکوں مرنے سے تو بچ سکوں گا " ۔ کلرک نے جواب دیا ۔
" لیکن آپ کو قوم کا بھی کچھ خیال نہیں " ۔ سیٹھ نے اس نوجوان کی طرف پُر تحسین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ جس نے اس کلرک کو زبردستی روکنے کی کوشش کی تھی ۔

"کیا آپ صرف قوم کے درد سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں" کلرک نے طنزاً کہا: "کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اپنا سامان نہیں نکالا۔"

"ہاں۔ میں نے ایک تنکا تک نہیں نکالا۔" سیٹھ نے نہایت وثوق سے کہا۔

"اور وہ چار ٹرنک جو ... "

سیٹھ نے بات کاٹی: "وہ ——— وہ تو میری لڑکی کے تھے جو میں نے اس کی سسرال بھجوا دیئے۔"

"اس لئے کہ اس کی سسرال جس محلے میں ہے۔ اُسے ہم سے بھی زیادہ خطرہ ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔ لیکن کوئی ہندو اپنی لڑکی کا دھن اپنے گھر میں رکھ کر نہیں جلوا سکتا۔" سیٹھ نے اردگرد کے لوگوں سے جذباتی اپیل کرنے کی کوشش کی۔

"تو کچھ بھی ہو۔ میں بھی یہاں پرائی آگ میں جلنے کو تیار نہیں۔ جب کہ میں جانتا ہوں۔ کہ کوئی بھی یہاں سچے دل سے قوم کی خاطر نہیں بیٹھا ہوا سب اپنی اپنی غرض سے مجبور ہیں۔ اور اگر کوئی سچ مچ ہی یہ سمجھتا ہے کہ وہ قوم کی خاطر کچھ کر رہا ہے۔ تو وہ بیوقوف ہے۔ جوان سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کھیل کر دوسروں کی جائداد بچانے کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔"

چند لوگ اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئے تھے۔ سیٹھ نے اپنا

نرم لہجہ تبدیل کر کے سختی سے کہا کہ

"تم جیسے کائروں پر لعنت ہے۔ جو نہ صرف خود بھاگتے ہیں۔ بلکہ قوم کی خاطر لڑنے والے دوسرے بہادروں کو بھی کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں"۔

"سیٹھ جی آپ کو یہ ڈینگ زیب نہیں دیتی۔ کیا آپ گیتا پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کو تیار ہیں۔ کہ آپ آخری وقت تک محلے کو نہیں چھوڑیں گے"

"ہاں۔ میں ضرور آخر تک محلے کو بچانے کی کوشش کروں گا" سیٹھ نے آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میری مراد محض آپ کی ذات سے نہیں۔ کیونکہ آپ کی چار لاکھ کی عمارت یہاں کھڑی ہے۔ آپ تو آخر تک نوجوانوں کو ورغلائے رکھنے کی کوشش کریں گے ہی۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ آپ نے ابھی دنوں اپنی پچھلی دیوار میں ایک نیا دروازہ کھلوایا ہے۔ جہاں سے دوسری گلی میں بھاگنے کا راستہ بن سکے۔ خیر اسے چھوڑ دیئے۔ میرا مطلب آپ کے بال بچوں اور آپ کے ساز و سامان سے ہے۔ جب کہ پرسوں آپ نے مجھے اپنے بیوی بچوں کو گاؤں چھوڑ آنے سے بھی روکا تھا۔ کیا آپ کے بال بچے بھی آخر تک یہیں رہیں گے؟ کیا آپ قسم کھا سکتے ہیں؟"

اس گرہ بیچویٹ کلرک نے کچھ اس انداز میں پوچھا۔ کہ سیٹھ صاحب کی آواز میں لکنت سی آگئی۔

"جب تک کوئی بہت زیادہ خطرہ نہیں پیدا ہو جاتا۔ وہ بھی یہیں

رہیں گے "

" بلکہ یوں کہئے۔ کہ جب تک ان کے باحفاظت اور مجموعہ سازوسامان چلے جانے کا انتظام نہیں ہوتا۔ وگرنہ اس سے زیادہ خطرہ کب ہو گا۔ جب کہ اس محلے کو دس دفعہ آگ لگانے کی کوشش کی جا چکی ہے۔ اور ... "

وہ کچھ اور بھی کہتا۔ اور کچھ لوگ اس کی باتوں میں دلچسپی بھی لینے لگے تھے۔ کہ سیٹھ نے اس معاملے کو طول نہ دینا مناسب سمجھ کر ہتھیار ڈال دیئے۔

" دیکھو مسٹر۔ ان فضول باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اسی قدر مردہ دل ہو۔ تو دوسروں کو کمزور کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ تم چلے جاؤ۔ لیکن جو مکان تم نے یہاں کرائے پر لے رکھا ہے۔ اُسے بھی چھوڑ جاؤ۔ تاکہ کم از کم ہم وہاں چند پناہ گزینوں ہی کو جگہ دے سکیں "

کلرک نے طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا کہ " مجھے منظور ہے۔ اگر آپ چند نوجوان پناہ گزینوں کو اپنی بستی میں جمع رکھنے کے لئے لاسکیں۔ تو میں آپ کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ آپ کے لئے وہ لڑیں گے بھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ قوم کی ایک اور خدمت کا سہرا بھی آپ کے سر ہو جائے گا۔ بلکہ میری مانئے تو باہر سے آنے والے لیڈروں کو بھی اپنے ہاں ٹھہرانے کی کوشش کیجئے۔ اس سے آپ کا وقار بھی بڑھے گا۔ اور پھر حکومت بھی خود ہی آپ کی بلڈنگوں کو بچانے کی کوشش کرے گی "

یہ کہہ کر اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی جیب سے ایک موٹی سی

چابی نکال کر ان کے سامنے پھینک دی۔ اور خود جھک کر ایک بستر اٹھانے لگا۔

مجمع پر چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری رہی۔ اس کی بیوی نے آگے بڑھ کر بستر اٹھانے میں خاوند کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ تو پہلی مرتبہ وہ ادھیڑ عمر کا رنڈوا پر جوش آواز میں بولنے لگا۔

"نہیں ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔ اگر ایک آدمی کو بھی اس بات کی اجازت دی گئی۔ تو کل کو محلے سے تمام کرایہ دار بھاگ جائیں گے۔ اور اسی طرح ایک محلے کا بُرا اثر دوسرے محلے پر پڑے گا۔ کہاں ہیں ہمارے نوجوان؟ کیا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے"

اسی نوجوان کو پھر جوش آگیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر پھر اس کے بستر پر ہاتھ ڈال دیا۔

"ہم مر جائیں گے لیکن اس طرح کمزوری نہیں پیدا ہونے دیں گے"۔

بہادری کا موقعہ دیکھ کر نرونم بھی آگے بڑھا۔ اور کہنے لگا کہ "آج سے ہم دن کو بھی محلے کے پھاٹک پر نوجوانوں کا پہرہ لگائیں گے۔ کسی کے گھر سے بھی کپڑے کا ایک ٹکڑا تک کوچہ بندی کے باہر نہیں جانے دیں گے"

پھر نوجوانوں میں ایک ہلڑ سا مچ گیا۔ اسی نیم جوان لڑکے نے جوش میں آکر کہا کہ "جو ساہوکار چلے جائیں گے۔ ہم ان کے مکانوں کی حفاظت

نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم خود بنواری لال کے مکان کو آگ لگا دیں گے "
سیٹھ کشور لال نے اُسے شانت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا " نہیں بیٹا۔ یہ غلط ہے۔ اگر کوئی غلطی کرے تو کیا ہمیں بھی ویسی ہی غلطی کرنی چاہیے "

اتنے ہی میں بہت سے آدمی بھاگتے ہوئے بدحواسی کے عالم میں محلے میں داخل ہوئے۔

" فساد ہو گیا —— بازار میں فساد ہو گیا "۔ بس یہی دو فقرے ان کی زبانوں پر تھے۔ جو ٹوکریاں اور برتن لے کر وہ گئے تھے۔ وہ کہیں راستے ہی میں گر گئے تھے۔ محلے میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ اپنے گھروں کی طرف اور کچھ کوچہ بندی کی طرف بھاگے۔ اور اس کے نئے آہنی پھاٹک کو بند کر کے ایک موٹا سا قفل چڑھا دیا گیا۔

نوجوان جھٹ پوشیدہ مقامات پر جا کر لڑائی کا سامان ٹھیک کرنے لگ گئے تھے۔ عورتیں جو اس جھگڑے کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ کھڑکیاں بند کر کے اندر بھاگ گئی تھیں۔ اور مکانوں سے بچوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

اتنے میں آہنی پھاٹک پر کسی نے ٹھک ٹھک کی۔ گویا وہ موت کا فرشتہ تھا۔ جس کے آتے ہی محلے پر ایک مردنی سی چھا گئی۔ لیکن اس خاموشی کی باریک سی جِلد کے نیچے پوشیدہ سرگرمیوں کا خون اس ٹھک ٹھک کے بعد اور بھی تیز ہو گیا تھا۔

فی الحال دروازہ نہ کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مبادا کوئی آدمی دھوکے سے دروازہ کھلوائے اور قریب ہی مسلمانوں کا کوئی گروہ چھپا کھڑا ہو۔ بازار سے بھاگ کر آنے والوں میں سے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا۔ کہ فساد کس طرح ہوا۔ اور کہ مخالف گروہ میں کتنے ایک آدمی ہیں۔ بہرحال چند نوجوان اپنی اپنی چادر میں کچھ چھپائے مختلف مواقع پر آڑ میں کھڑے ہو گئے تھے۔

"نردتم ———— !دروازہ کھولو ———— !! شاہ جی ———— !!!"

باہر سے آوازیں آئیں۔ نردتم نے آواز پہچان کر کہا "یہ تو کیپٹن ہے کہیں پھنس گیا ہوگا۔ کوئی جلدی سے جاؤ۔ کہیں اتنی دیر میں کوئی اس پر حملہ نہ کر دے۔"

دو نوجوان بھاگے ہوئے گئے۔ ان کے پیچھے دو اور مسلح ہو کر گئے، تاکہ دروازہ کھولتے کھولتے کوئی حملہ نہ کر دے۔

کیپٹن کے اندر آتے ہی تمام نوجوان باہر کا حال جاننے کے لئے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ انھیں دیکھ کر اُسے بے حد ہنسی آئی۔ آخر اس نے بتایا۔ کہ بازار کے پرلے کونے پر دو سانڈ لڑ پڑے تھے۔ ایک سانڈ زخمی ہو کر جو بھاگا ہے۔ تو کئی لوگ اس سے بچنے کے لئے بے تحاشا بھاگ کھڑے ہوئے۔ انھیں دیکھ کر ان سے آگے والے اور پھر اسی طرح بازار کے دوسرے سرے تک سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر بھاگنے شروع ہو گئے۔ لیکن کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی۔ کہ آخر لوگ بھاگ کیوں رہے ہیں۔"

نوجوان اپنی خفت مٹانے کے لئے ایک تھڑے پر بیٹھ کر قہقہے لگانے لگے۔

* * *

آہستہ آہستہ پھر لوگ گلی میں آ گئے۔ اور دن کی پہلی مجلس شروع ہوئی۔ تھڑے پر دو ایک اخبار پڑے تھے۔ جن کا ایک ایک ورق پھٹ کر مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا۔ اور باقی لوگ نئی پرانی خبروں پر تبصرہ کر رہے تھے۔

ہوتے ہوتے بات بہار کے دیہات پر بمباری تک پہنچی۔ نریندر کہنے لگا کہ۔

"جواہر لال نے بہار میں ہندوؤں پر تو بم چلا لئے تھے۔ لیکن اب کہاں سو گیا ہے"

"ارے میاں۔ یہ سب اپنے بھائیوں کو مارنے میں شیر ہیں۔ مسلمانوں کے سامنے سب بھیگی بلی بن جاتے ہیں"

ایک اور صاحب کہنے لگے "اور گاندھی کو دیکھا ہے جھٹ بہاریوں پر مرن برت کا رعب جما دیا۔ کوئی اس سے پوچھے کہ جو تمھیں ہاتھ دے گا۔ کیا اس کا بازو بھی کاٹ لوگے۔ ہندو بیچارے ادھر مسلمانوں کے ہاتھوں بھی مارے جائیں۔ اور ادھر اپنوں کی گولیاں بھی وہی کھائیں"

قریب سے ایک تیسرا بولا "اس کی بات چھوڑو۔ وہ تو بہت بڑا موقع شناس ہے۔ اب اس نے جوں ہی دیکھا کہ اس کی لیڈری

پسِ پشت پڑ رہی ہے۔ تو اس نے ایک نیا اسٹنٹ رچا دیا ہے۔ تاکہ اس کی مرتی ہوئی لیڈری کو نیا خون مل سکے"

"لیکن اگر وہ اسٹنٹ ہی کرتا پھرتا ہے۔ تو دنیا کی بڑی سے بڑی ہستیاں اس کی مداح نہ ہو جاتیں۔ آخر کوئی بات تو ہے اس میں" ایک باہر کے نئے آدمی نے کہا۔ جو کل رات سے نردتم کے گھر آیا ہوا تھا۔

"جی ہاں۔ بات اس میں یہی ہے کہ اس نے ہندوؤں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ آزادی تو جب ملے گی۔ تب دیکھیں گے۔ فی الحال تو اس نے اپنی اہنسا سے ہندوؤں کو نامرد بنا دیا ہے" ایک نوجوان چمکا۔

تارا چند قریب سے کہنے لگا کہ "کانگرس کو ووٹ دے کر ہم نے اپنے حق میں بہت بُرا کیا۔ اس کا افسوس ہمیں آج ہوتا ہے۔ چنانچہ آج لیگ جیسی ہندوؤں کی ایک بھی جماعت طاقت میں نہیں۔ جو خالص ہندو نقطۂ نگاہ سے کام کرے۔ ایک مہاسبھا تھی۔ سو اُسے بھی کانگرس کی بڑی بڑی باتوں میں آ کر ہم نے اپنے ہاتھوں ڈبو دیا۔ اور کانگرس ہے کہ مسلمانوں کے سامنے بچھی جا رہی ہے"

وہ شخص ان کی باتیں سن کر ہنس دیا "آپ شاید یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ گاندھی اور کانگرس ہی وہ جماعت ہے۔ جس نے دنیا میں پہلی مرتبہ اس قدر کم خونریزی سے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے قدم اکھاڑ دیئے ہیں۔ اور جواہرلال نے جو بمباری کا حکم دیا تھا۔ وہ سخت ضرور تھا لیکن ناواجب نہیں۔ اچھا آپ ہی بتائیے۔ کہ اگر آپ کا بڑا لڑکا منجھلے بھائی کا

ایک بازو کاٹ دے۔ تو کیا آپ اس منجھلے لڑکے کو یہ حق بخش دیں گے کہ وہ سب سے چھوٹے بھائی کی ٹانگ کاٹ دے۔ بس یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے کانگرس کو بلا امتیاز مذہب و ملت جمہور کی جماعت بنا رکھا ہے اپنے بچوں کو اس طرح کی حماقت سے روکنے کی پوری کوشش کرتے ہیں ۔"

"تو گویا یہ بمباری ہی کانگرس اور گاندھی جی کی اہنسا کا نمونہ تھی"، پریتم سنگھ نے موقعہ دیکھ کر چوٹ کی۔

"گاندھی جی کی اہنسا کو آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے"، اس شخص نے وضاحت کے طور پر کہا۔ "ان کی اہنسا بہادر کی اہنسا ہے۔ کائر کی نہیں"۔

"اگر آپ اتنے بڑے گاندھی بھگت ہیں۔ تو ذرا اس فساد ہی میں اپنا تجربہ کر کے دکھایئے۔ جس طرح اس وقت مسلمان ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ آپ ہاتھ جوڑ کر اپنی جان بچانے کا کوئی طریقہ سمجھایئے" خودساختہ لیڈر نے اس کا پول کھولنے کی غرض سے سوال کیا۔

اُس آدمی نے نہایت اطمینان سے جواب دینا شروع کیا "سب سے پہلے میں آپ کی ایک غلط فہمی دور کر دوں۔ کہ آپ شاید موت سے بچنا ہی زندگی کا مقصد اولے سمجھتے ہیں۔ درحالیکہ آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ موت سے آپ کسی صورت بھی نہیں بچ سکتے۔ اپنے مقررہ وقت پر جسے ضرور آنا ہے۔ اس کے ڈر سے بھاگنے کی کوشش میں آپ کئی بار مر جاتے ہیں۔ اور پھر بھی اس سے مفر نہیں پاتے، چنانچہ اگر آپ موت سے بچنے کے

لئے کسی کو مارتے ہیں۔ تو ایک بے فائدہ گناہ اپنے سر منڈھ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں تشدد کر کے بھی یہ یقینی نہیں ہوتا۔ کہ دشمن آپ سے زیادہ طاقت ور ثابت نہ ہوگا۔ چنانچہ دریں حالات اگر آپ میں دلیری ہو۔ اگر آپ موت کا خیال دل سے نکال سکیں۔ تو آیئے۔ ان تفرقہ انگیز گوچہ بندیوں کے تالے کھول دیجئے۔ جنھوں نے انسان کو انسان سے جدا کر رکھا ہے۔ اور اپنے بیوی بچوں سمیت باہر نکل آیئے۔ اور جنھیں اپنے دشمن سمجھ رہے ہو۔ انھیں نہ صرف اپنے نادان بھائی سمجھ کر بلکہ اپنے دل میں ان کے لئے محبت اور رحم کے جذبات لے کر انھیں سمجھاؤ۔ کہ تم نادانی کر رہے ہو، اگر اس کا فوری اثر کچھ نہ ہوگا۔ تو بھی آپ لوگوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ یاد رکھئے۔ کہ تشدد کی تشدد سے ہر ٹکر ایک نئے تشدد کا بیج بوتی ہے، لیکن ایک بھی معصوم اور سچے اہنسا وادی کا خون سیکنڈھ دھام میں بھی زلزلہ لے آتا ہے۔ اور پائے عرش بھی ہل جاتا ہے۔ صرف آپ کا محلہ اگر اتنی عظیم قربانی دے سکے۔ تو سارے ہندستان میں ایک بھونچال آجائے اور پھر ایک وقت وہ آئے گا کہ جنھیں تم ملیچھ کہتے ہو۔ خود ان کا نیک طبقہ تمھاری جگہ اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کرے گا۔ اس وقت نہ صرف تمھاری فتح ہوگی۔ بلکہ تمھارا دشمن بھی فتح پائے گا اپنی بدی پر۔ انسانیت بہیمیت پر فتح پائے گی۔ اس لڑائی میں کسی کی شکست نہیں ہوتی۔ آپ مر ضرور جائیں گے۔ لیکن بستر پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے کی جگہ وہ جام شہادت پی کر جس کے مواقع ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتے۔ جس کے لئے دیوتا بھی

انسان بننے کی خواہش کرتے رہتے ہیں۔ بظاہر مر کر بھی آپ وہ ابدی زندگی پاجائیں گے جسے کبھی موت نہیں آتی۔ اور یہی موت پر فتح پانے کا ناحد گر ہے ..."

اس کا انداز خطیبانہ ہو گیا تھا۔ اور سب خاموشی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ آنند کو مایوسی کے گہرے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کچھ اس طرح چمکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے اماوس کی رات ایک گھنے چنار کے پتوں میں سے کوئی حسین ستارہ جھانکنے لگے۔ اور جو اپنی روشنی سے ایک واضح راستے کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔

"یہ سب کتابی باتیں ہیں اور غیر عملی"۔ پریتم سنگھ نے آخری سہارا لیا "اور اگر ان میں کوئی عملی طاقت ہوتی۔ تو مہاتما گاندھی کے سب سے بڑے لیفٹیننٹ آج ان سے اس طرح منہ نہ پھیر لیتے۔ ٹنڈن بابو کا تازہ بیان پڑھا ہے۔ وہ اس بڑھاپے میں بھی اپنا کریڈ تبدیلی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور اب رائفل کلبیں بنانے پر زور دے رہے ہیں۔ اور اسی طرح دوسرے لوگوں کو دیکھ لو۔ جواہر لال بمباری کراتے پھرتے ہیں۔ اور پٹیل نے بھی پرائیویٹ ملاقاتوں میں ہندوؤں کو ہتھیار اکٹھے کرنے کی صلاح دی ہے"۔

ان انکشافات کے بعد اس نے داد طلب نگاہوں سے اپنے ارد گرد دیکھا اس آدمی کا سر جھک گیا "یہی تو ٹریجیڈی ہے۔ کہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا ——— گاندھی جیسے مہان آتما اکیلے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اکیلے ہی مر جاتے ہیں۔ کبھی کوئی ان کا ساتھی

نہیں ہوتا۔ ذرا سوچو۔ کہ اتنے کروڑ عیسائیوں میں کیا ایک بھی عیسیٰ کا حقیقی ہم مذہب ہے؟ یہی حالت ہر جگہ ہے۔ پالیسی کے طور پر یہ سب لوگ گاندھی کے ساتھ رہے۔ اور آج جب کہ آزادی حاصل ہو رہی ہے۔ تو وہ پھر اکیلا رہ گیا ہے ـــــــ کسی وسیع ریگستان میں خشک ہوتی ہوئی امرت کی ایک بوند کی طرح ـــــــ"

سب خاموش تھے۔ پریتم سنگھ بھی کچھ سوچنے لگ گیا تھا۔

اس خاموشی کے عالم میں وہ شخص اٹھا۔ نردنم سے اجازت طلب کی۔ اور چپکے سے چلا گیا۔ آنند ایک عجیب کیف کے عالم میں ڈوبا ہوا سوچ رہا تھا۔ کہ وہ کون تھا۔ جو اس کیچڑ میں کنول کی طرح نمودار ہوا تھا ابھی تک اس کے فقرے آنند کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ یوں جیسے ایک گھنے جنگل میں بھٹکے ہوئے مسافر کو ایک چوٹی سے کسی گڈریئے کی بنسی کا ایک روحانی نغمہ سنائی دے جائے۔

"گاندھی نے بھی بڑے بڑے آدمیوں کو جال میں پھنسا رکھا ہے یہ بیچارہ کس باغ کی مولی ہے"۔ پریتم سنگھ کو منٹ بعد از جنگ کی طرح پھر سے جوش آ گیا تھا۔ اپنے بیان کے ثبوت میں وہ کہتا گیا۔ "اور لطف یہ کہ اُسے خود علم نہیں ہوتا۔ کہ وہ اپنے بیان پر کب تک قائم رہے گا۔ حال ہی میں اُس نے اپنے ایک بہت بڑے اصولی فیصلے کو اس بہانے ترک کر دیا کہ پرجا کی رائے اس کے خلاف ہے۔ اسی طرح اس کے اکثر بیان غور سے پڑھو۔ تو نوے فیصدی اپنی ہی تردید موجود ہوتی ہے۔ اور

پھر جنی بحث کرے گا۔ بالکل بچوں کی سی۔ سائنس کی تازہ ترین تھیوریوں کا تو اُسے علم ہی نہیں۔ اُسے یہ نہیں پتہ کہ یہ فساد۔ یہ عالمگیر لڑائیاں اور قحط سب قانونِ قدرت کے مطابق ہوتے ہیں۔ جب آبادی قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔ تو قدرت اُسے اس حد تک گھٹانے کے لئے کوئی نہ کوئی وسیلہ اختیار کرتی ہے۔ جس حد تک اس کے انتظام میں انتشار نہ پیدا ہو۔"

سامعین کو قدرے ہمدرد پاکر وہ اور بھی تیز ہو گیا۔ "آنجناب نے گیتا کے ترجمہ میں بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کرشن نے درحقیقت اہنسا کا اپدیش دیا تھا۔ اور جہاں کوئی ایسا منتر آگیا ہے۔ جس میں ارجن کو واضح الفاظ میں کشتری کا فرض ادا کرتے ہوئے جنگ کی تلقین کی گئی ہے۔ وہاں آپ کہتے ہیں کہ یہ منتر اس کرشن کے نہیں ہیں۔ جس نے درحقیقت گیتا کہی تھی ... "

اس کا بیان جاری تھا۔ اور اسی دوران میں مختلف نوجوان کسی خفیہ اشارے کے ماتحت ایک ایک کر کے وہاں سے اٹھ رہے تھے۔ اور آہستہ آہستہ سات آٹھ نوجوانوں کا ایک گروہ گلی کے ایک کونے میں کسی اہم اور خفیہ گفتگو میں مشغول ہو گیا تھا۔

آنند جب وہاں پہنچا۔ تو وہ کوئی فیصلہ کر چکے تھے۔ کل رات ایک شخص ان کے پاس آیا تھا۔ جو اپنے آپ کو مہا سبھا کا لیڈر بیان کرتا تھا اس نے انھیں بتایا تھا کہ "ہم نے بہار میں نوا کھلی اور کلکتے کا پورا پورا بدلہ لے

لیا ہے۔ وہاں ہم نے ملیچھوں کی لاشوں سے کنوئیں بھر دیئے ہیں۔ اور ان پر تھوڑی تھوڑی مٹی ڈال کر زمین کے برابر کر دیا ہے۔ اور آپ لوگ ہیں کہ اس روز ہماری ایک پارٹی نے مسلمانوں کے گڑھ کو آگ لگانے کے لئے صرف آپ کے محلے سے راستہ مانگا۔ تو آپ نے انکار کر دیا۔"

نوجوانوں کے یہ بتانے پر کہ اس وقت ان کے بڑے بوڑھے کسی صورت نہیں مانتے تھے۔ اس نے انھیں جوش دلایا تھا کہ "اس وقت سارا ہندوستان تم نوجوانوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اب تمھارا فرض ہے کہ تم یہاں اپنے بھگوے کو نیچا نہ ہونے دو۔ دشمنوں کی طرف دیکھو۔ ان میں سے آج ہر ایک مسلمان ہے۔ خواہ وہ ہائیکورٹ کا جج ہے یا تمھارا دوست، لیکن وہ مسلمان پہلے ہے اور کچھ بعد میں۔ مگر افسوس کہ تم لوگ ابھی تک کاسموپالیٹن ازم کے چکر میں پڑے ہوئے ہو۔ کیا تم میں سے ایک بھی ہندو نہیں ہے؟" ۔ اور جوش میں آ کر ان سب نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنی قوم کا سر نیچا نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ اب انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوؤں کے محلوں میں جہاں جہاں کسی مسلمان کا مکان ہے اسے جلا دیا جائے۔ اور اس کی ابتدا وہ اپنے محلے سے کرنا چاہتے تھے۔ ساری گلی میں بازار کے کونے پر شمس دین نامی مسلمان کا ایک ہی مکان تھا۔ وہ خود کبھی کبھی آتا تھا۔ اور چونکہ اس مکان کا ایک دروازہ بازار میں بھی کھلتا تھا۔ اس لئے وہ ادھر ہی سے داخل ہوتا اور ادھر ہی سے نکل جاتا۔

آنند نے پہنچتے ہی اس فیصلے کی مخالفت کی۔ اور جب وہ اونچی

آواز میں ایک تقریر سی کرنے لگا، تو اُن لوگوں نے اُسے چپ کرانے کے لئے فوراً ہی اپنا فیصلہ رد کر دیا۔ کیونکہ انھیں ڈر تھا۔ کہ اگر اس بات کا علم ان بڑے بوڑھوں کو ہو گیا۔ تو وہ پہلے کی طرح کٹر مخالفت کریں گے۔ بوڑھوں کا بیان تھا۔ کہ یہ مسلم خاندان کئی پشتوں سے یہاں بس رہا ہے۔ بیاہ شادی کے موقعہ پر اس کے ساتھ ان کا لین دین ہے۔ ان کے بچے ایک دوسرے کے مکانوں میں کھیل کر جوان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب کن ہاتھوں سے وہ اپنی بچوں پر یہ ظلم ڈھائیں۔ لیکن چونکہ نوجوانوں پر اس قسم کے جذباتی بندھن کوئی نہ تھے۔ اس لئے وہ ان کی بات دل سے کبھی قبول نہ کرتے تھے

☼ ☼ ☼

گو آنند ان کا فیصلہ رد کرا کے بہت خوش ہوا۔ لیکن اُسے یوں محسوس ہوا۔ کہ ابھی اس کے اپنے پیر کسی مضبوط بنیاد پر جمے ہوئے نہیں ان کی جوش بھری تجویزیں سنتے سنتے کچھ وقت کے لئے خود اس میں جوش بھر گیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دو کے نیفوں میں ٹنگی ہوئی نئی نئی چھریوں کی چمک دیکھ کر نہ جانے کہاں سے یہ خواہش ایک لمحے کے لئے تو اس کے دل میں بھی پیدا ہوئی۔ کہ ایک ایسی ہی چمکدار چھری ہاتھ میں لے کر وہ باہر نکل جائے۔ اور اُسے ہر راہ چلتے مسلمان کے سینے میں اتارتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ ہر ہندو نوجوان اُسے رشک سے دیکھنے لگے۔ اس میں اُسے کچھ اس طرح کا ہیرو پن محسوس ہونے لگا۔ جس کے لئے ہر لڑکی اس پر جان چھڑکنے لگے گی۔ اس وقت اوشا اس پر کتنا فخر کرے گی۔ آخر اس میں زندگی اور حرکت تو

ہے۔ امن اور اہنسا میں بے حرکتی اور ایک مردہ سی شانتی کے علاوہ کیا
رکھا ہے۔

اُسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے یہ جذبات ایک مدت سے
اس کے دل میں موجود تھے۔ اور جیسے یہی اس کے حقیقی جذبات تھے،
اخلاقیات کی غیر عملی باتیں محض سوچنے کی حد تک خوبصورت تھیں۔ عمل
کی روشنی میں ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اور جیسے اس کے حقیقی جذبات
اب عریاں ہونے لگے تھے۔

حتیٰ کہ اُسے اپنے آپ سے ڈر آنے لگا ۔ لیکن اس کی قوتِ
تجزیہ ابھی باقی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ کیونکہ ہمیشہ وہ سوچا ہی کرتا تھا۔ کہ درحقیقت
انسان بنیادی اور فطری طور پر وحشی ہے۔ اذیت پرستی اور سادزم ...
(sadism) اس کی فطرت میں موجود ہے۔ لیکن اس خام مال کو
لطافت کے سانچے میں ڈھالنا، اس شوخ بچھیرے کی سی فطرت کو اخلاق
کے کوڑوں سے قابو میں لانا ہی تہذیب ہے۔ اور یہی انسان کو اس کے
ساتھی جانوروں سے ممتاز بناتی ہے ... ۔ ان ہی باتوں کو سوچتا ہوا
وہ ان کے پاس سے چلا آیا کہ کہیں ان کی اور باتیں سنتے سنتے اس کے
اندر کا حیوان پھر سے بیدار نہ ہو جائے۔ چنانچہ گھر جا کر اس نے دوستوں
کو خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے طے کیا۔ کہ اب وہ محض سوچے گا نہیں
بلکہ کچھ کرے گا بھی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ہندستان کے کونے کونے
میں اپنے دوستوں کو خط لکھے گا۔ اور ان میں امن و تہذیب کا پرچار

کرے گا۔

لیکن اپنے کمرے میں پہنچ کر جونہی وہ خط لکھنے بیٹھا۔ تو سفید کاغذ کو دیکھتے ہی اس چھری کی چمک پھر سے اس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئی۔ تھوڑی دیر پہلے کسی کے سینے میں چھرا گھونپنے کا تصور اس نے اس قدر تفصیل سے کیا تھا۔ کہ اُسے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے واقعی وہ ابھی ابھی کسی کے چھرا گھونپ کر چلا آرہا ہے۔ اور جیسے ایک قتل سے خون کی پیاس اور بڑھ گئی تھی۔

اس نے قلم بند کر کے رکھ دیا۔ وہ ڈرنے لگا تھا کہ نجانے لاشعوری طور پر وہ کسی خط کے ذریعہ کس دوست کے سینے میں خنجر اتار دے۔ اُسے پھر اپنے آپ سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ کہ مبادا وہ اپنے دانتوں سے کسی کا گوشت کاٹ کھائے۔ یا اس اطالوی شاعر دانتے کے بقول اپنے آہنی قلم کی نوک سے کسی کے ماتھے پر خونیں نشان داغ دے۔

وہ قریب قریب بھاگتا ہوا اپنے گھر سے نکلا۔ اور سیدھا بازار کی طرف چلا گیا۔ اس کے دل میں ایک پُرامید خواہش یہ بھی تھی کہ شاید بازار میں اُسے وہی آدمی پھر سے مل جائے۔ جس نے ابھی گھنٹہ بھر پہلے اُسے بے عملی کی کھڈ سے نکال کر عمل کا ایک واضح راستہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اب محض سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کچھ ...

٭ ٭ ٭

وہ بازار میں پہنچا۔ تو شہر چھوڑ کر جانے والوں کا ایک تانتا لگا ہوا تھا۔

انسانوں کا ایک دریا تھا۔ جو کسی نامعلوم مقام کی طرف رواں دواں چلا جا رہا تھا۔ گلیوں میں سے چھوٹے چھوٹے قافلے کچھ اس طرح نکل رہے تھے۔ جیسے چھوٹے چھوٹے نالے پہاڑوں کی مضبوط و محفوظ بلندیوں سے کسی بہت نیچے بہنے والے دریا کی کھڈ میں سر کے بل گر رہے ہوں۔ کسی کسی ٹولی کے پاس ریڈیو اور صوفہ سیٹ بھی تھے۔ لیکن اکثر ٹولیوں کے پاس آگ سے ٹیڑھے میڑھے ہو گئے ٹرنک اور جلے کپڑوں کی چند گٹھڑیاں اور کچھ برتنوں کی بوریاں تھیں۔ عورتوں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بچوں کے چہرے میلے اور مردوں کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ ان سب کو ایک ہی فکر لاحق تھی کہ کسی طرح وہ ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جائیں جہاں سے کوئی نہ کوئی گاڑی تو انھیں اس شہر سے کہیں دور لے جائے گی۔ یہ شہر جس کی گود میں ان کا بچپن کھیلا تھا۔ جس کی بہاروں میں انھوں نے اپنی جوانی کی پہلی دھڑکنیں محسوس کی تھیں۔ جس کی فضاؤں میں ان کے بزرگوں کے نشان لہرا رہے تھے۔ آج وہی ان کے لئے پردیس ہو رہا تھا۔ اس کی زمین ان کے اور ان کے بچوں کے خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ اس سے دور بھاگ جانا چاہتے تھے۔ لیڈروں کی اپیلوں، والنٹیروں کی رکاوٹوں اور تماشائیوں کے طعنوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔ چند نوجوان انھیں زبردستی روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن جتنی دیر میں ایک ٹولی سے جھگڑا ہوتا رہتا۔ درجنوں ٹولیاں اس جھگڑے سے بے نیاز قریب سے نکلتی چلی جاتیں۔ دریا میں طغیانی کا عالم تھا۔ جس پر کوئی بند نہیں باندھا جا سکتا

تھا۔

دوسرے لوگ فقرے کس رہے تھے "بہادروں کا قافلہ ہندستان فتح کرنے جارہا ہے"

کوئی کہتا "یہ سیٹھ جی دہلی جارہے ہیں۔ لال قلعے پر جھنڈا لہرائیں گے"

تو تیسرا کہتا "شاباش بابو انھیں اپنا منتری مقرر کر گئے ہیں"

چند والینٹر اونچی آوازمیں چلّا رہے تھے کہ "بھائیو۔ اس طرح نہ بھاگو۔ اُدھر تمھارے مکان جل جائیں گے۔ ادھر تمھارا اسٹیشن تک پہنچ سکنا بھی یقینی نہیں"

اور یہ واقعہ تھا۔ ابھی ابھی اطلاع آئی تھی۔ کہ نہ صرف لوہاری دروازے کے باہر ان بے سروسامان قافلوں پر ایک بم پھینکا گیا تھا۔ بلکہ اسٹیشن کے ایک ویٹنگ روم میں بھی جہاں ہزاروں کی تعداد میں پناہ گزیں جمع تھے۔ دو بم پھینکے جاچکے تھے۔ لیکن کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ سب ایک موہوم سی امید کے سہارے بہے چلے جارہے تھے۔ حتیٰ کہ جو لوگ ان پر فقرے کس رہے تھے۔ چند گھنٹوں بعد ان میں سے بھی چند لوگ اسی دریا میں بہتے ہوئے دکھائی دیئے۔

"ہندوؤں کا Morale بالکل ٹوٹ گیا ہے"۔ ایک کنارے بیٹھے ہوئے چند نوجوان قوم کا رونا رو رہے تھے۔

"یہ مدافعتی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ کاش ان میں بھی پہلے حملہ کرنے کی

ہمت ہوتی ۔ تو آج ان کی جگہ مسلمان بھاگ رہے ہوتے" دوسرے نے کہا۔

"وہ اس پروگرام کا کیا بنا" تیسرے نے رازداری کے انداز میں پوچھا

"بنے گا تو سب کچھ ۔ ابھی دیکھو دو بجے کے قریب پہنچی گلی سے آگ کے شعلے بلند ہوں گے ۔ لیکن افسوس تو ان لوگوں پر ہے ۔ جو اس وقت بھاگ رہے ہیں۔ جب کہ ہمارا حملہ شروع ہونے والا ہے"

اس کا بیان ابھی پورا نہ ہوا تھا۔ کہ ایک لڑکا ان میں سے اچھلا۔

"وہ دیکھو"

ان سب نے دیکھا۔ کہ ایک تانگہ سامان سے لدا چلا آرہا ہے۔ کوئی سیٹھ کافی روپے کا لالچ دیکر اپنے ہاں کی عورتوں کے لئے اسے لے آیا تھا۔

نوجوانوں میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی ۔ اور ...

چند ہی لمحوں کے بعد تانگے کے قریب ایک بجلی سی چمکی۔ پلک جھپکنے میں لوگ ادھر ادھر بے تحاشا بھاگتے نظر آئے۔ بھاگتے ہوئے انہیں اپنے سامان کا بھی خیال نہ رہا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا بازار خالی ہوگیا۔ صرف وہ چار نوجوان تھے۔ جن میں سے ایک کے ہاتھ میں خون سے لت پت خنجر تھا۔ خون کے چھینٹے اڑکر اس کے کپڑوں پر بھی پڑے تھے۔ تانگے کا مسلمان کوچوان بڑی طرح زخمی ہوکر گر گیا تھا۔ لیکن اس کا جسم پائیدان سے اڑکر آدھا لٹک گیا تھا۔

اس کے پہلو سے گرم گرم خون کا ایک فوارہ اس کے کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا۔ خون کے کچھ موٹے موٹے قطرے تھوڑی سی دیر اس کے دل کے قریب لڑنے کے بعد زمین پر ٹپکتے جا رہے تھے۔ آنند کو یہ دیکھ کر یوں محسوس ہوا۔ گویا۔ انسان نے انسان کے سینے میں چھرا بھونک کر خود کشی کر لی تھی۔ اور انسانیت تاریخ کی اس سب سے بڑی ٹریجیڈی پر خون کے آنسو بہا رہی تھی۔

زخمی کو جوان ہلنے جلنے تک کے قابل نہیں رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں نہایت خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ درد کے حد سے گزر جانے کے باعث ان میں آنسو کا ایک بھی قطرہ نہ تھا۔ البتہ اس کی نگاہوں میں ایک سوال جھلک رہا تھا۔ وہ سوال کیا تھا۔ وہ شخص اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا بہتا ہوا خون یہ پکار رہا تھا کہ۔ معصوم انسانی خون کو اس طرح خاک میں ملنے بچاؤ "۔ یا اس کی منجمد نگاہیں اس شخص کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جو اس کا بدلہ لے گا۔ بہر حال اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور زبان بند۔

"اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ پیٹرول لاؤ "۔ ایک نوجوان نے کچھ اس طرح کہا۔ گویا وہ کوئی دفتری کارروائی کر رہا ہو۔

جب اس پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگائی گئی۔ تو اس وقت بھی وہ اسی طرح خاموشی کے ساتھ کچھ ایسی نگاہوں سے، اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جن کی تہہ تک پہنچ کر یہ دیکھ سکنا ممکن نہ تھا کہ ان کی گہرائیوں

میں موتی جمع تھے یا آنسو ڈول رہے تھے۔

"سالے سمجھتے تھے کہ ہم اپنے سات آدمیوں کا بدلہ ہی نہیں لے سکتے۔ جنھیں انھوں نے پرسوں اسی طرح زندہ جلا دیا ہے۔ ایک نوجوان نے آگ کی لپٹوں کے ساتھ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہائے ہائے۔ بیچارے گھوڑے کو تو کھول لو" بائیں کنارے کے مکان کی بالائی منزل سے ایک پر رحم عورت کی آواز آئی۔

گھوڑا چاروں پیر اٹھا کر اچھل رہا تھا۔ چنانچہ بڑی مشکل سے اس کے بند کاٹ کر اُسے آزاد کر کے قریب کی گلی تک پہنچایا گیا۔ چند رحم دلوں نے اُسے ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس کی جلد ایک دو جگہ پر جل گئی تھی۔ چنانچہ ایک لڑکی بھاگ کر اس کے لئے مرہم لینے گئی۔ اور چند عورتیں اپنے آنچلوں کی ہوا سے اس کے زخموں سے مکھیاں اڑانے لگیں۔

اتنے میں ایک نوجوان بھاگا ہوا اندر آیا۔ اور ایک مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔ کہ "ایک ڈبہ اور بھیجنا جلدی سے تانگہ جل گیا۔ لیکن وہ ابھی جلتا ہی نہیں"۔

آخری فقرہ اس نے قدرے آہستہ آواز میں قریب کھڑے لوگوں کو سنانے کے لئے کہا۔

فوراً بعد وہی لڑکی ایک ہاتھ میں مرہم کی ڈبیا اور دوسرے میں پیٹرول کا ایک ڈبہ اٹھائے باہر نکلی۔ ڈبہ اس نوجوان کے ہاتھ میں دیتے ہی وہ اس گھوڑے کی طرف بھاگی۔ اور اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔

آنند جو دوسرے لوگوں کے ساتھ بھاگ کر اس گلی میں آچکا تھا اب دوبارہ باہر جاکر جلتے ہوئے تانگے کو دیکھنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا۔ کہ وہ چاروں نوجوان بھاگ کر اندر چلے آئے۔ کسی نے دور سے پولیس کے آنے کا اشارہ کیا تھا۔ چنانچہ ان کے اندر آتے ہی گلی کی کوچہ بندی کو قفل لگا دیا گیا۔

ایک نوجوان نے گلی کے نل پر بیٹھ کر کپڑے تبدیل کئے۔ اور وہیں اس چھرے کو دھونے لگا۔ ایک ہی منٹ میں وہ خون آلود خنجر صاف ہوگیا۔ اور اس کی چمک پھر لوٹ آئی۔ آنند سوچنے لگا۔ کہ "اس خنجر کے لئے بھی خونیں رنگ ایک عارضی شے ہے۔ دائمی ہے صرف اس کی سفیدی یا روشنی۔ اور سفیدی اور روشنی امن اور نیکی کے نشان ہیں۔ ایک خنجر کے بنیادی رنگ بھی امن و نیکی کے نشان ہیں" اور پھر اسے اپنا پہلا خیال کہ بنیادی طور پر آدمی شیطان ہے۔ غلط نظر آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ نیکی اور امن ہی ازلی ہیں اور ابدی۔ آج ہزارہا سال سے شیطنت جنگ کی تلوار سے امن اور نیکی کا خون کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہو سکتی۔ امن آخر کار ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ امن کا وقفہ ہمیشہ جنگ کے وقفے سے زیادہ رہا ہے۔ آدمی نے سو سو سال تک مسلسل جنگ کر کے دیکھ لیا۔ لیکن امن اور انسانیت نابود نہ ہو سکے۔ اور آخر کار وہ دن یقیناً آئے گا۔ جب شیطنت اور جنگ تھک جائیں گی۔ جب بالکل امن ہوگا ۔ ۔ ۔ ایک مسلسل اور دائمی امن۔ جب کہیں کوئی جنگ نہیں ہوگی

جب فضاؤں میں ہر چہار طرف قوس و قزح کے رنگ بکھرے ہوں گے"
اور یہ سوچتے سوچتے اُسے تاریخ کی مشہور جنگ جو ہستیاں ـــــ بڑے
بڑے فاتح اور جرنیل چیونٹیوں کی مانند حقیر نظر آنے لگے۔ جن کی زندگیوں
کے چند سال ازل و ابد کی وسعت کے مقابلہ پر وقت کے چھوٹے سے
چھوٹے ٹکڑوں سے بھی زیادہ غیر اہم معلوم ہونے لگے۔

اور ان باتوں کے ساتھ ہی ساتھ اُسے اس بات کا بھی خیال آیا
کہ آخر خود اس کی اہمیت کیا ہے۔ وہ جو محض سوچتا رہتا ہے اور کرتا کچھ بھی
نہیں۔ اُن سے بھی برا ہے جو خواہ برا کرتے ہیں۔ لیکن کچھ کرتے تو ہیں۔ مگر
ساتھ ہی اُسے اس بات کا بھی خیال آیا۔ کہ "آخر مجھ اکیلے کے کرنے سے کیا
ہو گا۔ میں اکیلا طوفان کے دھارے کو کس طرح موڑ سکوں گا"۔ لیکن یہ شکوک
بہت دیر تک اس کی ہمت شکنی نہ کر سکے۔

بے عملی سے عمل کی طرف بڑھتے ہوئے جیسے مختلف خیالات کی
ایک باڑھ اس پر چھوڑ دی گئی تھی۔ جو کئی مخالف سمتوں سے اُس پر ٹوٹ پڑے
تھے۔ اور ہر مخالف رَو اسے اپنے دھارے کے ساتھ بہالے جانا چاہتی تھی،
ایک شک پیدا ہوتا۔ تو اس کے ساتھ ہی اس کا توڑ دماغ میں آجاتا۔ اور پھر
ایک نیا شک۔ اور پھر اس کا جواب۔ حتیٰ کہ وہ بے عملی اور محض سوچتے رہنے
کی زندگی سے ایک عملی جیون کی طرف تِل تِل کر کے بڑھتا جا رہا تھا۔ چنانچہ
اس نے اس سوال کا جواب بھی سوچ لیا کہ "آخر میری کوشش کتنی ہی حقیر
کیوں نہ ہو۔ وہ قطعی طور پر رائیگاں نہیں جائے گی۔ محض سوچنا بھی کسی حد تک

آس پاس کے کرۂ ہوائی کو متاثر کر دیتا ہے۔ اور ممکن ہے اس میں سانس لینے والا کوئی دوسرا آدمی اُس سے متاثر ہو۔ اور پھر اسی طرح اس سے آگے جو تا سے جوت جلنے کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ اور اتنی معمولی شروعات بھی چشمے کی طرح ایک دن دریا اور پھر سمندر بن جائے ... "

" ڈیفنس تو آخر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے سوا کیا چارہ ہے۔ بلکہ بعض دفعہ جو بظاہر اوفنیس دکھائی دیتا ہے۔ ڈیفنس ہی کی ایک صورت ہوتا ہے " ان نوجوانوں میں سے ایک اپنے گرد کھڑے ہوئے چند بوڑھوں کے سامنے شاید اپنے کارنامے کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آنند نے ان کی پہلی گفتگو نہیں سنی تھی۔ لیکن اس دلیل نے اس کے دماغ میں خیالات کی ایک نئی رَو پیدا کر دی " ڈیفنس یا بہادرانہ مدافعت واقعی قابلِ تعریف ہی۔ لیکن سات ہندوؤں کو زندہ جلا دینے والے مسلمانوں کے بدلے ایک انجان کوچوان کو زندہ جلا دینا تو نہ بہادری ہے اور نہ انصاف۔ نواکھلی کے مظالم کا بدلہ بہار کے مسلمانوں سے نہیں لیا جا سکتا۔ اور اگر کسی میں ہمت ہو تو راولپنڈی اور نواکھلی میں جا کر مدافعت کرے۔ ... لیکن اس صورت میں بھی اس بات کی گارنٹی کون دے سکتا ہے کہ ڈیفنس اپنی حدود کے اندر رہے گا۔ اور اوفنیس کی سرحدیں داخل ہو کر حملہ آور ہجوم کی صورت اختیار نہ کرے گا۔ اس وقت اُن عظیم مسلمانوں کو کون بچا سکے گا۔ جنھوں نے بعض بعض گاؤں میں اپنی جانوں پر کھیل کر بھی اپنے

ہندو ہمسایوں کی حفاظت کی۔ اگر ڈیفنس کرتے ہوئے اس قسم کے ایک بھی بے گناہ بہادر کے قتل کا امکان ہو۔ تو اس سے بغیر مدافعت کے مرجانا کہیں بہتر ہے،،

اور یہ سوچتے ہوئے اُسے اچانک خیال آیا۔ کہ یہ نوجوان کہیں وہی تانگے والا تو نہیں تھا۔ جس کے متعلق پرسوں اطلاع آئی تھی کہ اس نے نہایت بہادری سے ایک ہندو عورت کو موچی دروازہ کے باہر ایک مسلم ہجوم سے بچایا تھا۔۔۔۔ ۔۔۔۔

"پنچی گلی میں آگ لگ گئی،، اتنے میں کسی چھت پر سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ بہت سے لوگ یہ سنتے ہی سیڑھیوں کی طرف بھاگے۔ اور چھتوں پر چڑھ کر دیکھنے لگے۔

آنند نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بھاگتا ہوا وہ اپنی گلی میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اُس نے دیکھا کہ واقعی شمس دین کے مکان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ اور کوئی نوجوان آگ بجھانے والا موجود نہ تھا۔ صرف ایک طرف دو چار بوڑھے اس آگ کو دیکھ دیکھ کر کچھ اس طرح ہاتھ مل رہے تھے۔ جیسے یہ شمس دین کا مکان نہیں بلکہ خود ان کے بچپن کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی انھوں نے فریاد کے انداز میں پکارا۔ "آنند اس آگ کو بجھاؤ۔ دیکھو یہاں کوئی نہیں ہے،،۔ لیکن آنند بجھاتا کیسے پانی کے جو ڈرم اسی قسم کے کسی حادثے کے لئے بھرے رہتے تھے۔ کسی نے بالکل خالی کئے ہوئے تھے۔ اور تلاش بسیار کے باوجود اُسے کہیں

سے ایک بھی بالٹی نہ ملی۔ کہ وہ کنوئیں ہی سے پانی نکال لیتا۔ اُسے اور کچھ نہ سوجھا۔ تو وہ پریشانی کے عالم میں خفیہ سامان والی پناہ گاہ میں گھس گیا۔

وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا۔ کہ سب نوجوان اطمینان سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کا آڑا سا خط کھنچ گیا۔

"لو بھئی۔ ہم نے تو اپنا کام پورا کر لیا"۔ ایک نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے نے پوچھا۔ "ٹھیک طرح جل رہا ہے یا نہیں؟"

"یہ تو بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ۔ کہ وہ بالٹیاں کہاں ہیں جو تم لوگوں نے ابھی ابھی سارے محلے سے اکٹھی کی تھیں"۔ آنند کے پاس باتوں کے لئے وقت نہ تھا۔ لیکن اس کی جلدی اور پریشانی کا اثر ان میں سے ایک پر بھی نہ ہوا۔ ایک لڑکا چاکلیٹ کے ٹکڑے تقسیم کر رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اسی طرح لگا رہا۔ اور باقی لڑکے ان ٹکڑوں کو منہ میں ڈال کر بڑے اطمینان سے چوسنے لگے تھے۔ آنند کی طاقتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ اور وہ ڈسپریٹ (Desperate) ہو رہا تھا۔

"دیکھو اگر تم لوگ اسی طرح خود بجھاؤ گے نہ مجھے بجھانے دو گے۔ تو میں اسی طرح نہتا بھی اس آگ میں چلا جاؤں گا"

اس کے جواب میں نرو تم نے اپنا چاکلیٹ بائیں گال میں دبا کر گانا شروع کیا۔

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا ... ...

لیکن اتنی دیر میں آنند جا چکا تھا۔

باہر آگ بہت بھڑک گئی تھی۔ آنند نے لمحہ بھر کے لئے کھڑکیوں کے قریب رقص کرتے ہوئے شعلوں کو دیکھا۔ اور پھر وہ سیدھا اس مکان میں گھس گیا۔

✻ ✻ ✻

... ... شعلے ہر چہار طرف سے اس کے گرد لپٹنے کی کوشش میں آگے بڑھ رہے تھے۔ گردو دھوئیں کے گہرے بادلوں نے ہر قدم پر اُسے ایک ٹھوکر کھلائی۔ لیکن اُسے اس وقت کسی بھی چیز کا ہوش نہ تھا کسی دروازے کا ایک موٹا سا پردہ کہیں سے اس کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اسی کی مدد سے شعلوں کو دبانے کی کوشش کرتا ہوا وہ اوپر کی منزل تک جا پہنچا تھا۔

نیچے گلی میں ایک چھوٹا موٹا حشر بپا ہو گیا تھا۔ آنند کی وجہ سے عورتوں اور بوڑھوں میں ایک ہاہاکار مچ گیا تھا۔ اور نوجوان مجبور ہو کر پانی کی بالٹیاں لئے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن آگ ان کے قابو سے باہر جا چکی تھی۔

آنند اپنی ناکام کوششوں سے تھک چکا تھا۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ وہ نیچے والوں کی آوازیں سن سکتا تھا۔ اور اسے اس بات

سے ایک ناقابلِ بیان سکون حاصل ہو رہا تھا۔ کہ آخر اس نے انھیں آگ بجھانے کی کوشش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور یہ اس کی فتح تھی۔ لیکن اب سیڑھیاں جل رہی تھیں۔ اور اس کے پاس نیچے جانے کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ کہ وہ اپنے ساتھیوں کو صحیح راستہ تو دکھا سکا۔ آخر اس نے اپنی بے عمل زندگی میں کچھ تو کیا۔

اوپر کو جاتے ہوئے شعلوں میں اس نے سامنے اوشا کے بام پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں اس وقت کوئی نہ تھا ——— اے کاش وہ اس وقت ایک بار تو اوشا کو دیکھ لیتا۔ لیکن شاید یہ آگ اُسے اتنی فرصت نہ دے یا شاید وہ بھی اس وقت ان سب کے ساتھ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہی ہو ——— کتنا حسین خیال تھا ... ... لیکن پھر اُسے یہ خیال آیا۔ کہ اس آگ کے سامنے اس کی یا اس کے عشق کی اضافی اہمیت ہی کتنی ہے —— —— یہ آگ جو پانچ ہزار برس یا شاید پچاس ہزار برس کے بوڑھے انسان کو اس طرح ایک ہی دن میں جلا کر راکھ کر رہی تھی۔ اور اُسے کیٹس کی ایک نظم یاد آ گئی۔ جس میں اُس نے لکھا تھا۔ کہ

"اے حسینہ جب میں یہ محسوس کرتا ہوں۔ کہ میں پھر کبھی تمھارا چہرہ نہ دیکھ سکوں گا۔

... ...

... ... جب مجھے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ ایک دن میں نہیں رہوں گا۔ تو میں اس جہاں کے وسیع ساحل

پر تنہا کھڑا ہو کر سوچنے لگ جاتا ہوں۔ حتیٰ کہ محبت شہرت
اور دیگر تمام کارنامے "کچھ نہیں" کی گہرائیوں میں
ناپید ہو جاتے ہیں۔

وہ یہی کچھ سوچتا ہوا سب سے اوپر کی منزل میں چلا گیا۔ بالائی کمرہ
میں ابھی سانس لیا جا سکتا تھا۔ گلی میں سے آنے والی آوازیں اُسے کہیں
بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ لوگ اُسے بچانے کی
خاطر آگ سے لڑ رہے تھے۔ اور اس وقت سب سے اوپر کی منزل میں
بیٹھ کر اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا وہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ زمان و مکان
کی لامحدود بلندیوں سے بھی اونچا۔

نیچے لوگ آگ سے لڑتے رہے۔ اور ان بلندیوں پر بیٹھا ہوا وہ
بڑے اطمینان سے ایک نظم لکھتا رہا۔

"آج سے ہزار سال بعد میری یہ نظم پڑھنے والے
انسان ——
میں اپنی بلندیوں سے تمھارے ہاں کا سب کچھ دیکھ سکتا ہوں
لیکن افسوس تمھیں اپنے ہاں کا کچھ نہیں دکھا سکتا۔
—— اے ہزار سال بعد کے انسان
تمھاری فضاؤں میں جو قوس و قزح ہمیشہ جھولتی رہتی ہے
اُسے دیکھو اور یاد کرو کہ اس میں وہ خوبصورت نیلا رنگ بھرنے
کے لئے آج کے دن میرے جیسے تمھارے کسی ساتھی نیلے دھوئیں

کے بادوں میں کھو گئے!

انھیں یاد کرو

اپنے ہاں کی حسین پربھاتوں کو دیکھو۔ اور یقین کرو

کہ انھیں تمھاری خاطر حسین بنائے رکھنے کے لئے کسی نے آج اُن

سے بھی حسین نرادشا کو چھوڑتے وقت آخری دید کا بھی انتظار

نہیں کیا۔

ہو سکے تو اُسے بھی یاد کر لو ... ... "

Scanned with CamScanner

دوسرا حصہ

رقصِ شرر

چوتھا باب

پنجاب کے وسیع میدانوں میں لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی کھڑی فصل کو ڈھور ڈنگر بڑے مزے سے کھا رہے تھے۔ انھیں ان قحط آور حرکتوں سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اور نہ کوئی اس فصل کو کاٹنے والا ہی تھا۔ اس فصل کی حفاظت کرنے والے انسان آج نیم عریاں حالت میں چھوٹی بڑی ٹولیاں بنائے بے سروسامانی کی حالت، برستے پانیوں اور کڑکتی دھوپ میں کہیں پناہ ڈھونڈنے کی خاطر پنجاب کے ایک سرے سے دوسرے

سرے تک دوڑ لگاتے پھر رہے تھے۔ اُن کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے، ان کا سامان آگ یا لٹیروں کی نذر ہو گیا تھا۔ کپڑے اسی دوڑ بھاگ میں پھٹ گئے تھے۔ ان کی آدھی کے قریب عورتوں نے خودکشی کر لی تھی۔ اور جو باقی تھیں۔ وہ کچھ اس طرح سہم گئی تھیں کہ انھیں اب اپنے مردوں پر بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ جو مرد اپنے گاؤں کی ہر لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھا کرتے تھے۔ جو مرد بازاروں میں انھیں عزت سے راستہ دیا کرتے تھے۔ اور جن کے بزرگوں نے ان کی ماؤں اور دادیوں کی عزت کی ہمیشہ حفاظت کی تھی۔ ان ہی مردوں نے آج ان کے ساتھ وہ کچھ کیا تھا۔ کہ اب وہ ہر مرد سے دہشت کھانے لگی تھیں۔ خود اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی صورت سے انھیں کچھ اس طرح کی بربریت اور دحشت ٹپکتی دکھائی دیتی۔ جیسے وہ بھی ان کی چھاتیوں کا گوشت کچا ہی کھا جائیں گے۔

ان کے بچے بھوک اور پیاس سے بلبلا رہے تھے۔ بچوں کے حلق اس طرح سوکھ گئے تھے۔ کہ اب وہ زور سے چلا بھی نہیں سکتے تھے۔ جیسے کوئی ظالم ان کی چیخوں کو گلے سے باہر نکلنے سے قبل ہی دبا دیتا۔ اور وہ محض بے بسی کے عالم میں اپنے چاروں طرف دیکھتے رہ جاتے ——— اپنی ننھی ننھی آنکھوں میں سینکڑوں ہزاروں سوال لئے۔ لیکن شاید وہ ایک ہی سوال تھا۔ جو ان سب کی نگاہوں میں دائمی ہو کر رہ گیا تھا۔ یہی سوال اس وقت ان کی نگاہوں میں تھا۔ جب ان کے چند ننھے ساتھیوں کو کچھ آدمیوں نے ٹانگوں سے پکڑ کر ان کے سر پتھروں پر اس طرح پٹکے

جس طرح دھوبی کپڑے دھوتا ہے۔ جب چند لوگوں نے کچھ بچوں کی ایک ایک ٹانگ پر اپنی ٹانگ رکھ کر ان کی دوسری ٹانگیں ہاتھوں سے پکڑ کر ان کے ملائم سے جسم ایک کڑکڑاتی آواز کے ساتھ دو حصوں میں اس طرح چیر دیئے۔ جس طرح کوئی بزاز کسی نازک ریشمی کپڑے کو ہنستے ہنستے پھاڑ دیتا ہے تو اس وقت بھی ان بچوں کی نگاہوں میں شاید یہی سوال تھا۔ اور یہی سوال آج بھی ان کی نگاہوں میں اس وقت نمایاں ہو اٹھتا۔ جب وہ بھوک اور تھکن سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنے والدین کی طرف دیکھتے۔

وہ اپنے والدین سے کیا پوچھ رہے تھے؟ انھوں نے اپنے قاتلوں سے کیا پوچھا تھا؟ ان کی نگاہیں اس بے بسی کے عالم میں ہر چہار طرف دیکھتی ہوئی کسے ڈھونڈ رہی تھیں؟۔ اور وہ کون سا سوال تھا۔ جو جواب کے بغیر ان کی نگاہوں میں دائمی ہو کر رہ گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ آج نگاہوں کی زبان سمجھنے والا شاید کوئی نہیں رہا تھا۔ اور انسان کی مروجہ مہذب زبان میں بولنا۔ ابھی ان معصوموں نے سیکھا نہیں تھا ——— اور پھر ان کے سوال یا اس کے جواب کے بارے میں سوچنے کی فرصت بھی کسے تھی۔ انسان انسان کے بچنے کے لئے مضطرب لہروں کی طرح دریاؤں میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اور آوارہ آندھیوں کی طرح جنگلوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

آنند نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور سوچا تھا کہ کیا یہی سب کچھ دکھانے کے لئے اُس روز شمس دین کے جلتے ہوئے مکان سے اُسے بے ہوشی کے عالم میں نکال لیا گیا تھا۔ کاش اس روز وہ جل جاتا۔ تو کتنی

شاندار ہوتی وہ موت۔ لیکن شاید وہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے نہیں تھا جو فسادی کا چھرا کھا کر ہی سہی لیکن چین سے موت کی نیند تو سو گئے تھے اور وہ کچھ دیکھنے کے لئے زندہ رہے تھے۔ جو اس نے دیکھا تھا۔

یوں تو اس نے کیا کچھ نہ دیکھا تھا ـــــــ جن کو ایک نامناسب گناہ سے بچائے رکھنے کے لئے ایک دن اس نے اپنے آپ کو آگ کی بھینٹ کر دیا تھا۔ خود ان کو زندہ جلتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔ ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی رات کو ہندستان کو انڈیا اور پاکستان نام کے دو ٹکڑوں میں کاٹ دینے کے بعد دونوں راجدھانیوں میں جب وقت آزادی کے جشن منائے جا رہے تھے۔ اس وقت اس نے پنجاب میں انسان اور انسان کے درمیان ہر طرح کے انسانی تعلقات کی لاشوں کو ایک تاریخی آگ میں جلتے دیکھا تھا۔ رات کے بارہ بجے کانسٹی ٹیوٹنٹ اسمبلی سے ریڈیو کے ذریعہ نشر کی گئی۔ "انقلاب زندہ باد"، "جے ہند" اور "پاکستان زندہ باد" کی آوازیں جب ہوائی لہروں کے دوش پر تیرتی ہوئی پنجاب کے آسمانوں سے گذریں۔ تو لاہور اور اس کے حسن کو خاک کر دینے والے شعلوں نے آسمان تک بلند ہو کر ان پر انگلیاں اٹھائیں۔ دھو دھو کر کے جلتی ہوئی تہذیب نما عمارتوں نے کڑکڑا کر گرتے گرتے ایک طنزیہ قہقہہ بلند کیا۔ اور کئی دردناک چیخیں پکار پکار کر کئی سوال پوچھتی ہوئی ان مستانہ نعروں کے پیچھے پیچھے فضاؤں میں ٹھوکریں کھانے لگیں۔

ان تاریخی تاریخوں کو کون بھلا سکتا تھا ـــــــ اگست کے دوسرے

ہفتے ہی میں پنجاب کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔ اور امرتسر، پٹیالہ، لدھیانہ وغیرہ کے علاقوں سے بھی بے حد افسوس ناک خبریں آنی شروع ہو گئی تھیں حتیٰ کہ ۱۴؍ اگست کی صبح کو مسلمان پناہ گزینوں کی پہلی گاڑی امرتسر سے لاہور پہنچی۔

اس روز اسٹیشن پر بہت سے والنٹیر پناہ گزینوں کو لینے کے لئے پہلے سے انتظار میں کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر اور بھی بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کی غرض سے اکٹھے ہو گئے۔ اور پلیٹ فارم پر ایک اچھا خاصا مجمع ہو گیا تھا۔

اچانک گھنٹی بجی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی۔ چند ثانیے تو سب لوگ دم بخود یہ سوچتے ہوئے کھڑے رہے کہ اب وہ کیا کریں۔ پھر ایکا ایک کسی والنٹیر نے اونچی آواز میں پکارا ——— "پاکستان ———" جس کے جواب میں سارے مجمع نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا ——— "زندہ باد" ———

مجمع میں پلک جھپکتے ہی زندگی آ گئی۔ اسٹیشن "اللہ اکبر" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اور لوگ نعروں کے درمیان گاڑی کے مختلف ڈبوں کی طرف لپکے۔ لیکن ان کی توقع کے خلاف ڈبوں میں سے کسی نے ان کے نعروں کا جواب نہیں دیا۔

پرجوش نوجوانوں نے زور سے دروازے کھولے اور اندر گھس گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گھبرا کر باہر نکل آئے۔ ان کے باہر

آنے ہی لوگوں نے دیکھا۔ کہ ان کے جوتے سیاہی مائل خون سے لتھڑ گئے تھے۔

اکثر ڈبوں کے اندر فرش پر خون ہی خون تھا۔ اور اس میں کئی پناہ گزیں ایک دوسرے پر گرے پڑے تھے۔ اکثر اسی حالت میں پڑے پڑے مر چکے تھے۔ چند ایسے زخمی تھے جن کے اعضاء کو جنبش نہ تھی۔ لیکن شاید آنکھوں میں ابھی دم باقی تھا۔ اور کچھ لوگ پرلی سیٹوں پر بیٹھے اندر آنے والوں کی طرف چپ چاپ دیکھے جا رہے تھے۔ وہ زندہ تھے۔ لیکن شاید ابھی انھیں اس بات پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یا وہ ان لوگوں کو بھی ان سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھی سمجھ رہے تھے۔ جنھوں نے راستہ میں گاڑی روک کر ان کے ڈبوں کو انسانی جراثیم سے پاک کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایک ڈبے کی دیوار پر کسی نے خون کے ساتھ لکھ دیا تھا ——

"راولپنڈی کا جواب —— !" اور اس ڈبے پر چھائی ہوئی موت کی خاموشی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی، کہ "ان کو روکو —— جو نوا کھلی کا جواب بہار میں، اور بہار کا جواب راولپنڈی میں دیتے ہیں۔ خدا را کوئی انھیں سمجھاؤ ...."

اُن لوگوں کو بڑی مشکل سے اس بات کا یقین آیا۔ کہ وہ اب محفوظ جگہ پر پہنچ چکے ہیں۔ اور یہ اعتماد گویا ارجن کا زمین سے پانی نکالنے والا وہ تیر تھا۔ جس کے لگتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ ان میں محسوس کرنے کی طاقت لوٹ آئی۔ انھیں اپنے زخموں اور چوٹوں

کا احساس بُری طرح ہو آیا۔ اور وہ رونے لگے۔ زخمیوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ اور وہ اس امید پر زور زور سے کراہنے لگے۔ کہ انہیں پہلے اتارا جائے گا۔ لیکن اب ان کی سدھ لینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

سارے پلیٹ فارم پر صرف چار یا پانچ والنیٹر رہ گئے تھے۔ جو پناہ گزینوں کی طرف توجہ دے رہے تھے۔ باقی سب لوگ بجانے کہاں چلے گئے تھے البتہ اسٹیشن کے مختلف حصوں اور بیرونی برآمدے کی طرف سے بہت شور سنائی دے رہا تھا۔ باہر سے نعروں کی آواز بھی کسی کسی وقت آرہی تھی۔

کسی نے ان کی گاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے حوصلہ افزا اور اونچی آواز میں پناہ گزینوں کو سناتے ہوئے کہا۔ "اسٹیشن پر ہندوؤں کا قتل عام شروع ہو گیا ہے"۔ لیکن پناہ گزینوں کو جیسے اس خبر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس وقت تو انہیں والنیٹروں کی اپنے پاس ضرورت تھی۔ جو زخمیوں کو باہر نکالتے اور لاشیں اٹھواتے۔

والنیٹروں کے مایوس کن انتظار کے بعد آخر پناہ گزینوں نے خود ہی حرکت کرنی شروع کی۔ جو ٹھیک ٹھاک تھے۔ ان میں سے اکثر پہلے ہی زخمیوں اور لاشوں کو روندتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔ اور ان تین چار والنیٹروں کو اپنے گھیرے میں لے کر ریلیف کیمپ وغیرہ کے متعلق بہت کچھ پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ اور ادھر زخمیوں نے زور زور سے مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

یوں معلوم ہو رہا تھا۔ کہ ہر کوئی جلد از جلد ان خونی ڈبوں سے باہر

نکلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ چند زخمیوں نے رینگ رینگ کر دروازوں میں سے اپنے آپ کو لٹکا کر پلیٹ فارم پر گرا لیا۔ اتنے میں ایک والنٹیر سامنے کے کمرے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا خنجر تھا۔ جس سے تازہ خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ قریب سے گذرا تو ایک زخمی نے جس کی دونوں ٹانگیں ناکارہ ہو چکی تھیں۔ اُسے مدد کے لئے پکارا۔ لیکن وہ یہ کہتا ہوا جلدی سے آگے بڑھتا گیا کہ "تھوڑا سا کام اور باقی ہے۔ وہ کر کے ابھی آیا۔"

زخمی نے جلدی سے لیٹ کر اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور طالب رحم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن ہمارا کام کون کرے گا"۔

والنٹیر غصے میں بھرا ہوا رک گیا۔ اس نے ملامت بھری نگاہوں سے زخمی کی طرف دیکھ کر کہا "تو یہ ہم کس کی خدمت کر رہے ہیں اپنے باپ کی؟ اس وقت تک سو کے قریب ہندو اسٹیشن پر قتل کئے جا چکے ہیں۔ اور آپ کا مزاج ہی کہیں نہیں ٹھہرتا۔"

زخمی پناہ گزین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یہ تم کسی کی خدمت نہیں کر رہے میرے بھائی۔ بلکہ ایسی کئی اور گاڑیاں بھرنے کا سامان کر رہے ہو۔" اس نے اس گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جو انھیں امرتسر سے لائی تھی۔

والنٹیر نے جھٹک کر اپنی ٹانگیں اس کی گرفت سے چھڑا لیں۔ "کائر۔" اس نے ملامت کرتے ہوئے کہا "قومی جہاد سے روکتے ہو۔ ڈرپوک کہیں کے" اور خنجر والا ہاتھ جھٹکتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

اس کی ٹھوکر سے وہ بناہ گزیں زمین پر لوٹ گیا۔ جھولتے ہوئے خنجر سے ٹپکا ہوا کسی ہندو کے خون کا ایک قطرہ اس کے گال پر گرم گرم آنسو کی طرح گرا۔ اور وہاں پہلے سے سوکھے ہوئے مسلمانی خون کو پھر سے تازہ کر کے اس میں کچھ اس طرح گھل گیا، کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ کہ اس بہتے ہوئے قطرے میں مسلمان کا خون کتنا ہے اور ہندو کا کتنا۔

⁂ ⁂ ⁂

اس روز بارہ بجے سے قبل ریلوے اسٹیشن پر اس قومی جہاد کی خاطر چار سو سے زیادہ انسانوں کو اپنا خون بھینٹ کرنا پڑا۔ اور اس کے بعد چار دن تک لاہور والے تاریخ کے بڑے سے بڑے قتل عام کے ریکارڈ کو مات کرنے کی کامیاب کوشش میں لگے رہے۔

ان چار دنوں میں وہاں سورج دکھائی نہیں دیا۔ شہر کے کونے کونے میں بھڑکتی ہوئی آگ کے دھوئیں سے سارا آسمان افق تا افق بھر گیا تھا۔ اوپر کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہی آنکھوں میں جلتا ہوا دھواں پڑ جاتا۔ حتیٰ کہ ان گرمیوں میں بھی کوئی آدمی چھت پر نہیں سو سکتا تھا۔ کیونکہ صبح ہوتے ہوتے فضا میں اڑتی ہوئی سیاہ راکھ سے بستر بھر جاتا تھا۔

گزشتہ چھ ماہ سے لاہور میں مرنا بھی بے لطف ہو گیا تھا۔ کیونکہ ریلیف ٹرک کے بغیر مردے کو بھی بحفاظت شمشان گھاٹ تک لے جانا ناممکن تھا اور ریلیف کمیٹی والے پٹرول کی بچت کے پیش نظر اس وقت تک ٹرک نہ بھیجتے تھے۔ جب تک دس پندرہ مردے اکٹھے نہ ہو جائیں۔ لیکن ان چار

دنوں میں تو شمشان گھاٹ میں جشن کی سی حالت رہی۔ ہزارہا ہندوؤں کی لاشیں بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت میں وہاں بکھری پڑی تھیں۔ اور ہر ڈھیر کے ڈھیر کو اکٹھا جلایا جا رہا تھا۔ شمشان گھاٹ کی چند ہزار من لکڑیاں ناکافی ہو گئی تھیں۔ چنانچہ خود جلتی ہوئی لاشوں ہی کو ایک دوسری کے لئے ایندھن کے فرائض سرانجام دینے پڑ رہے تھے۔ اس کے باوجود بہت سی لاشوں کو ادھ جلی حالت میں راکھ کے تودوں کے ساتھ ایک کونے میں پھینک دیا جاتا تھا

ان چار دنوں میں شہر کی چار دیواری کے اندر ہندوؤں کا ایک بھی مکان آگ سے نہ بچا تھا۔ بلکہ چند ایک محلوں کو تو آگے بڑھتے ہی مسلمانوں کے پہنچنے سے قبل وہاں کے ہندوؤں نے مایوس ہو کر خود اپنے ہی ہاتھوں پھونک دیا۔

آنند کا محلہ بھی ۱۵ اگست کو جلا دیا گیا۔ شام کے قریب ہی ایک سو کے قریب مسلمان ایک ایک کر کے اُسی شمس دین کے مکان میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور اندھیرا ہوتے ہوتے وہ لوگ ایکا ایک محلے پر ٹوٹ پڑے۔ شمس دین سب سے آگے تھا۔ بلکہ آنند کے مکان پر اُس نے اپنے ہاتھوں سے پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔

لالہ بنواری لال نے اپنے مکان کا پچھلا دروازہ کھول کر دوسری گلی میں جانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس گلی والوں نے مسلمانوں کی آمد کا شور سنتے ہی اس کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ تاکہ مسلمان اس راستے ان کی طرف نہ آ سکیں۔ بنواری لال کے بار بار پکارنے پر اُدھر سے کسی

ستم ظریف نے صرف اتنا جواب دیا کہ "لالہ جی - اس وقت کرفیو لگا ہوا ہے۔ اس طرح ایک گلی سے دوسری گلی میں جانا خلافِ قانون ہے"، لیکن یہ کہنے والے کو اس بات کا علم نہ تھا۔ کہ خود ان کی گلی میں بھی دوسری طرف سے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مسلح جتھا داخل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کسی کو دوسرے کا کچھ علم نہ رہا۔ کون کون آگ میں جل گیا۔ کس کس نے لڑتے ہوئے جان دی، کنوؤں میں کون کون گرا۔ کون مدد کے لئے پکارتا رہا۔ کسی کو یہ جاننے کی فرصت نہ تھی۔ حتیٰ کہ جو لوگ بھاگ رہے تھے۔ انھیں یہ بھی پتہ نہ تھا کہ اس وقت وہ کس مقام پر ہیں۔ اپنی گلی میں یا کسی دوسرے کوچے میں یا کسی بازار میں۔ کیونکہ اس وقت شکل و صورت سے ہر جگہ ایک سی تھی۔ گرتے ہوئے مکانوں کے جلتے ہوئے ملبے نے زمین پر ہر راستہ روک رکھا تھا۔ اور زمین سے اوپر صرف آگ ہی آگ تھی۔

آنند ہر چہار طرف کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس ایک سی چیخ و پکار کے درمیان وہ ایک خاص آواز سننے کے لئے اِدھر سے اُدھر بھاگتے ہوئے لوگوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا۔ اور اُسے کچھ علم نہ تھا۔ کہ وہ کہاں پہنچ گیا ہے ایک روتا ہوا بچہ اس نے کہیں سے اٹھا لیا تھا۔ اور اُسے گود میں اٹھائے وہ اِدھر سے اُدھر بھٹکتا رہا۔

پھر اچانک گولیاں چلنے کی آواز آنے لگی۔ اور پھر "رک جاؤ۔ رک جاؤ" کی آوازیں۔ جنھیں سن کر تمام لوگ ٹھٹھک گئے۔ بعد میں اُسے پتہ چلا۔ کہ اس وقت وہ شاہ عالمی کے بڑے بازار میں تھے اور مسلمانوں کا ایک

... جنفا عین ان کے سامنے پہنچ چکا تھا - اور عنقریب تھا کہ بے تحاشا بھاگتے ہوئے وہ سب لوگ نہایت آسانی سے اُس جنفے کا شکار بن جاتے کہ ڈوگرہ رجمنٹ کی ایک گارد نے موقعہ پر پہنچ کر حملہ آوروں پر گولیاں برسانی شروع کر دیں -

ازاں بعد وہی گارد ان سب لوگوں کو اپنی حفاظت میں ایک ریلیف کیمپ تک چھوڑ گئی - اور اسی کیمپ میں پہنچ کر اُسے پتہ چلا کہ ان کے محلے کے ڈیڑھ سو آدمیوں میں سے کل بیس آدمی بچ کر اس کیمپ میں پہنچے تھے جن میں صرف تین عورتیں تھیں - اور ایک بچہ - باقی لوگوں کا کیا حشر ہوا - اس کے متعلق مختلف لوگوں کی زبانی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چند خبریں مل سکی تھیں -

☆ ☆ ☆

آنند نے ان ٹکڑوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتے ہوئے باقی ماندہ رات اُن لوگوں کے بارے میں سوچتے ہوئے بتا دی - اجیت مرحوم کے ماں باپ نکل آئے تھے - لیکن کئی آوازیں دینے کے باوجود اس کی بیوی نیچے نہ اتری تھی - اور ایک بوڑھے نے صرف اتنا دیکھا تھا - کہ جس وقت ان کے مکان کی نچلی دونوں منزلیں جل رہی تھیں - وہ سب سے اوپر کی منزل میں چند ٹرنک کھولے کناری والے ریشمی کپڑے نکال نکال کر ایک دوسرے کے اوپر پہنتی جا رہی تھی - دلہن بن کر پہلی مرتبہ سسرال کے کوچہ میں داخل ہوتے ہی جب اس نے گھونگھٹ کے

متعلق وارث شاہ کا یہ مصرعہ سنا تھا کہ "وارث شاہ نہ دبیئے موتیاں نوں تے پھل اگ دے وچ نہ ساڑیئے نی" ،، اور اسے خراج تحسین ادا کرتے ہوئے مسکرا کر شانتی بھر کے لئے گھونگھٹ کے پٹ کھول دیئے تھے۔ تو اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن واقعی اُسے اپنا پھول جیسا حسن آگ میں پھونک دینا پڑے گا۔ پھر اس کی بیوگی میں بھی جو اس کا قدردان تھا۔ اور جس نے ایک دن پنجاب کے تمام مسلمانوں پر ایک ایٹم بم پھینکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ پرکاش اپنے تمام ولولے دل میں لئے ایک گرتے ہوئے مکان کے نیچے دب گیا تھا

نارا چند ان کے ساتھ ہی بچ کر کیمپ میں آ گیا تھا۔ لیکن اس کی بیوی اور چار بچے آگ سے بچنے کے لئے اوپر کی منزل سے ساتھ والے مکان پر کود گئے تھے۔ جو بہت نیچا تھا۔ لیکن انھیں یہ علم نہ تھا کہ وہ مکان بھی اندر ہی اندر مکمل طور پر جل چکا تھا۔ چنانچہ ان کے کودتے ہی وہ چھت گر گئی۔ اور اس کے بعد ایک وسیع آگ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ آنند کو اس کی اس دن والی باتیں یاد آ گئیں۔ جب اس نے بتایا تھا۔ کہ وہ گزشتہ چھ مہینوں میں ایک رات بھی اپنے بچوں کے پاس گھر میں نہیں سویا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ جن کی حفاظت کے لئے اُس نے نصف سال تک اپنی ہر طرح کی خواہش اور آرام کو تلانجلی دے رکھی تھی۔ وہی آج نہیں تھے۔ اور وہ ... کیا اب وہ آرام سے اپنے گھر سو سکے گا؟۔

اس تباہی نے کئی آپسی جھگڑے مٹا دیئے تھے۔ پتہ چلا تھا۔ کہ وہ گریجویٹ کلرک اور وہ لڑکا جس نے اُس روز زبردستی روکنے کے لئے اُسے

زخمی کرنے سے بھی دریغ نہ کیا تھا۔ ایک دوسرے کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے مسلمانوں کے نرغے میں پھنس گئے تھے۔ ان کی لاشیں ایک دوسری سے بغلگیر حالت میں دیکھی گئی تھیں۔ اور دونوں کے خون نے زمین پر ایک ہی دھار بنائی تھی۔ لیکن اس کلرک کی بیوی بچ گئی تھی۔

وہ تمام بوڑھے جنھیں اس روز شمس دین کے مکان کے ساتھ اپنا بچپن جلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے بڑھاپے سمیت ختم ہو گئے تھے۔ صرف ایک بوڑھا بچ سکا تھا۔ جو اس روز کی طرح آج بھی اس کلرک کی بیوی کو گھور رہا تھا۔ اس کیمپ میں پہنچنے سے پہلے کی اس کی گزشتہ ساری زندگی اس گلی اور بازار کے ساتھ جل گئی تھی۔ اور ساٹھ سال میں سے صرف ان چند لمحوں نے جو اس روز اس نے اس عورت کو دیکھتے ہوئے گزارے تھے اس کا ساتھ اس کیمپ تک دیا تھا۔ اور اس مبہم سے تعلق کے ساتھ وہ ایک لالچی کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ چنانچہ آنند نے اس وقت اسے قابل معافی سمجھا۔

ان کے ساتھ ایک ننھا سا بچہ بھی آیا تھا۔ جسے آنند اٹھا لایا تھا۔ یہ وہی بچہ تھا جسے ایک دن آنند نے نیلی پوپو کی فرمائش کرنے کے بعد خوشی سے گاتے ہوئے سنا تھا۔ آج ان میں سے ایک بھی نہ رہا تھا۔ جن سے وہ اپنی پیاری پیاری فرمائشیں کیا کرتا تھا۔ وہ حیرت سے اپنے چاروں طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ اور ایک معصوم سا سوال اس کی شفاف جھیلوں کی سی نیلی آنکھوں کی گہرائیوں میں تیرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سوال شاید اور کسی بھی زبان کے الفاظ میں اس خلوص اور درد کے ساتھ ادا نہ کیا جا سکتا تھا۔ جس طرح

اس کی خاموشی بیان کر رہی تھی۔ سیٹھ کشور لال کی گود میں بیٹھا ہوا وہ بچہ اُن سوالیہ نگاہوں سے ہر شخص کے چہرے کی طرف باری باری دیکھ رہا تھا۔ اور جب وہ دیکھتے دیکھتے تھک گیا۔ اور کسی نے اس کے اس خاموش سوال کا جواب پیش نہ کیا تو آنسوؤں کے دو قطرے اس کے گالوں پر لڑھک گئے آنند کو بے ساختہ ایک مصرعہ یاد آ گیا کہ "ان آنسوؤں کے ستارے بنائے جائیں گے"۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اگر ستارے اسی طرح حسین بنائے گئے ہیں تو انھیں بنانے والے کی بیداد واقعی قابلِ داد ہے۔

————— بچے کے ہاتھ میں کٹی ہوئی کانس کا بنا ہوا دو پیسے والا بین باجا ابھی تک اکڑا ہوا تھا۔

لالہ بنواری لال کے ہاں سے کوئی نہ بچا تھا۔ خود ان کا حشر تو کسی کو معلوم نہ تھا۔ لیکن ان کے ہاں کی عورتوں نے محلے کی اور کئی عورتوں کے ساتھ کنوئیں میں چھلانگ لگا کر اپنی عزت بچا لی تھی۔ لیکن اس وقت کملنی اپنی ماں کی چیخوں اور آوازوں کے باوجود گلی کے بیرونی حصے کی طرف بھاگ گئی تھی۔ جہاں سیٹھ کشور لال کا مکان تھا۔ اور بعد ازاں اسی بوڑھے نے ایک لپکتے ہوئے شعلے کی روشنی میں کملنی اور پرمن کو کنوئیں کی منڈیر پر ایک دوسرے کی چھاتی سے چمٹا ہوا دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد ایک "تھپ" سی آواز آئی تھی۔ وہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ انھوں نے کنوئیں میں چھلانگ لگائی تھی۔ یا کوئی جلتی ہوئی چھت ان پر آ گری تھی۔

دو بچے پریمیوں کی یاد اور ان کے اعزاز میں آنند کا سر جھک گیا۔ اسے

دنیا سے عشقِ صادق کے اس طرح چلے جانے کا بہت دکھ ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان پر رشک بھی آیا۔ کاش وہ بھی اسی طرح کسی کے سینے سے لگے لگے جل جاتا۔ اور عمر بھر کی ہجر و محرومی کی جلن سے چھوٹ جاتا۔ اُس وقت اس کی مجبوریوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اوشا کے متعلق کچھ جاننے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ لیکن سیٹھ کشور لال تو کیا کسی اور کے سامنے بھی وہ اس کا نام اپنی زبان پر نہ لا سکتا تھا۔ مبادا اس کے نتیجہ کے طور پر ان کے تعلقات کی پاکیزگی پر اثر پڑے۔ یا اُس حسنِ معصوم کی عزت پر کوئی حرف آئے۔ اور یہ وہ کسی قیمت پر برداشت نہ کر سکتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب کہ اس کا دل اُسے بار بار کہہ رہا تھا کہ ”میں جانتا ہوں یہ کہ اوشا بھی اس آگ میں ... “ اور ہر بار وہ دل کی آواز بند کر کے اُسے یہ فقرہ پورا کرنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ پناہ گزینوں کے اس جھرمٹ میں ہر ایک کو بظاہر خاموشی سے دیکھتا پھر رہا تھا۔ لیکن اگر کوئی اس وقت اس کی روح کی کھڑکیاں کھول کر اندر جھانک سکتا۔ تو دیکھتا۔ کہ وہاں محشر کے صورِ اسرافیل سے بھی بلند آواز میں کوئی صرف ایک نام کو پکار رہا تھا ... ”اوشا ... اوشا ... اوشا ... “

اس کے عین سامنے سیٹھ کشور لال اس بچے کو اسی طرح گود میں لئے بیٹھے تھے۔ بچہ اپنی بہن کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے سو گیا تھا۔ اور سیٹھ جی خاموشی سے اندھیرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ شروع سے اسی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ اور ان کی اس خاموشی سے آنند کو خوف آ رہا تھا۔ اس

میں اُسے کئی خطرے پنہاں نظر آنے لگے۔ جسے دیکھ دیکھ کر اس کا دل اپنا نقرہ مکمل کرنے کی کوشش اور بھی زور سے کرنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ بچاؤ کی اور کوئی صورت نہ دیکھ کر اس نے ہر لحظہ ڈوبتی ہوئی ایک موہوم سی امید کا سہارا لے کر اُن سے پوچھ ہی لیا۔

"سیٹھ جی۔ آپ نے کچھ نہیں سنایا، کہ کیا کچھ دیکھا"

کشور لال نے ایک بے حس انسان کی طرح اس کی طرف ٹھنڈی سی نگاہوں سے دیکھا۔ اور ایک اجنبی سی آواز میں کہنے لگا۔" میں نے جو کچھ دیکھا ہے۔ اس کے بعد اب مجھے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا —— کتنا اندھیرا ہے یہاں "۔ اور پھر جیسے ایک بار زبان کھلتے ہی اس کے بند کھل گئے۔ اور وہ کسی کے سننے یا نہ سننے سے بے نیاز سا خواب میں بولنے والے انسان کی طرح آپ ہی آپ کہتا چلا گیا :۔ یہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہاں کتنی روشنی تھی۔ اُف وہ روشنی۔ جب میں سیف سے زیور اور نوٹ نکال رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ کہ کوئی ڈاکو ہزاروں روشنیاں لئے بالکل میرے سر پر کھڑا ہے۔ اتنی روشنی تھی کہ میں ان نوٹوں کو کہیں بھی چھپا نہ سکتا تھا۔ نیچے سے اوشا اور اس کی ماں مدد کے لئے پکار رہی تھیں۔ لیکن میرے لئے نوٹوں کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ کئی مرتبہ کئی طریقے آزمائے۔ لیکن تسلی نہ ہوئی "۔ وہ لاشعوری طور پر چھاتی کے قریب کپڑوں کے اندر کچھ ٹٹولتا بھی جا رہا تھا :۔ آخر میں نے ایک پٹکے کی مدد سے انھیں اپنے جسم کے ساتھ باندھنا شروع کر دیا۔ لیکن ابھی تمام گٹھیاں سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ نچلا

دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا کہ ایک ہجوم دروازہ توڑ کر ہمارے اندر داخل ہو رہا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ بھاگ رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو دو چار مسلمان ٹانگوں اور بازؤں سے پکڑ کر زور سے جھلاتے ہوئے قریبی آگ میں پھینک دیتے۔ ایک دو کم عمر بچوں کو انھوں نے نیزوں پر ٹانگ لیا تھا۔ اور انھیں فتح کے جھنڈوں کی طرح اٹھائے پھر رہے تھے "

"تو پھر اوشا اور اس کی ماں — ؟" آنند نے کچھ اس طرح گھبرا کر پوچھا کہ اسے واجب نا واجب کا خیال تک نہ رہا۔

"اس وقت مجھ کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی۔ کہ میں ان کو ڈھونڈتا پھرتا۔ ہزار جلدی کرنے پر بھی نوٹوں کی کچھ گٹھیاں وہیں رہ گئیں۔ اور میں جو کچھ ہو سکا اُسے سنبھال سنبھول کر ایک پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ بھگوان جانے اوشا اور اس کی ماں کا کیا بنا ... " اس نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملنا شروع کر دیا۔

"سیٹھ جی آپ آنکھیں کیوں بھر رہے ہیں۔ آپ بھی مجبور تھے۔ اس وقت ایک ہی چیز تو بچا سکتے تھے آپ۔ اور پھر روپیہ بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا "

"ہاں — بیٹا۔ تم تو خود سیانے ہو۔ آخر روپیہ کس طرح چھوڑا جا سکتا تھا۔" انھوں نے خشک آنکھوں کو ملنا چھوڑ دیا تھا۔ اور اپنا ہمدرد پا کر اُسے ہمراز بناتے ہوئے کہنے لگے کہ "تمھیں سمجھو۔ یہ سارا پرپنچ آخر روپے ہی

سے تو ہے رجیب ٹھوس ہو۔ تو بیویوں کی کیا کمی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں نے کون سا پاپ کیا ہے ؟" وہ ساتھ ہی ساتھ اپنے ضمیر کو بھی صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن آنند وہ آخری بات کر کے بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے وہ کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے اب تک اپنے دل کو بھی جو فقرہ مکمل کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ وہ کشور لال نے کس آسانی سے ادا کر دیا تھا۔ سیٹھ کی آواز میں جذبات کی نرمی صرف اس وقت آئی تھی، جب اس نے ان نوٹوں کا ذکر کیا جو مجبوری کے عالم میں وہیں رہ گئے تھے۔

دور سے شہر میں آگ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اور آنند کی نگاہیں اسی طرف جم گئی تھیں۔ وہاں کیا کچھ نہیں جل رہا تھا۔ وہاں زندہ انسان جل رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ مردہ انسانیت بھی۔ وہاں سیٹھ کشور لال کے نوٹ جل رہے تھے۔ اور آنند کا عشق ——— سب کچھ جل رہا تھا۔ اور آنند سیٹھ کشور لال کے پاس بیٹھا ہوا دور سے تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ اس صورت میں سیٹھ اور اس میں کیا فرق رہ گیا ہے۔

" میرا ارادہ ہے کہ صبح اندھیرے ہی ہم ریس کورس روڈ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ وہاں رائے بہادر گنگا سنگھ کی کوٹھی ہے۔ سول لائن یقیناً محفوظ جگہ ہو گی۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟ "

آنند نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سیٹھ کے ایک ایک لفظ کے معنی جانتا تھا۔ وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ کہ یہ شخص اُسے وہاں تک صرف اپنی یا اپنے

روپے کی حفاظت کے خیال سے ساتھ لے جانا چاہتا ہے ورنہ آنند کے لئے رائے بہادر کی کوٹھی میں جگہ کہاں ۔ اُسے یہ بھی پتہ تھا کہ وہ اس کی خاموشی کے باوجود اس پر ہر ممکن زور اپنے ساتھ چلنے کے لئے ڈالے گا۔ اور اس کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ اس کی خاموشی سے متاثر ہوئے بغیر سیٹھ کشوری لال نے تھوڑی دیر کے بعد خود ہی پھر بات چھیڑی۔

" میرے وچار میں تو آپ بھی ضرور چلیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے لئے بھی وہاں جگہ ہو جائے۔ اور نہ ہو تو بھی سول لائن سے یہاں تک واپس آنے میں کوئی خطرہ نہیں "

آنند نے سوئے ہوئے بچے کے ہاتھ سے کانس کی بین جھپٹ کر چھین لی۔ اور اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے سیٹھ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

" آپ یہ بین کیوں نہیں بجاتے ——— سیٹھ جی —— "

اور تاریخ کی ابجد تک سے ناواقف سیٹھ نیرو سے اپنی اس تشبیہ کی طنز کو نہ سمجھ سکا۔ اور صرف اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ لیکن آنند یہ کہتے ہی جلدی سے اٹھا۔ اور ایک طرف کو چل دیا ۔۔ ...

اور پھر وہ چلتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ وہ پھر اپنے محلے میں پہنچ گیا۔

پانچواں باب

صبح قریب تھی۔ اور محلے کے ہر مکان سے گاڑھا دھواں آہِ مفلس کی طرح آسمان پہ جا رہا تھا۔ قریب قریب تمام مکان گر چکے تھے۔ پھر بھی کہیں کہیں کسی ادھ جلی چھت کی کڑی سے چند ننھے ننھے شعلے چمٹے ہوئے اس کے خون کے آخری قطرے چوسنے میں مصروف تھے۔

تپش سے آنند کا جسم جھلس گیا تھا۔ اور تپتی ہوئی اینٹوں پر سے گزرتے ہوئے اس کے پیروں کے تلوے زخمی ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ گرم گرم ملبے کے ڈھیروں پر سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ وہ وہاں

جانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے عشق نے آخری سانس لئے تھے۔ جہاں حسن پر دوانہ وار زندہ جل گیا تھا۔ وہ اپنے تاج محل کے کھنڈرات دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اس آگ میں جھلس جانے والی ایک معصوم روح کو اپنے آنسوؤں سے کچھ ٹھنڈک پہنچانا چاہتا تھا۔

چند مقامات سے ادھ جلے گوشت کی بدبو آرہی تھی۔ لیکن اندھیرے اور دھوئیں کے باعث کوئی لاش دکھائی نہ دے رہی تھی۔ نہ کوئی زندہ آواز ہی کسی بھی طرف سے آرہی تھی ——— سب مر گئے تھے۔ یا راکھ ہو چکے تھے۔ البتہ صرف ایک جگہ آنند کا ایک پیر کسی ملائم کیچڑ میں پڑا۔ تو ہلکی سی "چاؤں" کی ایک دردناک آواز اس ہولناک خاموشی کو تیر کی طرح چیر گئی۔ اُس نے تپتی ہوئی اینٹوں کی مدھم روشنی میں غور سے دیکھا۔ تو وہ ان کی گلی کا محافظ کتا تھا۔ آگ سے اس کی جلد بالکل جل گئی تھی۔ اور اب وہ صرف پلپلی چربی کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ جس میں بدقسمتی سے ابھی جان باقی تھی۔

اس نے سوچا کہ اب حالت میں اس کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ لیکن اُسے اپنے ہاتھوں مار ڈالنا بھی تو اس کی طاقت میں نہ تھا۔ اس میں ایک کتے کو بھی قتل کرنے کی جرات نہ تھی۔ اور کچھ دیر کے لئے تو اُسے ان لوگوں کی ہمت پر رشک آنے لگا۔ جو بڑی آسانی سے انسان کو کاٹ پھینکتے ہیں، اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زندگی مسلسل کرب و اذیت ہی کا نام ہو۔ جس علاج صرف اُسے قتل کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔

کتا ایک بار ہی "چاؤں" کر کے چپ ہو گیا تھا۔ اور اب وہ چربی کا ڈھیر

کچھ اس طرح بل کھا رہا تھا جیسے کوئی انتہائے کرب میں اپنے جسم کو مروڑ رہا ہو۔ آنند نے اپنے تاج محل کے کھنڈرات پر بہانے کے لئے جو آنسو اب تک روک رکھے تھے۔ وہ اس کتے کی حالت پر بہہ نکلے۔ اور وہ کچھ اس طرح رویا۔ کہ بالآخر جب وہ اپنے اس تیرتھ پر پہنچا۔ تو وہ ایک برسی ہوئی بدلی کی طرح بالکل لٹ چکا تھا۔

سیٹھ کشور لال کی عالیشان بلڈنگ کی جگہ اب ادھ جلے ملبے کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ سب سے نچلی منزل کی تمام چھتیں گر چکی تھیں۔ لیکن چار پانچ فٹ اونچی دیواریں ابھی کھڑی تھیں جن سے یہ پتہ چل سکتا تھا کہ یہاں ان کی بیٹھک تھی۔ یہاں آنگن تھا یا ڈیوڑھی۔ ہاں صرف ڈیوڑھی کی چھت باقی رہ گئی تھی۔ لیکن اس پر بھی اس قدر ملبہ گرا ہوا تھا۔ کہ ہر لحظہ اس کے گر جانے کا احتمال تھا۔

آنند اس جلتے ہوئے ڈھیر میں گھس گیا۔ اور ابھی تک سلگتی ہوئی شہتیروں پر سے پھاندتا ہوا اِدھر سے اُدھر پھرنے لگا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اُسے کس خاص مقام کی تلاش ہے۔ ایک ناامیدی کے سہارے وہ اس تاریکی میں جسے چند سلگتے ہوئے کوئلوں نے اور بھی تاریک کر دیا تھا اِدھر سے اُدھر پھرتا رہا۔

"...... وہ کہاں تھی۔ یا کم از کم اس کی راکھ کہاں تھی ...." وہ شاید یہی جاننا چاہتا تھا۔ اُس نے ملبے کے ایک ڈھیر سے چند اینٹوں کو ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہاتھ جل گئے۔ اور وہ ڈھیر پھر بھی

اتنا ہی ٹہا رہا۔

بالآخر وہ اس ڈیوڑھی کے اندر چلا گیا۔ اس میں سے اوپر جانے والی سیڑھیوں میں سے تین چار سیڑھیاں ابھی باقی تھیں۔ وہ ان پر بھی چڑھ گیا۔ اس کا دماغ دھندلایا ہوا سا تھا۔ اور اسے کیا کرنا ہے۔ اس کوئی واضح تصویر اس کے ذہن میں نہ بن رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اسی کیا کروں کیا نہ کروں کی حالت میں آخری سیڑھی پر جا کر بیٹھ گیا۔

سامنے وہی ڈیوڑھی تھی۔ جس کا بڑا دروازہ مسلمانوں نے توڑ دیا تھا۔ یہی وہ مضبوط دروازہ تھا۔ جو آنند اور اوشا کے درمیان ہمیشہ حائل رہا۔ یہ دروازہ ہمیشہ اس کے لئے بند رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی تھی۔ امارت کا وہی دروازہ جسے وہ کھلے بندوں ایک بار بھی نہ کھول سکا تھا۔ آج ٹوٹا پڑا تھا اور اسے اندر آنے سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن وہ صبح بہار کہاں تھی۔ کاش آج وہ بھی۔ ... ...

اور آگ سے بھرے ہوئے ان کھنڈروں کے درمیان بیٹھے ہوئے اُسے وہ طویل لمحات یاد آ گئے۔ جو اس نے سردیوں کی ایک اندھیری رات کو اسی ڈیوڑھی میں اوشا کا انتظار کرتے ہوئے بتائے تھے۔ وہ زور زور سے دھڑکتے ہوئے لمحات جن میں تیکھے کانٹوں کی ایک مسلسل سی چبھن پوشیدہ تھی، لیکن جن میں اس چبھن کے باوجود ایک لذت تھی۔ آج نہ وہ چبھن تھی نہ وہ امید کی لذت۔

اس رات دو مرتبہ دروازہ کھلنے کا کھٹکا ہوا تھا۔ اور اس نے بالائی

منزل پر کسی کے پیروں کی آہٹ سنی تھی۔ جن کے نپے تُلے انداز کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ لیکن دونوں مرتبہ کسی کے جاگ جانے سے اوشا کو واپس اپنے کمرے میں لوٹ جانا پڑا تھا۔ لیکن اس ناکامی میں مایوسی نہ تھی۔ بلکہ آئندہ بہتر مواقع ملنے کی امید نے مشرق میں ایک کافوری قندیل جلا رکھی تھی جس کی روشنی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

اس رات صبح کاذب کے اُجالے کو۔ جب اس نے شب کی سیاہ زلف کو یوں سر کرتے دیکھا تھا تو اُسے یقین ہو گیا تھا کہ آہ کو صرف ایک رات چاہئے اثر ہونے تک ــــــ لیکن آج وہ یقین کہاں تھا۔ وہ اثر کہاں تھا آج اُس نے ان شعلوں کی روشنی میں دیکھا کہ وہ ایک رات جس میں آہ کو اثر ہونا تھا۔ وہ تاریک رات اس کی زندگی سے بھی طویل تر ہے۔ سردیوں کی اس رات میں انتظار اور امید کی گرمی تھی۔ لیکن آج اس رقص شرر نے گرمیٔ بزم کو بالکل ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اے کاش یہ شعلے اس شمع عشق کو یوں ٹھنڈا نہ کر دیتے۔ پھر خواہ اُسے زندگی بھر محض انتظار ہی کرنا پڑتا۔ لیکن اس میں امید کی گرمی تو ہوتی۔ انتظار کے ان تیکھے کانٹوں کی چبھن میں جو لذت تھی۔ وہ تو اس سے نہ چھنتی۔ اے کاش ....

اور وہ اپنی محبت کے مزار پر بیٹھا اس شمع کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔ جسے جلنے کی بھی اجازت نہ دی گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ جب ہزاروں مکان اور ان میں بسنے والے انسان اور انکی انسانیت کو اس آزادی سے جلنے کی اجازت ہے۔ تو پھر اس ایک ننھی سی شمع کو بھی کیوں نہ جلنے

رہنے دیا گیا ... ...

☼ ☼ ☼

اچانک اس کے کانوں میں باہر سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ کوئی سسکیاں بھر رہا تھا۔ اور بھگوان کو پکار رہا تھا۔ آنند تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

اس نے باہر آکر دیکھا۔ کہ لمبی داڑھی والا ایک آدمی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے کچھ کہہ رہا ہے۔ آنند آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ لیکن آنسوؤں کے دروازے کھلے ہیں۔ دو ندیاں تھیں جو اس کی آنکھوں سے پھوٹ کر سفید داڑھی کی جڑوں میں کھو رہی تھیں۔ آنسوؤں کے چند قطرے موتیوں کے دانوں کی طرح داڑھی پر سے لڑھکتے جا رہے تھے۔ اُسے جو کچھ کہنا تھا۔ شائد کہہ چکا تھا۔ چنانچہ اب وہ بالکل خاموش تھا۔ اور اس عرصہ میں اس کا سر جھک گیا تھا۔

"کیا تمہارا بھی کوئی مر گیا ہے بابا۔" آنند نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد پھر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اس کی نگاہیں آنسوؤں میں سے تیرتی ہوئی آنند تک پہنچیں اور پھر واپس ان ہی گہرائیوں میں غوطہ مار گئیں۔ حتیٰ کہ پھر سے ان آنکھوں میں آنسوؤں کے اُبلتے ہوئے چشموں کے سوا کچھ نہ رہا۔

"یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کے سوا باقی سب مر گئے ہیں۔" اس کی

آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"پھر بھی تم مجھ سے بہتر ہو۔ کہ ان مرنے والوں کے لئے رو تو رہے ہو"۔ آنند نے قریب ہی جلتی ہوئی ایک شہتیر کی طرف تاپنے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ۔ میں رو بھی کیوں نہیں سکتا"۔

بوڑھے نے جواب دیا: "میں ان مرنے والوں کے لئے نہیں روتا بلکہ انھیں مارنے والوں کے لئے روتا ہوں۔ جنھوں نے ہندوؤں کو اس طرح قتل کر کے اسلام کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ مجھے اس آگ میں اپنے مذہب کی روح جلتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ اے کاش۔ یہ دیوانے جان سکتے۔ کہ وہ کیا کر رہے ہیں"۔

بوڑھے کی بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ کہ اچانک باہر سے ایک شور اٹھا۔ کچھ آدمی جوشیلے نعرے لگاتے غالباً اسی طرف آ رہے تھے۔ بوڑھے نے فوراً آگے بڑھ کر آنند کے شانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم ہندو ہو؟"

"ہاں۔" آنند نے چونک کر جواب دیا

"تو فوراً اس ڈیوڑھی میں جا کر چھپ جاؤ"۔ اس نے کشوری لال کی ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس ڈیوڑھی میں تو اب میرے لئے کچھ نہیں رہا۔ میں یہیں بہتر ہوں"۔ اور آنند پھر نہایت بے نیازی سے آگ تاپنے لگا۔

بوڑھے نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ لیا۔ اور اسے قریب قریب

گھسیٹتا ہوا اس ڈیوڑھی کی طرف لے گیا۔

"بیوقوف مت بنو۔ یہ قیمتی جان اس طرح گنوانے کے لئے نہیں ہے"

آنند ہنس دیا۔" شاید میری جان قیمتی ہی ہو۔ لیکن میں اب اسے موت کے عوض بیچ سکتا ہوں۔ بڑے میاں"

بوڑھا ڈیوڑھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپ گیا تھا۔ اُس نے آنند کو ایک آڑ میں کھڑا کرتے ہوئے کہا " تم نہیں جانتے کہ خدا نے تمھیں کس کام کے لئے میرے پاس بھیجا ہے" اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ باہر نکل آیا۔ نکلتے ہوئے آنند نے اُسے اپنے چغے کے اندر سے ایک چمکتا ہوا خنجر نکالتے دیکھا۔ اور وہ کئی طرح کے شکوک دل میں لئے وہاں کھڑا رہا۔

چند ہی لمحوں میں کوئی بیس پچیس نوجوان وہاں پہنچ گئے۔ بوڑھے کے قریب پہنچتے ہی ایک آواز آئی۔

"کہو مولینا۔ کیا سب کچھ ٹھیک طرح سے جل گیا"

"ہاں بیٹا۔ بالکل جل گیا" مولینا کی آواز میں بڑا استقلال تھا۔

"کوئی کافر ادھر ادھر چھپا ہوا تو نہیں"

"یہی تو میں دیکھتا پھر رہا ہوں۔ لیکن وائے بدقسمتی کہ میرا خنجر ابھی تک سفید ہے"

پھر مجمع میں سے کسی نے پکارا " بوڑھے مولینا" ـــــ اور باقی سب نے ایک پرزور نعرہ لگایا "زندہ باد"

وہ لوگ جا رہے تھے کہ مولینا نے پیچھے سے آواز دی ـــ "اگر کوئی

دکھائی بھی دیا۔ تو اس آگ میں شاید اس کے قریب نہ جا سکوں۔ اس لئے ایک نیزہ مجھے بھی دیتے جاؤ"۔

جواب میں فوراً دو تین نوجوانوں نے اپنے نیزے پیش کر دیئے اور مولینا نے ان میں سے سب سے جوشیلے لڑکے کا نیزہ لے لیا۔ پھر "بوڑھے مولینا زندہ باد" کا ایک اور نعرہ بلند ہوا۔ اور وہ لوگ آگے نکل گئے۔

آنند جب باہر نکلا تو مولینا اس نیزے کو توڑ کر ایک جلتے ہوئے مکان میں پھینک رہے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے پھر آسمان کی طرف بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تیری طاقت میں تو یہ بھی ہے۔ کہ تو گناہ کے ان سب ہتھیاروں کو اسی طرح جلا دے۔ پھر بھی تو کیوں خاموش ہے"۔

آنند کو دیکھتے ہی اس نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ اور اس کا بازو تھام کر کچھ کہے بغیر اسے اپنے ساتھ سامنے والی مسجد میں لے گیا۔ اور اسے ایک ٹاٹ پر بٹھا کر خود اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں جب وہ ایک گٹھڑی سی اٹھائے باہر نکلا۔ تو اس نے آنند کو بے اختیار ہنستے دیکھا۔

"تم اس طرح کس بات پر ہنس رہے ہو" اس نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ کی اس نیزے والی حرکت پر" آنند نے طنزیہ انداز میں کہا "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ خالص جھوٹ بولنے کے بعد حاصل کئے گئے اس ایک نیزے کو جلا کر آپ نے گناہ کی طاقتوں کو کمزور کر دیا ہے؟"

"بظاہر تمھارا اعتراض صحیح ہے" مولینا نے بڑے تحمل سے جواب دیا "لیکن میرے عزیز۔ یاد رکھو کہ نیکی کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ نیکی کا معمولی سے معمولی کام بھی نا حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ قرآن حکیم نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ "جس نے ایک زندگی کو بچایا۔ وہ ایسا ہی ہے۔ جیسے اُس نے ساری دنیا کی زندگی کو بچایا۔"

"یہ مسلمانوں کے لئے سچ ہوگا مولینا۔ ورنہ میں نے تو سنا ہے کہ ہندوؤں کو مارنا آپ کے ہاں جہاد میں شامل ہے"

"یہ ان لوگوں کی بھول ہے جو مذہب کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ ورنہ ایک حدیث میں تو آنحضرت نے واضح طور پر فرمایا ہے۔ کہ اگر کوئی مسلمان کسی بے گناہ نامسلم کا خون کرے گا۔ تو قیامت کے دن میں اس نامسلم کا ساتھ دوں گا۔ اور قاتل کے خلاف شہادت دوں گا۔"

اچانک ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹائم پیس کا الارم زور سے بج اٹھا۔ مولوی صاحب بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ الارم کو بند کیا۔ اور باہر جا کر جلدی سے وضو کر کے مسجد کے چھوٹے سے منبر پر چڑھ گئے اور اذان دینے لگے۔

"اشہد ان لا الہ الا اللہ ... "

ان کی آواز کتنی میٹھی تھی۔ آنند کو زندگی میں پہلی دفعہ آواز کے جادو کا احساس ہوا۔ وہ ان الفاظ کے معنی نہیں سمجھ سکا۔ اور نہ اس نے اس کی ضرورت ہی محسوس کی۔ اس آواز میں اس قدر پُر خلوص جذبات موجود تھے۔ کہ وہ خود ہی

ان الفاظ کے معانی کی غمازی کر رہی تھی۔

وہ ان کی آواز کے جادو میں کھویا ہوا چپ چاپ سنتا رہا۔ حتیٰ کہ "حیّ علی الفلاح" کی صدائے مکرر کے بعد مولینا منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جلدی سے نکلے۔ اور آہستے ہی آنند سے کہنے لگے۔

"اب ہمارے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ ابھی کوئی نمازی آتا ہوگا چنانچہ تم جلدی سے اس گٹھڑی میں سے ایک شلوار نکال کر پہن لو۔ اور میرے ساتھ چلو"

"لیکن ...."

"لیکن ویکن کا وقت نہیں ہے میرے عزیز۔ تین معصوموں کی جان سے بھی عزیز شئے خطرے میں ہے" مولینا نے آنند کو بولنے تک کا موقعہ نہ دیا۔

جب تک آنند نے شلوار پہنی۔ مولینا محراب کے ایک طاقچے سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز اٹھالائے۔

☼ ☼ ☼

باہر نکلتے ہی انھیں پولیس کا ایک چھوٹا سا دستہ ایک شخص کو گرفتار کر کے لے جاتا ہوا ملا۔ ایک سپاہی نے مولینا کو سلام کیا۔ اور ان کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ کہ اس شخص کے پاس سے ایک بھرا ہوا ریوالور برآمد ہوا تھا۔

پولیس کا دستہ آگے نکل گیا۔ لیکن آنند کے پاؤں گویا وہیں جم گئے

اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کوئی برقی رَو اس کے جسم کو سن کر گئی ہو۔ مولینا نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"یہ شخص مجھے ایک دن دنیا کا سب سے بڑا ہنسا دادی دکھائی دیا تھا۔ جس نے گھپ اندھیرے میں مجھے روشنی کا ایک راستہ دکھایا تھا لیکن یہ بھی آج ... مجھے یقین نہیں ہوتا"

مولینا نے اس کے شانے پر ہلکا سا ہاتھ رکھا۔ اور اُسے آہستہ آہستہ اپنے ساتھ چلاتے ہوئے بڑی سنجیدہ آواز میں کہنے لگے ——— "اس خونین ڈرامے کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے میرے عزیز۔ کہ وہ ناخدا جو کبھی ہزاروں لوگوں کو دامن تر ہوئے بغیر دریا پار کرا دیا کرتے تھے۔ آج نہ صرف اس طوفان میں خود بھٹک گئے ہیں۔ بلکہ شرکی ان طوفانی لہروں کی راہنمائی بھی کر رہے ہیں ... اور یہی سب سے بڑا المیہ ہے" اس کی آواز میں اس قدر گھرا درد تھا۔ کہ آنند کو یوں محسوس ہوا۔ گویا وہ مولینا اس ٹریجیڈی کا وہ مرکزی کردار ہو۔ جس کے تمام ساتھی مر گئے ہوں۔ لیکن خود جسے چاہنے پر بھی موت نہ آئی ہو۔

سلگتی ہوئی آگ اور سسکتی ہوئی عمارتوں میں سے گزرتے ہوئے انھیں مشرق میں بڑھتی ہوئی روشنی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ ہو رہا تھا۔ تاہم ابھی کسی آدمی کو چند قدم کے فاصلے سے پہچان لینا مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی مولینا کی رفتار اور گھبراہٹ روشنی کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂

آنند کو اس بات کا کچھ بھی ہوش نہ رہا کہ اس پراسرار سی مہم پر جاتے ہوئے وہ کیا کچھ سوچتا آیا تھا۔ کون کون سے خیالات اس وقت اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ وہ کوشش کر کے بھی انھیں پھر سے یاد نہ کر سکتا تھا۔ اس کی یادداشت پر تو صرف وہ ایک لمحہ نقش ہو کر رہ گیا جب اُسے یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے بادلوں سے مبرا نیلے آسمان میں بجلی کا ایک کوندا شہابِ ثاقب کی طرح اچانک کہیں سے لپک کر گرا ہو۔ اور پھر ساری فضا ایک گرتے ہوئے پہاڑ کی طرح گڑگڑانے لگی ہو۔ یہ وہ لمحہ تھا جب بوڑھے مولوی نے ایک شکستہ سے غار نما مکان کا دروازہ کھولا۔ اور اس کے کھلتے ہی سامنے اوشا ایک ستون سے بندھی ہوئی دکھائی دی۔

"ان تینوں لڑکیوں کو فوراً کھولو ——— جلدی کرو۔" اس گڑگڑاہٹ کے درمیان آنند کو مولینا کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔

پہلی سنسنی دور ہوتے ہی اس نے اچھی طرح مل کر اپنی آنکھوں کا چندھیاپا دور کیا۔ تو اس نے دیکھا کہ واقعی دو اور لڑکیاں بھی ایک اور ستون کے ساتھ اسی طرح بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے منہ میں کپڑے ٹھنسے ہوئے تھے اور وہ کچھ اس طرح ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کہ اُسے وہ کوچوان یاد آگیا۔ جو چھرا لگنے کے بعد تانگے کے پائیدان سے اٹک کر اپنے اوپر بزدل چھرا گھونپنے والوں کی طرف صرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہہ سکا تھا۔

وہ بھاگ کر اوشا کے قریب گیا۔ اور اس کے گرد بندھے ہوئے رسّے پر بے تحاشا جھپٹ پڑا۔ ہاتھوں سے، دانتوں سے اور ہر طرح سے

اُس نے اُسے کاٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت اس کے ہاتھ کچھ اس طرح ناکارہ ہو گئے تھے۔ گویا اوشا کے نہیں بلکہ اس کے اپنے ہاتھ اس رسے سے جکڑے ہوئے تھے۔ جن کی ہر حرکت اس رسے کو پھانسی کے پھندے کی طرح اور بھی کس رہی تھی۔ وہ اس مایوس پنچھی کی طرح چھٹپٹا رہا تھا۔ جو اپنے کمزور پروں سے آہنی پنجرے کو توڑنے کی کوشش میں اپنے بال و پر زخمی کر بیٹھا ہو۔ لیکن پھر بھی پنجرے کی سلاخوں سے ٹکرائے جا رہا ہو۔

اس نے گھبراہٹ کے عالم میں گانٹھ کو کھولنے کی کوشش سے فوراً ہی مایوس ہو کر کانپتے ہاتھوں سے اس رسے کو توڑ ڈالنے کی کوشش کی۔ اور جب اس میں کامیاب نہ ہوا۔ تو اس نے زمین میں گڑے ہوئے اس ستون ہی کو اکھاڑ ڈالنے کے لئے زور لگانا شروع کیا۔ اور جب اس میں بھی ناکام رہا۔ تو اس نے ستون کو ایک زور کی ٹکر ماری اور پھر یک لخت جیسے وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اس ستون کے ساتھ لپٹ کر رونے لگا۔

اوشا اور دونوں لڑکیاں اسی طرح اُسے دیکھتی رہیں اور بس ——— نہ وہ ہاتھ ہلا سکتی تھیں نہ زبان ——— علاوہ ازیں یہ سب کچھ صرف چند ثانیوں میں ہو گیا تھا۔ اور شائد اتنے عرصے میں انھیں اس بات کا یقین بھی نہ آیا تھا۔ کہ نا فقی کوئی انھیں اس قید سے رہائی دلانے آ پہنچا تھا۔

آنند بچوں کی طرح ستون کے ساتھ لپٹ کر روتا رہا۔ حتیٰ کہ مولینا نے آگے بڑھ کر اسی خنجر کے ساتھ ان کی رسیاں کاٹ بھی دیں۔ لیکن وہ پھر بھی اسی طرح بلکتا رہا۔

رسیاں کٹ جانے پر کچھ دیر تک تو لڑکیوں کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آرہا تھا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہئے۔ اوشا اور دوسری لڑکیاں آنند کو اپنے قریب روتا دیکھتی رہیں۔ لیکن بولی کچھ نہیں۔ پھر انھوں نے مولینا کی طرف دیکھا۔ اور پھر ان کے سبز عمامے کی جانب ـــــ اور پھر اچانک نجانے انھوں نے کیا سوچا۔ کہ تینوں ایک ہی ساتھ دروازے کی طرف لپکیں۔ اور قریب تھا کہ وہ انجام سے بے پرواہ اس کھلے دروازے میں سے بھاگ کر باہر ہوجاتیں کہ مولینا نے کڑک کر کہا۔

"ٹھہرو"

جانے کیوں اس آواز نے جیسے انھیں پھر سے ان ہی رسیوں میں جکڑ دیا۔ اور وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئیں۔ مولینا نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ اور ان کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے۔ ان کی اس کڑک سے آنند بھی چونک پڑا تھا۔ اور وہ بھی جلدی سے ان کے قریب آگیا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کیا تمھیں میں اس لئے یہاں لایا تھا۔ کہ ان معصوموں کی مدد کرنے کے بجائے تم عورتوں کی طرح آنسو بہانے لگو"

آنند کے حواس پھر سے صحیح ہوگئے تھے۔ اس نے شرمندہ ہوکر کہا۔

"معاف کیجئے مولینا۔ دراصل آپ نہیں جانتے کہ ..."

"میں کچھ نہیں جاننا چاہتا سوائے اس بات کے کہ کیا تم میں اتنی ہمت اور جرات ہے کہ ان لڑکیوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا سکو"

اس کے جواب میں "ہاں" کہنے کے لئے جیسے آنند کا رواں رواں

زبان طلب کرنے لگا۔ حتیٰ کہ اس شورِ محشر کے بیچ اس کی اپنی زبان نے مولینا سے کیا کہا۔ اس کا اُسے کچھ ہوش نہ تھا۔

اسے صرف اتنا ہوش تھا۔ کہ وہ اوشا کو بار بار دیکھے جا رہا تھا۔ اور بس حتیٰ کہ وہ لوگ شہر کی چار دیواری کے باہر تک آ پہنچے۔ اُسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا۔ کہ مولینا انھیں کن راستوں سے چھپے چھپے اور جلدی جلدی وہاں تک لے آئے تھے۔ وہ جیسے یہاں تک خواب ہی میں چلا آیا تھا۔ اور اس خوابِ بیداری سے وہ اُس وقت جاگا۔ جب چار دیواری کے باہر ہوتے ہی مولینا رک گئے۔

ان کے رُکتے ہی آنند کا سلسلۂ خواب بھی ٹوٹ گیا۔ اور اچانک اُسے مولینا کی موجودگی، ان کی عظمت اور اس کارِ عظیم کی وسعت کا احساس ایک ساتھ ہو آیا۔ اور وہ مولینا سے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی بات سوچنے لگا۔ لیکن اس سے قبل ہی مولینا نے لڑکیوں کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ کہ

"جاؤ۔ خدا تمھاری حفاظت کرے گا"۔

"یہ میں نہیں مانتا"۔ آنند نے فوراً جواب دیا۔

"کیا"۔ مولینا نے حیران ہو کر پوچھا

"یہی کہ آپ اپنی عظمت کو خواہ مخواہ خدا کے سر تھوپ رہے ہیں۔ اگر آپ کا خدا ہی سب کی حفاظت کرتا ہے۔ تو وہ دیکھئے آسمان پر چھایا ہوا دھواں۔ اور اِدھر زمین پر بہنے والا خون بھی دیکھئے۔ خدا شاید ہی کچھ کر سکتا ہے

جو آپ نے کیا ہے۔ ایسا عظیم کام وہ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک انسان ہی کر سکتا تھا۔ چنانچہ ... ... "

"یہ کلمۂ کفر ہے میرے عزیز!" مولینا نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا
آنند ایک پرمعنی انداز میں مسکراتا ہوا کہنے لگا۔ "اگر آپ کفر سے اتنا ہی ڈرتے ہوتے۔ تو پھر آپ اذان دے کر خود نماز سے یوں نہ بھاگ آتے کیا آپ کے مذہب میں ... "

"تم میرا مذہب نہیں سمجھ سکتے" مولینا نے پھر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "صرف نماز ہی کا نام مذہب نہیں ہے۔ اور نہ انسان کو محض خدا کی حمد گاتے رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کام کے لئے ملائکہ اور فرشتے بہت تھے۔ انسان کو انسانیت کی خدمت کرنے اور خدا کی اس کائنات کو خوبصورتی، خوشی اور پیار سے بھرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور یہی اس کا حقیقی مذہب ہے۔"

کس قدر سادہ مذہب تھا۔ ہر طرح کے تکلفات سے پاک۔ آنند نے محسوس کیا۔ کہ یہی ہے وہ بنیادی اور بے ساختہ مذہب یا دھرم۔ جو دنیا کی ہر نیکی اور خوشی کا منبع ہے۔ وہ ننھا سا خوبصورت چشمہ جو دنیا کے بڑے سے بڑے مذہبی دریاؤں کو آبِ حیات عطا کرتا ہے۔ مال ایک ہی تھا۔ لیکن ہر مذہب کے دوکاندار نے اپنی اپنی قیمت بڑھانے کے لئے۔ اس پر طرح طرح کے تکلفات کی الگ الگ مہریں لگا رکھی تھیں۔ اور یہ سوچتے سوچتے اُسے وہ بوڑھا انسان پاکیزگی کی ان بلندیوں پر بیٹھا ہوا دکھائی دینے لگا جہاں

کسی بھی مذہب کی آلائش اُسے نہ چھو سکتی تھی۔ وہ مہادیو کے سر سے نکلنے والی گنگا کی طرح پوتر تھا اور ناقابلِ تسخیر۔

"لیکن یہ سوچنے اور سوال و جواب کا وقت نہیں ہے"۔ مولانا نے اس کے خیالات کی رَو کو پھر کاٹ دیا۔ "عمل کے لئے زندگی میں بہت کم فرصت ملا کرتی ہے۔ اپنی ذمہ داری کو سمجھو اور انھیں لے جاؤ۔ ریلیف کیمپ اب نزدیک ہی ہے۔ خدا تمھاری حفاظت کرے گا"

یہ کہتے ہوئے اس نے بغل سے نکال کر ایک چھوٹی سی گٹھڑی آنند کے حوالے کر دی: "اسے پچھلی گلی کے مندر سے میں بچالایا تھا"۔ اور کسی مزید گفتگو کی مہلت دیئے بغیر وہ جلدی سے پیچھے کو مڑا۔ اور چار دیواری کے اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

راستہ میں آنند نے گٹھڑی کھول کر دیکھا۔ تو اس میں بھگوان شری کرشن کی ایک چھوٹی سی سیاہ پتھر کی مورتی تھی۔ آنند نے دل ہی دل میں اس شخص کے حضور میں سجدہ کیا۔ جس نے جلتے ہوئے مندر میں سے اس مورتی کو بچا کر اپنا مقام اس مورتی سے بھی بلند تر کر لیا تھا۔ جس کا مذہب بت شکنوں اور بت پرستوں کے مروجہ مذاہب سے کہیں عظیم تر تھا۔

چھٹا باب

ریلیف کیمپ تک پہنچنے سے قبل اس نے اوشا سے کوئی بات نہ کی۔ دل میں ہزاروں باتیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن زبان پر جیسے تالہ پڑ گیا تھا۔ پھر بھی اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ سیٹھ کشوری لال یقیناً اپنے نوٹ بغل میں دبائے ریس کورس روڈ پر رائے بہادر کی کوٹھی میں چلا گیا ہو گا۔ چنانچہ کیمپ میں اوشا اسی کے سہارے ہو گی۔ اور پھر وہ اور اوشا ...

لیکن ہمیشہ کی طرح اس کا یہ خواب بھی بس خواب ہی ہو کے رہ گیا کیمپ میں داخل ہوتے ہی اس نے سیٹھ کشوری لال کو دیکھا۔ وہ ریس

کورس روڈ کے راستے ہی سے لوٹ آیا تھا۔ کیونکہ تھوڑی ہی دور جانے پر انھیں اس طرف سے کچھ ہندو پناہ گزیں چند فوجیوں کے ہمراہ اسی کیمپ کی طرف آتے ہوئے ملے تھے۔ وہ علاقہ بھی محفوظ نہ رہا تھا۔

سیٹھ صاحب نے جب بے حد جذباتی انداز میں اپنی لڑکی کو گلے سے لگایا۔ تو یہ جھوٹا ناٹک دیکھنے کی تاب نہ لاکر آنند خاموشی سے آگے نکل گیا۔ اور ایک اکیلے کونے میں آہنی جنگلے کے سہارے کھڑا رہ کر حواس باختہ سا دور کسی خلا کی طرف دیکھنے لگا۔

اسی طرح کتنا عرصہ بیت گیا۔ اُسے کچھ اندازہ نہ تھا۔ وہ اتنا عرصہ کیا دیکھتا رہا تھا۔ کیا سوچتا رہا تھا۔ اس کی وضاحت ناممکن تھی۔ ایک دھند سی تھی۔ جس نے اس کی نظر اور احساس دونوں کو دھندلا دیا تھا۔ اور کچھ بھی واضح نہ تھا۔ اُسے نجانے کیوں یہ محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہ دھند اس کے عشق اور اوشا کے حسن دونوں کو نگلے جا رہی تھی۔ اور وہ گھبرا کر جس قدر اس دھند سے باہر نکلنے کی کوشش میں چھٹپٹانے لگا۔ اسی قدر وہ دھند گاڑھی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھر جیسے اس دھند نے ایک ڈراؤنے آدمی کی شکل اختیار کر لی۔ جس نے ایک ہاتھ سے عشق اور دوسرے سے حسن کا گلا زوروں سے دبا رکھا تھا۔ اور جس وقت بھی وہ دونوں ننھی سی جانیں ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھاتیں۔ تو وہ دیو اور بھی زور سے ان کا گلا دبا دیتا۔ حتیٰ کہ وہ دونوں جانکنی کے عالم میں تڑپنے لگتے۔ اور اس پر وہ دیو اس زور سے قہقہے لگاتا کہ یوں معلوم ہوتا۔ جیسے اس کی آواز کے صدمے سے آسمان بھی نیچے آ رہیگا۔

اس نے ذرا غور سے دیکھا۔ تو اُسے اس دیو کی شکل سیٹھ کشور لال کی سی دکھائی دی
اس سے زیادہ دیکھنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ اور اس نے گھبرا کر اپنی نگاہیں
پھیر لیں۔ نگاہیں پھیرتے ہی اُسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مڑ کر دیکھا
تو وہی نیلی پوپو والا بچہ اسی طرح حیرت سے اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھے جا رہا تھا
وہ کب سے یہاں کھڑا تھا۔ جاتے ہوئے سیٹھ کشور لال اس بے سہارے
کو کس بے چارگی کے عالم میں چھوڑ گیا تھا۔ اور وہ آنند کا ہاتھ تھامنے کے لئے
اس وقت چپ چاپ اس کے پاس کیوں آ گیا تھا۔ جب کہ وہ خود بھی کشتی
ڈبو آنے والے ملاح کی طرح بے چارگی کے عالم میں تھا۔ آنند کو ان باتوں
کا جواب سوچنے کا دماغ ہی کہاں تھا۔ آنند اس وقت یاس کی اس حد پر تھا
جہاں ہر بات اور ہر واقعہ بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ گویا اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو وہ
ایک غیر قدرتی سی بات ہوتی۔

آنند نے لپک کر اُسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اور اُسے بے تحاشا چومنا
شروع کر دیا۔ بچے کی زبان خاموش تھی۔ لیکن اس وقت بھی اس کی شفاف
جھیلوں کی سی آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک معصوم سا سوال تیر رہا تھا۔ جو کسی
بھکاری کی طرح ہر دیکھنے والے سے ایک جواب کی بھیک مانگ رہا تھا

⁂ ⁂ ⁂

اس کے بعد جتنے دن وہ لوگ وہاں رہے۔ آنند نے اس بچے کو
اپنے پاس ہی رکھا۔ بلکہ جس قدر وہ اوشا سے اپنا آپ چھپانے کی کوشش کر رہا
تھا۔ اسی قدر وہ اپنے آپ کو جیسے اس بچے کی گود میں ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اسی

کے ساتھ سوتا۔ اسی کے ساتھ کھاتا۔ اسی کے ساتھ باتیں کرتا۔ اور اسی کے ساتھ کھیلتا۔

اوشا پر اس کا کیا اثر ہوا۔ اور اس کے یہ دن کس طرح بیتے۔ اس کا آنند کو کچھ علم نہ تھا۔ بلکہ اس نے بڑی کوششوں سے یہ سب کچھ نہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ اور اسی کوشش میں جس کی کامیابی کا خود اُسے یقین نہ تھا۔ اس کے دن بیت رہے تھے۔ اوشا کی اُسے اتنی ہی خبر تھی۔ کہ وہ بچہ اکثر دن کے وقت جب وہ خود ساتھی پناہ گزینوں کی کسی خدمت میں مصروف ہوتا تھا۔ اوشا کے پاس رہا کرتا تھا۔ چنانچہ رات کو وہ بستر میں لیٹ کر بچے سے روز یہ سوال پوچھا کرتا تھا۔ کہ

"تمھاری اوشا بہین جی کیسی ہیں"

"اچھی ہیں" وہ اپنی توتلی زبان میں جواب دیتا

"میرے بارے میں کچھ پوچھتی تھیں۔؟"

"نہیں۔"

اور اس کے بعد ہر روز وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا۔ وہ اکثر سوچا کرتا۔ کہ اس بچے کے ہاتھ اوشا کو کوئی سندیسہ بھیجے۔ لیکن ہر بار وہ کسی مصلحت کے پیش نظر دل پر پتھر رکھ لیتا۔ اُسے وہی دھند والا دیو یاد آ جاتا اور وہ اپنے آپ کو مصروف کرنے کے لئے ہاتھوں کا ایک نقلی بین یا جاننا کر بچے کو سنانے لگ جاتا۔ وہ اکثر سوچا کرتا۔ کہ اگر اوشا کی طرف اس کے ہاتھ بڑھانے سے اس بے چاری کے گلے پر اس دیو کی گرفت اور مضبوط ہو جاتی

ہے۔ تو وہ اپنے اس ہاتھ کو کاٹ ڈالے گا۔ لیکن اُسے بڑھنے نہیں دے گا۔

اسی طرح ارادے باندھتے، سوچتے اور پھر انھیں توڑتے ہوئے اس کے دن بیت رہے تھے۔ کہ ایک دن جب وہ اس بچے کے ساتھ دھوپ میں بیٹھا اپنے ہاتھوں کو منہ سے لگائے بین بجانے کی نقل کر رہا تھا تو وہ بچہ یک لخت تالیاں بجاتا ہوا اپنی مخصوص لے میں گانے لگا ——

" اوشا بیبن جی —— اوشا بیبن جی ... "

اور اس سے قبل کہ وہ مڑ کر دیکھتا۔ اوشا بہار کے پہلے پھول کی طرح اچانک اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی وہ کچھ اس طرح غیر متوقع طور پر آگئی تھی۔ کہ ایک مسرت آمیز گھبراہٹ کے عالم میں اُسے اتنا بھی نہ سوجھا کہ اُسے خیر مقدم کے لئے اٹھنا چاہیئے۔ یا کم از کم کوئی خوش آمدید کا کلمہ ہی ادا کرنا چاہیئے۔ البتہ وہ مصرعہ جو ہمیشہ اوشا کے آنے پر وہ دہرایا کرتا تھا لاشعوری طور پر اس کی زبان پر آ گیا۔ ع

" دیکھنا کیا ہوں وہ جانِ انتظار آ ہی گیا "

یہ شعر بلکہ ساری غزل ہی اوشا کو بے حد پسند تھی۔ لیکن آج اس نے جیسے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

" کیا آپ کل والے قافلے کے ساتھ نہیں چلیں گے "

پہلے تو آنند اس اچانک حملے سے قدرے بوکھلا گیا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور بچے کو اپنی گود میں اٹھاتے ہوئے اس نے بظاہر ہنس کر جواب دیا کہ۔ کیا یہ ضروری ہے۔ کہ میں بھی سب سے پہلے

بھاگنے والوں کے قافلے میں شامل ہو جاؤں۔ آخر سبھی تو کل نہیں جا سکتے۔

اوشا نے جیسے یہ جواب سنا ہی نہیں۔ اُسے شاید اس کا بھی ہوش نہ تھا۔ کہ اس نے بات چھیڑی کیسے تھی۔ وہ درحقیقت جو کچھ کہنے آئی تھی وہ جیسے اب اس کے روکے نہ رک سکا۔ اور زبان پر آ ہی گیا۔

"کیا تم مجھ سے اس لئے نفرت کرنے لگ گئے ہو۔ کہ مجھے مسلمان اٹھالے گئے تھے"

یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پڑی۔ اور مزید کچھ کہے سنے بغیر وہ منہ پھیر کر جدھر سے آئی تھی۔ تیزی سے ادھر لوٹ گئی۔ آنند جلدی سے اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ اوشا کا راستہ روک لیتا۔ اور اپنا کلیجہ چیر کر اسے دکھا دیتا۔ سامنے سے سیٹھ کشور لال آتے دکھائی دیئے۔ جسے دیکھتے ہی اس کے پاؤں جیسے پتھر کے ہو گئے۔

اوشا پلو سے آنکھیں پونچھتی ہوئی باپ کے پاس سے تیزی سے گزر گئی۔ آنند کی نگاہیں اس کا دامن تھامنے کے لئے اس کے تعاقب میں بھاگتی ہی رہ گئیں۔ اور درمیان میں سیٹھ کشور لال ایک اٹل شراپ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

آنند سر جھکائے ہوئے لوٹ آیا۔ اور پھر بچے کو جو اس کے یکلخت اٹھ کر بھاگنے سے زمین پر بری طرح گر گیا تھا اپنی گود میں اٹھا کر ادھر سے اُدھر بے چینی کے عالم میں گھومنے لگا۔ غالباً اسے یہ بھی احساس نہ تھا۔ کہ بچہ اس کی گود میں آ کر بھی رو رہا تھا۔ اس وقت شاید وہ کچھ بھی سن نہ سکتا تھا۔ وہ تو

کسی کو کچھ سنانا چاہتا تھا۔ لیکن سننے والا کوئی نہیں تھا۔

* * *

وہ رات اس نے نہایت بے چینی کے عالم میں گزاری

"کیا تم مجھ سے اس لئے نفرت کرنے لگ گئے ہو۔" یہ فقرہ زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح بار بار اس کے کانوں کو چیرتا ہوا اس کے دماغ میں جا کر جیسے کھب جاتا رہا۔

رات بھر اس کی زبان کسی سے ایک بات کہنے کو تڑپتی رہی۔ اور تڑپتی ہی رہ گئی۔ اُسے جانے کیوں اس بات کا یقین تھا۔ کہ جو اس کی انتہائی پرسکون دنیا میں ایک جلتے ہوئے سوال سے ہر چہار طرف آگ لگاتی ایک جانِ طوفان کی طرح اچانک داخل ہوئی تھی۔ اس کا جواب لینے کے لئے بھی اسی طرح کسی بھی لمحے وہ اچانک ایک قوس و قزح کی طرح نمودار ہو جائے گی۔ اور پھر وہ اسے اس طرح چلی جانے نہیں دیگا۔ وہ شرم و تکلف کے تمام پردے اتار کر سب کے سامنے اس کے پاؤں سے لپٹ جائے گا۔ اور تب تک اُسے جانے نہیں دے گا۔ جب تک اپنا دل نکال کر اسے نہ دکھا لے۔ لیکن انتظار طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ اور وہ جانِ انتظار نہ آئی

* * *

آخر صبح ہوئی اور اس صبحِ بہار کی روانگی کا وقت بہت قریب آگیا۔ وہ تب بھی نہ آئی۔ آنند کو یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے کوئی اس کا کلیجہ نکالے لئے جا رہا ہو۔ دل کی دھڑکن بیچ بیچ میں اس قدر تیز ہو جاتی تھی

کہ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ۔ یوں تو وہ اس خطرے سے اوشا کے نکل جانے پر خوش تھا ۔ لیکن وہ اُسے اس غلط فہمی کو دل میں لئے ہوئے چلے جانے کی اجازت نہ دے سکتا تھا ۔ وہ اس کے جانے سے قبل اسے کم از کم ایک بات کا یقین دلانا چاہتا تھا ۔ وگرنہ اس کے لئے ایک پل بھی آرام کرنے کی کوئی صورت نہ تھی ۔ اور اس بات کا اُسے یقین تھا کہ ایک بار جو بات وہ اپنے منہ سے کہہ دے گا ۔ اس پر اوشا کا ایمان نہ لے آنا ممکن ہی نہ تھا ۔ لیکن وہ بات کہنے کا اُسے موقعہ بھی تو ملتا ۔۔۔۔ ۔۔۔

آخر کار اس نے اور کوئی صورت نہ دیکھ کر آخری سہارا لینے کا فیصلہ کیا ۔ اور ایک چٹھی لکھ کر اس بچے کے ہاتھ میں دی کہ اوشا کو چوری سے دے آئے ۔ وہ جانتا تھا کہ بچے کی معصوم نادانی کے پیشِ نظر ایسا کرنا بہت خطرناک ہے ۔ لیکن آج معاملہ ہی اتنا سنگین تھا کہ اس نے اپنی اور اس سے بھی بڑھ کر اوشا کی عزت کو بھی داؤ پر لگانے سے دریغ نہ کیا ۔

اس خط میں کیا لکھا تھا ۔ اس کا ایک ایک لفظ عمر بھر کے لئے اس کے دل میں کچھ اس طرح کھب گیا ۔ گویا وہ پتھر کا نقش تھا ۔ جسے مٹانا آسان نہ تھا ۔

خط میں اُس نے ایک جگہ لکھا کہ " یہاں کا قانون یہی ہے اوشا کہ جس باپ نے اپنے روپے بچانے کی خاطر تمھیں اور تمھاری ماں کو آگ میں جھونکنے سے بھی دریغ نہ کیا ۔ وہی آج بھی تمھارا جائز وارث ہے ۔ اور میں جو تمھیں ڈھونڈنے کے لئے جلتی آگ اور چلتی تلواروں میں بھی چلا گیا تھا ۔ تمھیں نہیں پا سکتا ۔ کیونکہ اس کے پاس وہ روپیہ ہے جو اس سے

تمھاری قیمت پر بھی اپنے پاس رکھا۔ اور ہم میں سے کوئی بھی شیشے کی اس دیوار کو توڑ کر ایک دوسرے کے پاس نہیں جا سکتا۔

ہم میں اس دیوار کو توڑنے کی طاقت ہی نہ ہو۔ یہ بات بھی صحیح نہیں، بلکہ جیسا کہ ایک مرتبہ پہلے بھی میں نے تمھیں بتایا تھا کہ اس دیوار کے آس پاس ہمارے ملک اور سماج کی ہزاروں برسوں کی روایتوں نے لاج اور عزت کے شعلہ زبان کانٹے کچھ اس طرح بچھا رکھے ہیں کہ اگر کوئی اندھے جوش میں ان پر سے گزر بھی جائے تو اس کی ساری زندگی بدنامی کے زخموں سے چھلنی ہو جاتی ہے۔ اور میری محبت آج تک نہ اس قدر اندھی تھی۔ اور نہ خود غرض کہ میں تمھیں ان کانٹوں پر سے گھسیٹتا ہوا لے جاتا۔ میرے نزدیک عشق کے یہ معنی کبھی نہیں ہوئے۔

اس کے باوجود اس روز جب میں تمھیں وہاں سے لے کر آیا۔ تو میں نے سمجھا کہ شائد ——— کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا۔ لیکن یہ میری بھول تھی۔ میں نے جس بستی کا بسنا اتنا سہل سمجھ لیا تھا۔ وہ درحقیقت اس قدر آسان نہ تھا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ اس آگ کے دریا میں سے ڈوب کر گزر آیا ہوں۔ تو اب آنسوؤں کے موتی بن جانے کا وقت آگیا ہے لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ آگ وہ آگ تھی۔ جس سے نہ دل بہلے گا۔ اور نہ تیرگی شامِ غم ہی جائے گی۔

ان دنوں میں نے اکثر سوچا ہے۔ کہ اس آگ نے جہاں اتنا کچھ جلا دیا۔ کیا اس سے میرے جذبات کو جلا کر خاک نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس فسادمیں

جب اتنے لوگوں کے چھرا گھونپا گیا۔ تو کیا کوئی بھی ایسا مجاہد نہ تھا۔ جو
میری ایک ننھی سی امید کو بھی خنجر کے گھاٹ اتار دیتا۔ لیکن اس معاملہ میں
میں کتنا بدقسمت ہوں۔ اس کا اندازہ اسی بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس
روز جب مرنے کی امید لے کر میں اس جلتے مکان میں گھس گیا تھا۔ تو وہاں
بھی ناامیدی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ اور اب تو ناامیدی نے میری
زندگی کو چاروں طرف سے کچھ اس طرح گھیر لیا ہے۔ کہ اس سے فرار کی کوئی
صورت ہی دکھائی نہیں دیتی۔ صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی۔ اور وہ یہ
کہ اس ناامیدی ہی کو گلے لگا لوں۔ سو وہی کچھ کرنے کی کوشش میں ان چند
دنوں سے کر رہا تھا۔ لیکن میری یہ کوشش کس مضحکہ خیز حد تک کمزور تھی
اس کا صحیح اندازہ مجھے صرف اسی وقت ہو سکا۔ جب کل شام تم کسی برسانی
نالے میں اچانک آجانے والی طوفانی باڑھ کی طرح آئیں۔ اور اس ایک
ہی فقرے کی ٹھوکر سے میرے تمام خیالات، میرے تمام ارادے اور
عزائم اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔

میں نے سوچا تھا کہ عنقریب تم اپنے والد کے ہمراہ کسی دوسرے
شہر میں چلی جاؤ گی۔ جہاں ان کی دولت تمہارے لئے پھر سے عیش و آرام
کے تمام سامان مہیا کر دے گی۔ اور اس پر اگر میں کسی نہ کسی طرح کے جبر و
ضبط سے اپنے آپ کو تمہارے راستے سے الگ رکھ کر اس وقت تک
خاموش کھڑا رہوں۔ تو میری عدم موجودگی تمہیں شاید مجھے بھول جانے
میں مدد دے۔ اور اس طرح کم از کم تم تو اس روگ سے چھٹکارا پا جاؤ۔ جو

لاعلاج اور دائمی سا ہو کر رہ گیا ہے۔

چنانچہ یہی سوچ کر میں نے اپنی نگاہوں کو زنجیریں ڈال دی تھیں اور دل پر تالے۔ میں نے آنکھوں سے ان کا نور چھین لینے کی کوشش کی اور دل سے اس کا قرار۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اپنی کمزوریوں کا علم تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے دل پر وہ زخم کھایا ہے۔ جو کسی بھی صورت تمہیں دکھائے نہ بنے۔ لیکن اگر چاہوں کہ چھپاؤں تو چھپائے نہ بنے۔ چنانچہ میں نے تم سے مخالف سمت کی طرف بھاگ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تمہارا قافلہ مشرقی پنجاب کے محفوظ مقامات کو جا رہا تھا۔ اور میں نے مغربی پنجاب کے اندرونی حصے میں کھو جانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں زخمی انسانیت سسک رہی ہے۔ جہاں سکون اور شانتی کا قحط ہے۔ اور جہاں بھوک اور دہشت کا مارا ہوا انسان مدد کے لئے پکار رہا ہے۔

میں نے اور بھی کتنے ہی فیصلے کئے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اس شاعر کی طرح محض اپنی لاحاصلی پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنے دل کو یہ کہہ کر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی کہ ...... "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا"۔ وگرنہ تمہارا صرف ایک ہی فقرہ میرے تمام فیصلوں کو اس طرح چشم زدن میں ملیا میٹ نہ کر دیتا۔ اور میں اس طرح ایک مجبور و کمزور غلام کی طرح تمہارے قافلے کے ساتھ چلنے کی تیاری نہ کر رہا ہوتا۔

میں جانتا ہوں کہ میرا یہ اقدام اس لاعلاج مرض کو اور بھی خطرناک

بنانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ جس کے چنگل سے کم از کم تمہیں آزاد کرنے
کی تمنا میں نے ہمیشہ اتنی ہی شدت سے کی ہے۔ جتنی شدت سے تمہاری
تمنا کی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب اس قیامت میں بھی ہمیں ملنے
نہیں دیا گیا تو آئندہ کبھی "آپ جائے نہ بنے تم کو بلائے نہ بنے" والی
صورت حال میں بھی کوئی تبدیلی ہو گی۔ ایسی تمنا اب بھی کرنا محض فریب تمنا ہے
لیکن تمنا اور فریب تمنا میں عاشقی امتیاز کیا جانے ۔ یہی ایک بات ثابت
کرنے کے لئے میں نے اب اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا
ہے۔ تاکہ جس طرح کل تم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ کہا کہ "تم مجھ سے نفرت
کرتے ہو" اسی طرح ایک دن تم یہ کہنے پر بھی مجبور ہو جاؤ کہ "میں نے تمہیں
محبت میں اس طرح زندگی تباہ کر لینے کو کب کہا تھا" اور پھر جب یہ دیکھ کر
تم یہ بات بہت دیر سے کہنے آئی ہو۔ اور کہ اس کا وقت بیت چکا ہے تو
تمہاری آنکھوں میں پھر بے اختیار آنسو چھلک چھلک جائیں ... "

✲ ✲ ✲

خط لکھنے سے پہلے وہ بے چین تھا ہی۔ لیکن خط بھیجنے کے بعد
اس کی بے چینی دو گنی ہو گئی۔ کئی طرح کے وسوسے اور کئی طرح کے وہم اسے
پریشان کرنے لگے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ اور اس
پر قاصد کے لوٹنے میں دیر ہوتی جا رہی تھی ... ... اگر کہیں سیٹھ نے
راستے ہی میں اس سے وہ خط لے لیا تو ... ... ! اور پھر ایسا ہونے پر اگر
کہیں اوشا نے یہ سمجھ لیا کہ میں نے جان بوجھ کر اسے بدنام کرنے کے لئے

یوں کیا ہے تو ... ... ؟

اسی طرح کے کئی سوال اس کے دماغ کی سطح پر ابھرتے اور ہزاروں ننھے ننھے دائروں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ پیدا کرتے رہے۔ اور وہ قاصد کا انتظار کرتا رہا۔ دوسری کوئی مصروفیت بھی تو نہ تھی۔ جہاں تک اس قافلے کے ساتھ چلنے کی تیاری کرنے کا سوال تھا اس بے سروسامانی کے عالم میں وہ ہر وقت تیار ہی تیار تھا۔

آخر تنگ آکر وہ خود باہر نکلا۔ اور ڈرتا ڈرتا سیٹھ کے تمبو کی طرف جانے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دور جانے کے بعد وہ رک گیا۔ اگر اس کا خط پکڑا گیا ہو تو ... ... وہ کس منہ سے اس کمپ کے قریب تک جا سکتا تھا ... ... " اس طرف سے کچھ ہلکے سے شور کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ یا شاید یہ اس کا اپنا وہم تھا۔ بہر صورت اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اور وہ جلدی سے واپس اپنے خیمے کی طرف لوٹ آیا۔

اپنے خیمے کے پاس پہنچا۔ تو ان کی کمپ کمیٹی کا سکریٹری گھبرایا ہوا سا سیٹھ کے خیمے کی طرف جاتا ہوا ملا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے پوچھا "کیا تم کشور لال کے خیمے سے آرہے ہو۔"

آنند پر جیسے بجلی گری۔ اُسے یقین ہو گیا کہ آخر وہ پکڑا گیا ہے۔ احساس گناہ نے اس کی زبان بند کر دی۔ اور وہ ایک مجرم کی طرح اقبالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن آنکھیں شرما گئیں۔ اور اس

سے اس طرح بھی جرم محبت کا اقبال نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ اس نے آنکھیں بھی جھکا لیں۔

سکریٹری نے جانے کیا سوچا کہ وہ مزید کچھ پوچھے بغیر جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اور اس بات پر حیران ہو کر کہ وہ اُسے کچھ بھی سخت سست کہے بغیر کیوں چلا گیا ہے۔ آنند اُسے جاتے ہوئے دیکھنے کے لئے جلدی سے مڑا اور دیکھتا گیا ہے ——— کہ سامنے سے اس کا ننھا قاصد سر جھکائے چپ چاپ چلا آ رہا ہے۔ جیسے اُسے کسی نے مارا ہو۔

آنند نے فوراً آگے بڑھ کر اُسے شانوں سے پکڑ لیا۔ اور گھبرا کر پوچھنے لگا۔

"کیوں کیا ہوا۔ ؟"

لیکن اس لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اس کا خط اُسے واپس دے دیا۔

"کیا ہوا وہاں ؟ کیا تمہیں کسی نے مارا ؟ پھر تم یہ خط واپس کس طرح لے آئے ؟" آنند سوال پر سوال پوچھے جا رہا تھا۔ لیکن بچہ کوئی جواب نہ دے رہا تھا۔ وہ صرف اس کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ جن کی گہرائیوں میں ایک معصوم سا سوال تیر رہا تھا۔ شائد وہ سوال ہی اس کی سب باتوں کا جواب تھا۔

آنند کی طاقتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے

بچے کو نہایت بے دردی سے جھنجھوڑتے ہوئے تلخ تر آواز میں پوچھا۔

"تم بتاتے کیوں نہیں۔ کیا ہوا وہاں؟"

بچے نے آخر زبان کھولی۔ لیکن اس کی آواز برف کی مانند سرد تھی

"اد شا نجین بھی مر گئی ۔۔!"

"مر گئی؟ کس طرح؟" جیسے آنند نے اپنے آپ سے سوال کیا

"اس نے رات کو زہر کھا لیا"۔ بچے نے مختصر سا جواب دیا۔

تیسرا حصہ

میں بچ گیا

ساتواں باب

آنند ایک پرانا اخبار اپنی گود میں رکھے اُسے پڑھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن اخبار کے چھپے ہوئے سیاہ حرفوں کے اوپر ہی اوپر کئی رنگ برنگی تصویریں پناہ گزینوں کے کسی اُجڑے ہوئے قافلے کی طرح رینگتی چلی جا رہی تھیں — اس کی گزشتہ زندگی کی تصویریں۔ جن میں کہیں کہیں شوخ اور حسین رنگ ملتے تو تھے۔ لیکن وہ بھی جیسے اپنی حفاظت کی جگہوں سے باہر نکل آنے کے بعد باد و باراں کی زیادتیوں کے باعث آج بالکل پھیکے اور اُداس پڑ گئے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا یہی

اس کی زندگی بھر کی کوششوں کا انجام تھا۔ جیسے وہ عمر بھی اپنی کشتی حیات کو صرف اسی لئے کھیتا رہا تھا۔ کہ ایک دن وہ اس فساد کے طوفان سے ٹکرائے اور ڈوب جائے۔

ندی کے اس دھارے کی طرح جو سمندر میں پہنچ کر بھی کچھ دور تک اپنے آپ کو سمندر کے پانیوں سے الگ رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس نے اب تک اپنے آپ کو اس امید پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی کہ کہیں تو یہ طوفان ختم ہو گا۔ لیکن سمندر کا پاٹ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کا چشمۂ حیات ایک ایک لہر کر کے ان کھارے پانیوں میں کھویا چلا جا رہا تھا۔

اس فساد میں اس نے کیا کھویا تھا۔ اور کیا پایا تھا۔ اس کا صحیح اندازہ کون کر سکتا تھا۔ اس کے پاس دوسروں کی طرح لاکھوں روپے اور عالیشان عمارتیں نہیں تھیں۔ لیکن پھر بھی اس کا نقصان ان رئیسوں سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے زندگی کی تمام رونقیں کھو دی تھیں۔ اس نے انھیں کھو دیا تھا۔ جن کے دم قدم سے زندگی زندگی تھی۔ اس نے وہ سب کچھ کھو دیا تھا۔ جسے وہ کبھی اپنا سمجھتا تھا۔ اور اس عالمگیر قتل وغارت میں اس کے پاس بچی تھی صرف موت کی سی ویرانی اور محرومی اور ایک آہِ بے بال و پر جو موت کی سنگین دیوار سے سر پٹک پٹک کر اس لئے رو رہی تھی۔ کہ شاید اس کی آوازِ گریہ ہی دیوار کے اس پار کسی کے کانوں تک پہنچ سکے لیکن مرنے والے بڑے ظالم ہوتے ہیں ... ...

اور اسے شدت سے محسوس ہونے لگا کہ اوشا واقعی بڑی ظالم نکلی وفا کے نام پر اپنے آپ کو قربان کر کے اس نے موت کی تاریکی کو بھی ایک ابدی نور سے منور کر لیا۔ لیکن خود اُسے زندگی کے اُجالے میں بھی ان تاریکیوں میں دھکا دے گئی۔ جہاں ہر چہار طرف سے تیرگی امنڈتی ہی چلی آرہی تھی۔ جہاں اس کے تمام احساسات شل ہو کر رہ گئے تھے۔ حتیٰ کہ اس کی زندگی ایک ایسے صحرا کی طرح بالکل خشک ہو گئی تھی۔ جہاں ایک آنسو تک نہ برستا تھا۔ اور جہاں اوشا کی یاد بھی آنسوؤں تک کے خراج سے محروم ایک ہارے ہوئے بادشاہ کی طرح سر جھکائے داخل ہوتی اور مایوس ہو کر دل کے کسی تاریک کونے میں جا بیٹھتی۔

وہ سوچنے لگا کہ "اوشا بھلے ہی مرجاتی۔ لیکن اس سے قبل اسے صفائی کا ایک موقعہ تو دیتی۔ کم از کم اس کی وہ چٹھی ہی پڑھ جاتی۔ تو شاید اسے اس قدر دکھ نہ ہوتا۔ لیکن ... ... " اور اس کے ہاتھ نے جیب میں پڑی ہوئی اس چٹھی کو لاشعوری طور پر زور سے تھام لیا۔ جیسے کوئی اس سے وہ چھینے لئے جا رہا تھا۔

اس کی انگلیاں اس خط کے حروف کو جیسے ٹٹولنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اُسے وہ فقرے پھر سے یاد آ گئے جن میں اس نے اوشا کو تڑپانے کے لئے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ "جب تم یہ دیکھو کہ تم یہ بات بہت دیر سے کہنے آئی ہو۔ اور کہ اس کا وقت بیت چکا ہے۔ تو تمہاری آنکھوں میں بے اختیار آنسو چھلک چھلک جائیں۔ ... ... !" یہ الفاظ لکھتے ہوئے اس نے

تصور کیا تھا کہ انھیں پڑھتے ہی ادشا کس طرح تڑپ اٹھے گی۔ اور پھر کس طرح پہلا موقعہ ملتے ہی وہ خط لئے اس کے سامنے آجائے گی۔ اور ہمیشہ کی طرح ایک مختصر سا فقرہ اس کی زبان پر تڑپ جائے گا کہ "تمھیں ایسا لکھتے ہوئے شرم نہیں آتی" اور پھر اس کے آنسو تھامے نہیں تھمیں گے۔ حتیٰ کہ وہ اس کی آنکھوں کو چوم چوم کر ان کے آنسو پی جائے گا ... لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ جس وقت وہ یہ خط لکھ رہا تھا۔ اس وقت پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور ادشا اس سے بازی لے جا چکی تھی۔ اُسے یہ خبر نہ تھی کہ جس وقت وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا اُسے صرف ایک فقرے، اس ایک فریاد کے لئے طعنے دے رہا تھا جو اس کی روح کی گہرائیوں کو چیرتی ہوئی لبوں پر آگئی تھی۔ اس وقت ایک پھٹی ہوئی چادر میں لپٹی ہوئی ادشا کی لاش زبان حال سے پکار رہی تھی کہ "کفن سرکا ذ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ"

اور پھر آہستہ آہستہ یہ احساس اس پر چھانے لگا کہ ادشا ہی اس سے زیادہ ستم رسیدہ رہی۔ وہ مظلوم تھی ظالم نہیں۔ اسے آخری وقت میں ایک اچھا کفن بھی نصیب نہ ہوا۔ بلکہ ایک پناہ گزیں کی پھٹی ہوئی چادر میں لپیٹا گیا۔ اسے کاش اس نے حقیقی پہلے ہی بھیجی ہوتی۔ خواہ وہ اسے زہر کھا لینے کے بعد ہی ملتی تو بھی اس کی موت پرسکون تو ہوتی۔ اور کسی کی بے وفائی کی جلن اس کے بستر مرگ پر یوں کانٹے تو نہ بکھیرے رہتی۔ اُسے تو موت کے بعد بھی یہ تسلی حاصل نہ ہو سکی تھی کہ کوئی "زود پشیماں" اس کی ارتھی کے پیچھے سر جھکائے چلا جا رہا ہے۔ اور پھر اس کی ارتھی کا جلوس ہی کب نکلا

تھا۔ اور اُسے وہ وقت یاد آگیا۔ جب اس کی لاش کو اس کے باپ نے لاشوں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک پر بیٹھے ہوئے ایک فوجی کے حوالے کیا تھا۔ اُس فوجی نے کس بے دردی سے اُسے بھی اٹھا کر دوسری لاشوں میں نہایت لاپروائی سے پھینک دیا تھا۔ اور آنند دور کھڑا صرف دیکھتا رہا تھا۔ اور کچھ نہ کر سکا تھا۔

اس وقت اس نے چاہا بھی تھا کہ اس فوجی کا ہاتھ روک کر اس سے اتنا تو کہے کہ "اس کو ذرا آرام سے۔ یہ دوسری لاشوں سے کہیں نازک تر ہے۔ اس کی ریشم سی جلد پر خراشیں آجانے کا ڈر ہے"۔ لیکن پھر اُسے خیال آگیا تھا کہ یہ کہنے والا وہ کون تھا۔ اُسے زندہ جلتی آگ میں چھوڑ آنے والا باپ ہی آج بھی ان سب لوگوں کے سامنے اس کا جائز ترین وارث تھا۔ چنانچہ وہی رو بھی رہا تھا۔ اور آنند دوسرے تماشائیوں کے بیچ کھڑا محض ایک بھی افسوس کنندہ سمجھا جا رہا تھا۔ چنانچہ اُسے کوئی ایسی بات کرنے کا حق کس طرح دیا جا سکتا تھا۔

آج اُسے وہ نظارہ یاد کر کے اور اپنی وہ بے چارگی پھر سے یاد کرتے ہوئے ہارڈی کی ایک نظم بھی یاد آگئی۔ جس میں اپنے عاشق کے جنازے کے ساتھ جاتی ہوئی محبوبہ اپنا حالِ دل بیان کرتی ہے۔ کہ

"اس کا جنازہ آہستہ قدموں سے جا رہا ہے۔ اس کے رشتہ دار میت کے ساتھ ہیں

اور میں غیروں کے ساتھ ایک واجب فاصلے پر چل رہی ہوں
وہ اس کے رشتہ دار ہیں اور میں اس کی محبوب

ان کے لباس ماتمی ہیں
لیکن میں اپنا رنگ دار گاؤن تبدیل نہیں کر سکتی
وہ کالے لباسوں والے ماتم سے عاری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں
جب کہ میرا غم آگ کی طرح مجھے جھلسے دے رہا ہے"

آنند سوچنے لگا کہ ہارڈی کو کیا پتہ تھا کہ اس کا تصور مستقبل میں آنے والے کسی کم نصیب آنند کی حقیقتوں سے کھیل رہا ہے۔ اس نے ایک سادھو سے سنا تھا کہ کسی کا تصور خالی نہیں جاتا۔ قدرت اس میں ہمیشہ حقیقت کے رنگ بھر دیتی ہے۔ بالمیکی نے کونجوں کے ایک جوڑے کی جدائی کو دیکھ کر جو شعر کہا تھا۔ وہی رامائن کی اس عظیم ٹریجیڈی کا آغاز ثابت ہوا۔ جس میں سیتا کی ساری معصومیت اور رام کی ساری شکتی بھی موت کو ان کے درمیان دائمی جدائی ڈالنے سے نہ روک سکی۔ پھر اسے خیال آیا۔ کہ وہ خود بھی تو شاعر ہے۔ کیا جانے اس کی اپنی المیہ نظمیں کس آنے والے بدنصیب انسان کی زندگی کا نقشہ تیار کر رہی تھیں۔ اور یہ سوچتے ہوئے اسے اس خیال سے ایک طرح کی تسکین سی حاصل ہوئی کہ اس کی تمام نظمیں آگ میں جل گئی تھیں۔ شاید اس طرح بچانے کتنے بے گناہوں پر آئی ہوئی ٹل گئی ہو۔ اور یہ خیال آتے ہی اس نے سوچا کہ دنیا بھر کے ان اذیت پرست اداسیت ادیبوں اور شاعروں کا سارا ادب جلا ڈالے۔ اور آنے والے کروڑوں انسانوں کو محفوظ کر دے ان ستاروں کو آگ لگا دے، جو اپنی آنکھ مچولی میں مصروف قہقہے لگاتے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگے ہوئے پھر رہے ہیں۔ اور یہ کبھی نہیں سوچتے

نہ ان کی ہر حرکت اور ان کا ہر قدم اس دنیا کی کروڑوں معصوم زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔ وہ ان تمام بے نیاز کھلاڑیوں کو ایک وسیع آگ میں جلا کر انسان کو قضاء قدر کی مجبوریوں سے آزاد کر دینا چاہتا تھا۔ وہ قدرت کے اس سارے نظام کو تحس نحس کر ڈالنا چاہتا تھا۔ جس میں دیوتاؤں کا کھلونا انسان مجبور بھی تھا مقہور بھی اور لاچار بھی۔ اور اگر یہ سب کچھ پرماتما کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ تو وہ اس سے بھی بغاوت کرنا چاہتا تھا اور ...... اور وہ کیا کچھ نہ چاہتا تھا یا اس نے کیا کچھ نہ چاہا تھا۔ لیکن اس سے کیا حاصل ہوا۔ اور اُسے وہ سب کچھ یاد آگیا جو اکثر اس نے اور اوشا نے مل کر چاہا تھا۔ انھوں نے کیا کیا منصوبے باندھے تھے۔ آنے والے دنوں کے تصور میں انھوں نے کیسے کیسے حسین رنگ بھر رکھے تھے۔ مخالفت کے سخت سے سخت طوفانوں میں بھی انھوں نے کس طرح امید کا دامن نہ چھوڑا تھا۔ لیکن آج وہ امید کہاں تھی۔ وہ حسن کہاں تھا۔ اور وہ رعنائی خیال کیا ہوئی تھی۔ جو کسی کے تصور ہی کے سہارے موجود تھی۔

اپنی ملاقاتیں یاد آتے ہی اُسے وہ مقامات بھی یاد آگئے۔ جہاں وہ ملا کرتے تھے۔ وہ مقامات جن کی وجہ سے لاہور اس کے لئے دنیا کا حسین ترین شہر تھا۔ لیکن اب وہ شاخ بھی نہ رہی تھی جس پر آشیانہ تھا۔ اور پھر لاہور کا نقصان بھی اُسے اپنا ذاتی نقصان محسوس ہونے لگا۔ اُس نے سوچا کہ ممکن ہے کہ کوئی اصلاحی ادارہ یا امپروومنٹ ٹرسٹ اس توڑ پھوڑ سے فائدہ اٹھا کر شہر کی ان تنگ سڑکوں اور تاریک پیچدار کوچوں کی جگہ کشادہ اور سیدھی

راہیں بنا دے گا ۔ اور اس طرح ان راستوں اور موڑوں کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ جن کے چپے چپے سے اس کی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ تھی وہ ماہ گذریں جب پراس کی مدہوش رعنائیوں نے اکثر اپنا سایہ ڈالا تھا ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئیں ۔ اور پھر سے ان کے وہ تمام تاریخی مقامات اُسے یاد آنے لگے ۔ جہاں کبھی اپنے محافظوں میں گھری ہونے کے باوجود کسی کی نگاہوں نے اُسے جھکتے ہوئے سلام پیش کئے تھے ۔ جہاں کبھی کسی موڑ سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے جلدی سے ایک آدھ بات کر لی تھی ۔ یا وہ رقعے ایک دوسرے کو تھما دیئے تھے ۔ جو کسی ایسے ہی موقعہ کے انتظار میں ہر وقت جیب میں رکھے رہتے تھے ۔ اور پھر بھی ہمیشہ بہت کچھ کہنے کو باقی رہ جایا کرتا تھا ۔ اس کے ساتھ ہی اُسے وہ تمام حماقتیں بھی یاد آگئیں ۔ جو جذبات کے جوش میں کبھی حماقتیں محسوس نہ ہوتی تھیں ۔ لیکن بعد ازاں جن کے خیال ہی سے وہ ہمیشہ کانپ اٹھا کرتا تھا اور پھر اسے وہ تمام وعدے یاد آگئے ۔ جو انھوں نے ایک دوسرے سے کئے تھے ۔ اس نے ہمیشہ اوشا کو یہ کہہ کر چھیڑا تھا کہ " تمھارے وعدوں کا اعتبار ہی کیا ۔ تم ایک دن خالص ہندوستانی لڑکی کی طرح احتجاج کا ایک لفظ بھی زبان پر لائے بغیر اس کی موٹر میں چلی جاؤ گی ۔ جس کے ہاتھوں میں تمھارے والدین تمھیں سونپ دیں گے ۔۔۔ " اور واقعی وہ ایک ہندوستانی لڑکی کی طرح ذرہ بھر احتجاج کئے بغیر اس کی موٹر میں چلی گئی تھی ۔ جس کے ہاتھوں میں اس کے باپ نے اس کی لاش سونپ دی تھی ۔

آنند سوچنے لگا کہ اس خاموشی میں بھی اُسے کس قدر کرب و اضطراب سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ کیا مرتے وقت اُسے وہ تمام لمحات یاد نہ آئے ہوں گے وہ اس وقت اُسے کتنا بڑا فریب کار سمجھتی ہوگی۔ اور اس نفرت نے اس وقت اس کی زندگی کو کس قدر تلخ بنا دیا ہوگا کہ اس نے زہر کی تلخی میں پناہ ڈھونڈی اور آنند کو یوں محسوس ہوا۔ گویا اوشا نے خودکشی نہیں کی۔ بلکہ خود اس نے اوشا کو قتل کیا ہے ....

اچانک ایک درد کی چیخ بلند ہوئی۔ جس کی ڈراؤنی آواز کچھ اس طرح فضا کو چیرتی نکل گئی کہ اس کا دل ہل گیا۔ اس کے تمام خیالات خشخاش کی طرح بکھر گئے۔ اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے ہی خیمے کے ایک کونے میں سویا ہوا بچہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر اچانک نہایت خوفناک آواز میں چلانے لگ گیا تھا اس سے قبل کہ وہ اُس تک پہنچ کر اُسے اٹھا لیتا۔ ایک نوجوان عورت نے پھرتی سے خیمے میں داخل ہو کر اس بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ گود میں آتے ہی بچہ خاموش ہو گیا۔ اور کچھ اس طرح کی سوالیہ نگاہوں سے اس عورت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ کہ آنند کو لامحالہ اس بچے کی یاد آ گئی جو اوشا کے پاس اس کا آخری پیغام لے کر گیا تھا اور اس کی موت کی خبر لے کر لوٹا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اکثر اسی طرح کا ایک معصوم سا سوال جاگ اٹھا کرتا تھا۔ اس دن جب وہ پہلے پہل شرنارتھی کیمپ میں پہنچے تھے۔ تو سیٹھ کشور لال کی گود میں بیٹھا ہوا وہ اپنی نگاہوں میں اسی طرح کا ایک خاموش سوال لئے ہر ایک سے کسی جواب کی بھیک مانگ رہا تھا۔ پھر اوشا کو اپنے ساتھ کیمپ میں واپس لانے کے بعد

جب وہ ایک دھندلی سی خلا میں کھو گیا تھا۔ تو اس وقت بھی اس نے چپکے سے اس کا ہاتھ تھام کر کچھ ایسی ہی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور اس وقت بھی جب وہ آنند کا خط واپس لے آیا تھا۔ اور آنند اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سوال پر سوال پوچھے جا رہا تھا۔ تو اس کی تیخ بستہ نگاہوں نے جواب میں ایک ایسا ہی خاموش سوال پیش کیا تھا۔ حتیٰ کہ آنند اس کی ان خاموش نگاہوں سے لرزنے لگ گیا تھا۔ وہ ان چبھتے ہوئے خاموش سوالوں سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔

نجانے وہ خاموش سوال کیا تھے۔ شاید وہ پوچھ رہا تھا کہ "تم کون ہوں؟۔ تم اوشا کے کون ہو؟ تمھیں اُسے قتل کرنے کا کیا حق تھا؟ تمہارے پاس اس پر حق ملکیت ثابت کرنے کے لئے کتنے لاکھ روپے ہیں۔؟ کتنی بلڈنگیں ہیں۔ کتنے خطابات؟؟"۔ یا شاید وہ یہ پوچھتا تھا کہ "تم انسانیت اور انصاف کے ایسے کہاں کے ٹھیکیدار ہو؟ اس کے لئے تم نے محض سوچتے رہنے کے علاوہ زندگی بھر میں اور کیا کیا ہے۔ کون سا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے اس کے لئے تم نے اپنا خون کب بہایا ہے۔ اپنی خوشی سے اپنی آرزوؤں کو کب قربان کیا ہے؟"

اور آنند نے ان ظالم نگاہوں سے خوف زدہ ہو کر اپنے اس ننھے سے سہارے کو اپنے ہی ہاتھوں اپنے سے جدا کر دیا تھا۔ اس ننھے راز داں کو اس نے اس روز مشرقی پنجاب جانے والے قافلے کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ اور خود اپنے پہلے فیصلے کے مطابق ان سے مخالف سمت کی جانب چلا گیا تھا

جہاں زخمی انسانیت سسک رہی تھی۔ اور جہاں نفرت و دہشت کا مارا ہوا انسان مدد کے لئے پکار رہا تھا۔

٭ ٭ ٭

مشرقی پنجاب کی طرف جانے والا قافلہ جب روانہ ہوا۔ تو اس بچے نے آنند سے کچھ نہیں کہا۔ ایک لڑکی کی گود میں چپ چاپ بیٹھے ہوئے اُس ظالم نے جاتے جاتے صرف ان خاموش سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد بھی وہ نگاہیں آنند کے دل و دماغ پر گڑی کی گڑی رہ گئیں۔ وہ ہر لحظہ اس کا تعاقب کر رہی تھیں ــــ "تم نے اپنی زندگی میں کیا عملی کارنامہ کیا ہے"؟ یہ سوال اس کے چاروں طرف فضاؤں میں بار بار گونج اٹھتا تھا۔ اور وہ بے چارگی کے عالم میں "کچھ" کرنے کے لیے مغربی پنجاب کے اندرونی حصوں میں ادھر سے ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ لیکن میدانِ عمل تک پہنچنے میں اُسے کئی دن لگ گئے۔

اُسے سمت کا ٹھیک احساس نہ تھا۔ بلکہ احساس تو اسے اوشا کی موت کے بعد اپنا بھی نہ رہا تھا۔ اُسے صرف اتنا پتہ تھا۔ کہ وہ ایک بار راوی کو پار کر آیا تھا۔ اور دوبارہ ابھی کوئی دریا اس کے راستے میں نہ آیا تھا۔

جن دیہات میں وہ گیا۔ وہ سب اُجڑے ہوئے تھے۔ پنجاب کے وہ جوان گاؤں جن کے کھیتوں میں جوان خون لہرا تا رہتا تھا۔ جن کے کنوؤں سے پانی نکالنے والے بیل وہاں کے چھبیلے نوجوانوں کی وہتھیلیوں کی تال پر اپنے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھرو بجاتے ہوئے چلا کرتے تھے

اور جہاں کی فضاؤں میں وارث شاہ کی لکھی ہوئی "ہیر" کے شعر کچھ اس طرح تڑپا کرتے تھے کہ انھیں سن کر بوڑھوں کی رگوں میں نوجوانی کے تمام عشق پھر سے دھڑکنے لگ جاتے۔ اور روٹی لے کر کھیتوں کو جاتی ہوئی عورتوں کے جذبات دھک دھک کرنے لگ جاتے۔ ان ہی گاؤں پر آج شہر خموشاں کی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ کسی ان دیکھی ظالم طاقت نے ان ہنستے اور گاتے ہوئے گاؤں کو اجاڑ کر وہاں مرگھٹ اور قبرستان آباد کر دیے ہیں۔ وہاں کی فضاؤں میں مرنے والوں کی چیخیں اور بچنے والوں کی آہیں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ اور زمین پر مرنے والوں کا لہو اور بچنے والوں کے آنسو۔۔!

ان دیہات میں لوگ اب بھی رہتے تھے۔ جو شکل و صورت میں آدمی دکھائی دیتے تھے۔ لیکن شاید ان میں انسان ایک بھی نہ تھا۔ وہ لوگ ان دیہات میں اسی طرح رہتے تھے۔ جس طرح جنگل میں جانور رہتے ہیں ایک دوسرے کو مار کر کھا جانے والے جانور۔ ان کا کوئی مذہب نہ تھا وہ جنگلی تھے۔ اور جنگل کا قانون ان کا قانون تھا۔ انھوں نے ہنستے گاتے دیہات کو جنگلوں کی طرح سنسان کر دیا تھا۔ اور دونوں کی بستیاں اجاڑ ڈالی تھیں۔ انھوں نے صدیوں سے اپنے ساتھ رہنے والے ہمسایوں کو مار دیا تھا۔ اور ان کے ساتھ ذبح کر دیا تھا ان شریف جذبات کو جو صدیوں کی تربیت کے بعد انسان نے اپنے دل میں پیدا کئے تھے ... حتیٰ کہ اب ہر طرف ہر گاؤں میں اور ہر پہر کے پر ایک وحشت برس رہی تھی اور

بس ـــ راستوں اور کھیتوں میں پڑی ہوئی لاشوں کے چہروں پر بھی وہی وحشت تھی ۔ جوان کے چہروں پر تھی جنھوں نے صرف اس لئے انھیں قتل کیا تھا ۔ کہ ان کا مذہب دوسرا تھا ۔ جن عورتوں اور لڑکیوں کو وہ زبردستی اٹھالائے تھے ۔ ان کی نگاہوں میں بھی وہی دہشت اور وحشت موجود تھی ۔ جو ان کی اپنی ماؤں اور بہنوں کی نگاہوں میں تھی ۔ حتیٰ کہ یہ امتیاز کر سکنا ناممکن تھا کہ کس عورت کی عصمت دری نہیں کی گئی ۔ ہر ایک کی عفت برباد ہو چکی دکھائی دیتی تھی ۔ فرق صرف یہ تھا ۔ کہ کسی کا بدن داغدار ہو گیا تھا اور کسی کی روح ۔

سمت اور وقت کے احساس سے بیگانہ وہ ان علاقوں سے گزرتا چلا گیا ۔ قلبی کیفیت اور شکل ولباس کے اعتبار سے جو دیوانہ پن اس کی صورت سے عیاں تھا ۔ اس نے اُسے دیوانوں کی اس دنیا سے یکرنگ کر رکھا تھا ۔ چنانچہ سب نے اُسے اپنے میں سے ایک سمجھا ۔ اور وہ بلا روک ٹوک آگے بڑھتا چلا گیا ....

بچہ اب تک سو گیا تھا ۔ وہی نوجوان عورت اُسے خاموشی سے اندر لے آئی ۔ اور پھر اس کے لئے بنی ہوئی جگہ پر اُسے سلانے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے اس کے ساتھ لیٹ گئی ۔

" یہ پھر ... " وہ کچھ پوچھنے ہی لگا تھا ۔ کہ لڑکی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا ۔ یہ خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا ۔ وہ کس پیار سے بچے کو نہایت سکون سے سلانے کی کوشش کر رہی تھی ،

بچے نے اس کی دھوتی کے ایک کنارے کو تھام رکھا تھا۔ جیسے وہ اس کی اپنی ماں ہو۔ اور یہ دیکھتے ہوئے بجانے کیوں اس کے دل میں ایک گھٹی ہوئی خواہش اٹھی۔ کہ کاش یہ لڑکی اوشا ہوتی اور یہ بچہ ان کا اپنا بچہ ... ... !

اس نے زور سے سر جھٹک کر اس خیال کو دور بھگانے کی کوشش کی۔ وہ خود بھی تو اوشا ہی کی وجہ سے اتنی دور بھاگ آیا تھا۔ اپنے لاہور سے اتنی دور اس کیمپ تک۔ ! اور پھر اُسے وہ دن یاد آگیا۔ جب اس کیمپ والوں نے اُسے اپنے کیمپ کے قریب دریا کے ساحل پر بھوک اور تھکن کی مارے بے ہوش پڑا پایا تھا۔ جانے وہ کتنے دن کھائے پیئے بغیر ہی چلتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ تھک کر ایک دریا کے کنارے ٹھنڈی ریت میں لیٹ گیا تھا۔ اور اس کے بعد جو وہ اٹھا ہے۔ تو اس نے اپنے آپ کو اسی خیمے میں پایا۔

آٹھواں باب

اس سے پہلے بھی ایک بار وہ تھک کر اسی طرح ایک نہر کے کنارے بیٹھ گیا تھا۔ اور اُسے ایک گوردوارے میں پناہ ملی تھی۔ اور وہ بھی بڑے دلچسپ حالات میں۔

وہ تھکا ہارا کسی نہر کے کنارے ٹھنڈی ٹھنڈی ریت میں لیٹا ہوا اپنی لامنزلی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"تم کون ہو"

گھوم کر دیکھا تو ایک سکھ ہاتھ میں ننگی کرپان تانے اس کے سر پر

کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی"، اس نے حیران ہو کر پوچھا

"تم کون ہو۔ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" ۔اس نے کرپان کو تولتے ہوئے نہایت سختی سے پوچھا

"ایک انسان ہوں" ۔اس نے سوکھتے ہوئے گلے سے جواب دیا

"انسان و نسان نہیں۔ کیا نام ہے تمھارا۔ سیدھی سیدھی طرح بتا دو" ۔اس سکھ نے ڈانٹ کر کہا۔

"نام جان کر کیا کرو گے بھائی، ایک مسافر ہوں"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"جہاں انسانیت روتی ہے"

"تم لوگوں کے مکروفریب میں سب جان گیا ہوں۔ اب اور نہیں چلے گا۔ آج سمجھ لو کہ تمھاری موت تمھیں اپنی ہی چال کے جال میں پھنسا کر یہاں لے آئی ہے۔ لو اب خود ہی ٹھیک طرح بیٹھ جاؤ۔ تاکہ ایک ہی وار میں سر اتر جائے ورنہ یاد رکھو کہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمھاری جان نکالوں گا"

یہ کہتے ہوئے اس نے آنند کو بازو سے پکڑ کر اکڑوں بٹھانے کی کوشش کی۔ آنند نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ لیکن اس شخص کی اپنی ہی جلدی اور گھبراہٹ کے باعث بازو سے آنند کی قمیص پھٹ گئی۔ جانے کیا ہوا۔ کہ اس سکھ نے فوراً اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"تمھارے بازو پر اوم کھدا ہوا ہے۔ تو کیا تم ہندو ہو"

"ہاں"، آنند نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا
"تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ابھی ناحق کی موت مر جاتے"،
لیکن آنند سننے میں کمزوری کے مارے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تھا۔ سکھ نے اپنی کرپان نیام میں ڈالی۔ اور اُسے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر قریب ہی ایک مکان کے اندر لے گیا۔

وہاں کچھ کھانے پینے کے بعد جب اس میں پھر اٹھنے بولنے کی سکت لوٹ آئی۔ تو اس سکھ نے اپنے رویے کا جواز پیش کرتے ہوئے اُسے بتایا۔ کہ "یہ ہمارا گوردوارہ ہے جسے برباد کرنے کی مسلمانوں نے پوری کوشش کی ہے ہم یہاں گورو کے چار ہی سیوک تھے۔ جن میں سے تین ایک حملے میں مارے جا چکے ہیں۔ مجھے بھی وہ مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ لیکن گورو کی کرپا تھی۔ انہوں نے ابھی اپنی سیوا یہاں کرانی تھی۔ سو میں بالکل بچ گیا۔ اور آج تک جب کہ دور دور تک کے سب گوردوارے جل چکے ہیں۔ اس گوردوارے میں سیوا برابر ہو رہی ہے۔

یہ چونکہ راستے سے بہت ہٹ کر ہے۔ اس لئے کوئی ادھر سے گزرتا ہی نہیں۔ اور کسی کو اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ آج تک صرف دو مسلمان ادھر سے گزرے تھے۔ لیکن میں نے انہیں کسی کو جا کر بتانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ تمہیں ابھی دکھاؤں گا۔ ان کی لاشیں ابھی تک پچھواڑے والے کھیت میں پڑی سوکھ رہی ہیں۔ مردے کھا کھا کر کتوں کے پیٹ بھی اتنے بھر چکے ہیں۔ کہ وہ بھی اب دور پڑی ہوئی کسی لاش کو کھانے نہیں آتے"

یہ کہتے کہتے وہ اُسے اپنے ساتھ باہر کی طرف لے جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ کہتا گیا۔ کہ "تمہیں دیکھ کر میں خوش ہوا تھا۔ کہ چلو ایک اور شکار آج ملا۔ میرے تیسرے ساتھی کا بدلہ بھی پورا ہو جائے گا۔ پھر جب تم نے جواب اوٹ پٹانگ سا دیئے۔ تو میں سمجھ گیا۔ کہ تم دراصل گوردوارے کو نقصان پہنچانے کی نیت سے آئے ہو"

"اور تم ڈر گئے؟" آنند نے پوچھا

"ہاں۔ ڈر تو گیا تھا۔ مُسلے کا کیا بھروسہ۔ مجھے یقین تھا۔ کہ ضرور کوئی ہتھیار تمہارے پاس ہو گا ... یہ دیکھو یہ پڑے ہیں دونوں"

اس نے اچانک سا دو لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا۔ جس میں عین شرع کے مطابق تراشی ہوئی۔ اور بال قدرے لمبے تھے۔ اس کے ماتھے پر نماز کے سجدوں کا نشان پڑ گیا تھا۔ اور گلے میں پڑی ہوئی تسبیح کھسک کر باہر کو نکل آئی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر جانے کیوں آنند کو وہ مولینا یاد آ گئے۔ جنہوں نے ان تینوں لڑکیوں کو نجات دلائی تھی۔ اس نے گھبرا کر اس پر سے نظریں ہٹا لیں۔ دوسری لاش ایک کمسن لڑکے کی تھی جس کی مسیں ابھی ابھی بھیگی تھیں۔ موت کے بعد لاش کے اکڑے ہوئے ہونے کے باوجود اس کے اعضا میں ایک کوملتا۔ ایک ملائم پن محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کے ایک ایک عضو میں نزاکت آفریں سی لچک ابھی تک اس طرح تازہ تھی جیسے ابھی ابھی اس کی ماں نے اس کے سارے بدن پر شفقت سے رزتا ہوا ہاتھ پھیرا ہو۔

"بس ایک ایک جھٹکا بھی برداشت نہ کر سکے دونوں" سردار جی نے ان کی جسمانی کمزوری کی تحقیر کرتے ہوئے کہا۔

"سردار جی آپ فوج میں کیوں بھرتی نہیں ہو جاتے" آنند نے اچانک پوچھا۔

"واہگورو کا نام لو جی۔ ہم گورو کے بھگت ہیں۔ ان کی بھگتی اور سیوا ہی اپنا دھرم ہے۔ ہم فوج میں بھرتی کیوں ہوں"

"کیونکہ آپ کا گورو کی بھگتی پر وشواش نہیں"

"وشواش کیوں نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنے مہینوں سے میں یہاں اس خطرے میں کیوں پڑا رہتا"

"لیکن آپ کو تو گورو اور اس کی بھگتی سے زیادہ اپنی کرپان پر یقین ہے"
——— اس کے بعد وہ بہت دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکا تھا۔

✲ ✲ ✲

اور پھر ایک دن جب وہ اسی طرح ایک دریا کے کنارے تھک کر گر پڑا تھا۔ تو اسے پتہ نہ تھا کہ آخر اس کی منزل آن پہنچی تھی۔

جب اسے ہوش آیا۔ تو اس نے اپنے آپ کو اس کیمپ میں پایا۔ در حقیقت یہ کوئی باقاعدہ سرکاری کیمپ نہ تھا۔ بلکہ اس کی بنیاد اسی طرح چند بھٹکے ہوئے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگتے ہوئے لوگوں کے ایک جگہ مل جانے سے ڈالی گئی تھی۔ وہاں مختلف قسم کے اور مختلف علاقوں کے لوگ آکر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر تو ان دور افتادہ دیہات کے تھے۔ جہاں مکمل

قتلِ عام ہوا تھا۔ اور کوئی ایک آدھ کسی طرح بچ بچا کر بھاگ آیا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ جو قافلوں سے بچھڑ گئے تھے۔ تھک کر بیٹھ گئے تھے، یا بیمار ہو گئے تھے۔ اور قافلے والے انہیں اسی طرح چھوڑ کر آگے چلے گئے تھے۔ یہ سب بھٹکے ہوئے، بچھڑے ہوئے لوگ جن میں سے ہر ایک اکیلا تھا۔ یہاں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کا کچھ نہ تھا۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے تسبیح کے دانوں کی طرح وہ سب ایک ہی دھاگے میں پرو دیئے گئے تھے۔ ایک ہی رشتے نے ان سب کو اکٹھا کر دیا تھا۔ اور اب ہر کوئی ایک دوسرے کا کچھ نہ کچھ تھا۔ اور کچھ نہیں تو ہر کوئی ایک دوسرے کا شریک غم ضرور تھا۔ ایک دوسرے کی داستان ہر کوئی سنتا تھا۔ اور یہ سننے سنانے کا سلسلہ اس قدر دراز ہو جاتا۔ اور دونوں فریق اس داستان میں اس قدر خلوص کے ساتھ ڈوب جاتے۔ اور پھر دونوں اس طرح یک رنگ ہو کر اس میں سے باہر نکلتے کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا۔ کہ وہ داستان درحقیقت کس کی تھی۔ حتیٰ کہ ہوتے ہوتے یوں محسوس ہونے لگتا۔ جیسے اجتماعی مصائب کی بھٹی میں سے پگھل کر نکلنے کے بعد انسانی جذبات کے اس لاوے کو کسی ایک ہی سانچے میں ڈھال کر سب ایک ہی طرح کے بت بنا دیئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سب کسی ایک ہی کلاسیک ٹریجیڈی کے ہیرو دکھائی دینے لگتے۔

الگ الگ شہروں، الگ الگ ذاتوں اور الگ الگ گھرانوں کے ان افراد کے اس طرح کے اتحاد بلکہ وحدت کو دیکھ کر آنند حیران ہو رہا تھا

کہ کاش اسپین میں لڑنے والے انٹرنیشنل برگیڈ کی طرح یہ کیمپ مظلوموں کا ایک انٹرنیشنل کیمپ ہوتا۔ جہاں ہر قوم ہر ملک اور ہر مذہب کے مظلوم اسی طرح جمع ہو کر ایک ہو جاتے۔ اس صورت میں یہ وحدت کتنی بڑی اخلاقی طاقت ہوتی۔ شاید ایک ہی ایسا کیمپ دنیا بھر کی ظالم طاقتوں کی بنیادیں ہلا دیتا۔ مظلومیت اور اہنسا کے ہتھیار سے لڑنے والی یہ فوج ہمارے عظیم ترین انسان کے خواب کو تعبیر بخش دیتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ تھا۔ اس دوزخی بستی کا یہ کونا بھی کسی ایک مذہب کے لئے جیسے ریزرو کر لیا گیا تھا۔ کسی دوسرے مذہب کے مظلوم کو ان کے ساتھ مل کر ظلم سہنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ اور اپنا یہ حق ثابت کرنے کے لئے اور اپنے اس مقام رنج کو دوسروں کی نظروں سے بچائے رکھنے کے لئے ان لوگوں نے بھی اس علاقے سے گزرتے ہوئے چار مسلمان مسافروں کو ہلاک کر کے اس دریا میں بہا دیا تھا۔ جو دونوں مذہبی ملکوں کی مشترکہ جائداد تھا۔ جس کے ایک ساحل پر ایک مذہب والوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ اور دوسرے ساحل پر دوسروں نے۔ لیکن زندگی کی طرح بہتے ہوئے اس دریا کی لہروں کے دو ٹکڑے نہ ہو سکے تھے۔ اس کی لہریں دونوں کٹے ہوئے کناروں کے درمیان بخیئے کے ٹانکوں کی طرح ادھر سے ادھر آ جا رہی تھیں۔ دونوں کناروں سے اس میں ہزاروں لاشیں پھینکی گئی تھیں۔ لیکن اس نے بلاتمیز مذہب ان کو ایک دوسری کے آغوش میں ڈال دیا تھا۔ کئی زندہ انسان اس نے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے کو سونپ دیئے تھے۔ یہ لڑکی جو

اس وقت آنند کے سامنے ہی ایک کونے میں اس بچے کو سلاتے سلاتے خود سو گئی تھی۔ یہ بھی تو اسی طرح اِن ہی لہروں میں بہتی بہتی اس کنارے پر آ لگی تھی۔ اور پھر جب چند گھنٹوں کے بعد اُسے ہوش آیا۔ اس وقت آنند اس پر جھکا ہوا اس کے بازوؤں کو اوپر نیچے کر کے اس کا سانس چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو اس نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتے ہی کچھ کچھ حیرت اور کچھ کچھ خوشی کی ملی جُلی آواز میں پوچھا تھا — آپ — ؟ کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ ؟"

اور جب آنند کچھ نہ سمجھ سکنے پر جواب میں کچھ نہ بولا۔ تو اس کا چہرہ پھر سیاہ ہو گیا۔

اس نے پھر پوچھا: نہیں — ؟ اوہ ... "۔ اور اس کے بعد وہ ایک دم سے پھوٹ پڑی۔ اور اس نے بے تحاشا رونا شروع کر دیا جیسے دریا کا سارا پانی اس کے پیٹ میں نہیں اس کی آنکھوں میں چلا گیا تھا

آنند چپ چاپ اس کے بازوؤں کو اسی طرح ہلاتا رہا۔

" تو پھر آپ نے مجھے دریا سے نکالا کیوں۔ ؟ مجھے ڈوب کیوں نہ جانے دیا "۔ وہ کہے جا رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ کہ اتنے میں قریب ہی سوئے ہوئے اسی چھوٹے بچے نے رونا شروع کر دیا تھا جسے سنتے ہی وہ تڑپ کر اٹھی۔

" پریم — ؟ میرا پریم — ! یہ کیوں روتا ہے ؟ کہاں ہے وہ ؟ "
اور جب آنند نے اُسے نہ چھوڑتے ہوئے یہ کہہ کر زبردستی لٹانے

کی کوشش کی کہ "آپ لیٹی رہئے۔ اٹھنا ابھی ٹھیک نہیں" تو اس نے جھٹکے سے اپنے بازو چھڑا لئے۔ آنسوؤں کی جھالر کے اندر سے بھی اس کے چہرے پر ایک غیض و غصہ کی سرخی آندھی کے مقابلے پر جلنے والے چراغ کی لَو کی طرح بھڑکی۔ اور وہ کہنے لگی۔

"کیا آپ مجھے اپنے بیٹے سے بھی ملنے نہیں دیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا ــــ دیکھئے وہ کس طرح رو رہا ہے۔ اس کا گلا سوکھ گیا ہے۔ اس بیچارے کی آواز بھی نہیں نکلتی" اور وہ اٹھ کر بجلی کی طرح دوڑی اور اس بچے کو اٹھا کر اپنی چھاتی کے ساتھ زور سے بھینچ لیا۔

آنند اس نظارہ کی تاب نہ لا کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ اُسے یوں نکلتے دیکھ کر اُس نے بڑے اطمینان سے کہا کہ "جائیے آپ میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ نہ دیکھئے۔ آپ کے لئے میں کلنکنی ہو گئی ہوں۔ لیکن میرا بیٹا تو مجھے ایسی نہیں سمجھتا۔ اُسے میری ضرورت ہے۔ اسے ماں کی ضرورت ہے۔ یہ کسی کے طعنوں سے نہیں ڈرتا۔ اُسے برادری کی لاج سے ماں کا دودھ زیادہ پیارا ہے ــــ" اور واقعی جب اس نے اپنا ستن بچے کے منہ میں دیا۔ تو وہ کئی دن کا ترسا ہوا بچہ گٹر گٹر دودھ پینے لگ گیا۔

آنند باہر جا کر رونے لگ گیا تھا۔ اس لڑکی کا یہ دردناک پاگل پن اس سے دیکھا نہیں گیا۔ اور بڑی مشکل سے اُس نے آخر کار اپنے آپ کو ضبط کیا۔ لیکن وہ لڑکی ــــــــ جب اُسے یہ پتہ چلا تھا۔ کہ یہ لڑکا اس کا بیٹا نہیں۔ اور کہ وہ پناہ گزینوں کے ایک کیمپ میں تھی۔ اور آنند جسے

Scanned with CamScanner

وہ ہوش آنے پر اپنا خاوند سمجھی تھی۔ محض اسی کی طرح کا ایک لٹا ہوا اپنا ہم جنس تھا۔ تو وہ برف کی مانند سرد ہو گئی۔ اس کی زبان بند ہو گئی۔ اس کے پگھلے ہوئے جذبات جیسے اچانک منجمد ہو گئے۔ اور اس کی زندگی میں جیسے کوئی حرکت ہی باقی نہ رہ گئی حتیٰ کہ اس ذہنی اور جسمانی جمود سے اُسے آزاد کرنا مشکل ہو گیا۔

❋ ❋ ❋

وہ پہروں ایک ہی جگہ ہلے جلے بغیر بیٹھی رہتی۔ اس کی نگاہیں وسیع خلاؤں کو چیرتی ہوئی نجانے کہاں اور کیا دیکھتی رہتیں۔ اُسے کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ اور نہ کسی اور ہی کو یہ فکر ہوتی۔ کہ اُسے بھوک لگی ہے یا پیاس۔ کیونکہ اس کیمپ میں تو ان باتوں کو کوئی غیر معمولیت حاصل ہی نہ تھی کسی کا رونا یا چلانا، بھوکا رہنا یا نہ سونا بلکہ مر بھی جانا کسی کی خاص توجہ کا باعث نہ ہو سکتا تھا۔ وہاں تو سبھی ایک سے تھے۔ کوئی خود ہی اُبل پڑے۔ اور اپنی داستان سنانی شروع کر دے تو وہ لوگ سن لیتے تھے۔ اور وہ بھی شاید اس لئے کہ ہر داستان میں انھیں اپنی ہی داستان دکھائی دیتی۔ اور اگر کوئی چپ رہ کر اپنی ہی کسی یاد میں ڈوبا رہے۔ تو اپنی اپنی جگہ ان کے پاس بھی یاد کرنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ سب ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونے کے بہانے درحقیقت اپنے اپنے غم ہی پال رہے تھے اور کسی کو کسی میں کوئی حقیقی دلچسپی نہ تھی۔

البتہ ایک آنند ہی ایسا تھا۔ جو یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے اس کے

پاس یاد کرنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ جیسے اس کے لئے ہر ایک کا دکھ بنیا تھا جس میں وہ ایک بچے کی سی گہری دلچسپی لیتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ سارے کیمپ کی ذمہ داری اکیلے اسی پر آن پڑی تھی۔

ہر نئی تکلیف اُسے بتائی جاتی۔ اور ہر کوئی یہ امید کرتا کہ وہ اس کے لئے سب کچھ کر دے گا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان الگ الگ دانوں کو ایک ہی تسبیح میں پرونے والا دھاگہ وہی تھا۔ جو اس پاک دھاگے کی طرح ہر ایک کے دل سے ہوتا ہوا گزر رہا تھا۔ گویا اس نے اپنے اور اپنے دل کے سینکڑوں ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ جن میں سے ہر ایک ٹکڑا کسی نہ کسی کے دکھ میں شریک تھا کسی نہ کسی کے غم میں دھڑک رہا تھا۔ چنانچہ قدرتی تھا کہ اس لڑکی کے آجانے پر آنند ہی کو اس کی فکر بھی ہوئی۔

چنانچہ آنند نے اس کا وہ ذہنی جمود توڑنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ نہ ہو سکا۔ اس نے اُسے باتوں میں لگانا چاہا۔ لیکن پہلے دن ہوش میں آتے ہی اُس نے جو چند فقرے کہے تھے۔ اتنی ہی اس کی پراسرار کہانی تھی۔ جس کی وضاحت کے لئے آنند تڑپتا رہ گیا۔ مگر اس کی تو جیسے زبان ہی کسی نے کھینچ لی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے اُسے رلانا چاہا۔ لیکن آنسوؤں کے سوتے بھی جیسے سوکھ گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں کسی بے آب و گیاہ ریگستان کی سی خشکی چھاگئی تھی۔

آنند کی ہر کوشش ناکام رہی۔ بہت زور دینے پر وہ کبھی کچھ کھا تو لیتی۔ لیکن یوں جیسے زہر کھا رہی ہو۔

٭ ٭ ٭

وہ ننھا بچہ جسے اس نے آتے ہی اپنا پریم سمجھ کر ایک بار دودھ پلایا تھا۔ آہستہ آہستہ سوکھ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی سے ایک ہی دن پہلے وہاں لایا گیا تھا ایک نوجوان کشن چند اُسے گود میں اٹھائے ہوئے جب اس کیمپ تک پہنچا تھا۔ تو وہ تھکن کے مارے بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے آنند کو بتایا تھا کہ یہ اس کی بہن کا لڑکا تھا۔ اس کی بہن کو مسلمان زبردستی اٹھا کر لے گئے تھے اور جاتے ہوئے ان میں سے ایک نے یہ کہہ کر اس کی گود میں سے یہ بچہ چھین لیا تھا کہ "اس سرٹیفکیٹ کو ساتھ کہاں لئے جا رہی ہو۔ اس کے ساتھ تو تمہاری قیمت آدھی بھی نہیں رہتی"

اور یہ کہہ کر انھوں نے اس بچے کو مار ڈالنا چاہا۔ لیکن میری بہن چلائی کہ "اسے نہ مارو۔ بھگوان کے لئے اسے نہ مارو۔ تم نے اس کے پتا کو مار ڈالا۔ اب یہی ایک اس کی نشانی رہ گئی ہے۔ بھگوان کے لئے اسے نہ مارو۔ اس نشانی کو زندہ چھوڑ دو۔ میں تمہارے ساتھ جہاں کہتے ہو چلتی ہوں۔ لیکن اسے زندہ چھوڑ جاؤ ——"

"بالکل آرام سے چلوگی۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں کرو گی" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں ——" میری بہن نے اتنا ہی کہا۔ اور کپڑے میں منہ لپیٹ لیا۔ انھوں نے اُس بچے کو وہیں سڑک پر پھینک دیا۔ اور میری بہن کو لے کر چلے گئے۔ اس نے کچھ دور جا کر ایک بار منہ پھیر کر سڑک پر پڑی ہوئی

اس ننھی جان کی طرف دیکھا۔ جو چوٹ کھا کر بھی اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اور وہیں غش کھا کر گر پڑی۔ مر گئی یا زندہ رہی۔ اس کا مجھے علم نہیں مگر دو آدمی اُسے پیٹھ پر اٹھا کر لے گئے۔

اب اس بچے کو بچائیے۔ کسی بھی طرح اُسے بچا لیجئے۔ میں دو دن سے اسے لئے لئے چل رہا ہوں۔ ان دو دنوں میں دودھ کی ایک بوند بھی اسے نہیں ملی۔ آپ اسے کسی بھی طرح بچا لیجئے"

یہ کہتے کہتے کشن چند پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گیا تھا۔ آنند نے بھوک اور تھکن سے نیم مردہ ہو گئے اس بچے کو اپنی گود میں لے لیا تھا لیکن وہاں بھی دودھ کہاں تھا۔ انھیں تو اب اپنے کھانے کے لالے پڑ رہے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس جو تھوڑا بہت کھانے کو تھا۔ وہ بھی اب ختم ہو رہا تھا۔

اُس بچے کو پانی پلا پلا کر ایک دن اور بتا دیا گیا۔ لیکن اس طرح تو بچہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی آواز گلے کے اندر ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ اور بظاہر یہ بھی نہ چلتا تھا۔ کہ وہ رو رہا ہے۔ وہ بار بار اس طرح منہ کھولتا، چھٹپٹاتا اور ہاتھ پاؤں مارتا کہ اسی کیمپ کے ایک دس بارہ سالہ لڑکے نے اُسے دیکھ کر آنند سے کہا "کتنا پیارا بچہ ہے۔ کس طرح چپ چاپ کلکاریاں مار کر کھیل رہا ہے"

اس معصوم طنز نے حقیقت کو اور بھی دردناک بنا دیا تھا۔ اور قریب تھا کہ آنند کا ضبط ٹوٹ جاتا۔ اس نظارے کی تاب نہ لا کر اپنے ہاتھوں

اسے مار ڈالنے کی ایک شیطانی خواہش اس کے اندر بار بار پیدا ہو رہی تھی۔ اور بار بار وہ اپنی پوری طاقت سے اُسے دبانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈوبتے ہوئے کو بچانے کے لئے وہ لڑکی دریا کی لہروں سے ایک شکستہ کشتی کی طرح نمودار ہوئی۔ اور اس نے ہوش میں آتے ہی اس بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا ... ... حتیٰ کہ اس بچے کے رونے میں آواز پیدا ہو گئی — زندگی کی آواز۔ اور وہ پھر زندہ ہو گیا۔

⁂ ⁂ ⁂

لیکن دوبارہ اُسے دودھ کون پلاتا۔

وہ لڑکی تو اس کے بعد قطبی برف کی طرح خشک ہو چکی تھی۔ جسے آنند کی آتشیں سے آتشیں باتیں بھی پگھلا نہ سکی تھیں۔

پھر دوسرا دن آ گیا۔ بچہ پھر بجھتا جا رہا تھا۔ اور لڑکی اسی طرح منجمد بیٹھی تھی۔

آنند نے اس کے قریب ہی بچے کو پیڑھی پر رکھتے ہوئے اس کے متعلق باتیں چھیڑ دیں۔

" اس بچے کی ماں کو مسلمان اٹھا کر لے گئے ہیں ... "

لیکن نہ جانے کس طرح اتنی سی بات ہی نے اس کی زبان کے تمام بند جیسے کاٹ کر پھینک دیئے۔ اس نے فوراً پوچھا

" تو کیا اسی لئے اس کے باپ نے اس معصوم کو بھی باہر پھینک دیا ۔؟ "

"نہیں اس کا باپ تو اپنی بیوی کی حفاظت کرتا ہوا پہلے ہی مارا گیا"
"اپنی بیوی کی حفاظت کرتا ہوا ۔ ؟ " اس نے حیرت سے پوچھا۔
گویا اُسے اعتبار نہ آیا ہو ۔ اور پھر جیسے ایک دم سے تمام بند کھل گئے ۔ اور وہ برف کے ایک بہت بڑے گلیشیر کی طرح پگھلتی ، ٹوٹتی اور گرتی ہوئی دکھائی دی ۔ اور پھر جیسے اس کی جمی ہوئی آنکھوں سے کئی دریا پھوٹ نکلے ۔
آنند چپ چاپ بیٹھا اس جمود کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھتا رہا وہ روتی رہی پھوٹ پھوٹ کر ۔ حتیٰ کہ اس میں سوچنے سمجھنے کی طاقت پھر سے لوٹ آئی ۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی ۔ پھر بھی سسکیاں لیتی رہی ۔ اور اسی طرح سسکیاں لیتے لیتے اُس نے کہا کہ ۔
"ہائے وہ عورتیں بھی ہوتی ہیں ۔ جن کو ایسے پتی ملتے ہیں "
آنند نے موقعہ دیکھ کر چوٹ کی " لیکن ایسے مرد بھی کتنے ہوتے ہیں ؟ "
"ہاں ۔ بہت تھوڑے ۔" وہ پھر کسی سوچ میں پڑنے والی تھی کہ آنند نے اس کا موقعہ نہ دے کر پھر اسے کریدنا شروع کر دیا ۔ حتیٰ کہ وہ اسی پگھلے ہوئے موڈ میں اُسے اپنی کہانی سنانے لگی ۔
" ہمارے گاؤں پر جب مسلمانوں نے حملہ کیا ۔ تو پربھات کا وقت تھا ۔ میں دریا کے کنارے سوکھی ٹہنیاں اکٹھی کر رہی تھی ۔ کیونکہ فصل تو اس سال ہوئی کہاں تھی ۔ جو ایندھن کے لئے سوکھے ڈنٹھل موجود ہوتے ۔ ہمارا گاؤں دریا کے اس کنارے پر کچھ اوپر کو ہے ۔ وہاں کنارا بڑا خوبصورت

ہے۔ اور سنبل کے بڑے بڑے درختوں کی ایک لمبی قطار بہت دور تک چلی گئی ہے۔ میں بچپن میں ان درختوں کی سب سے اونچی شاخوں تک چڑھ جایا کرتی تھی۔ اور پھر وہ رنگ دریا کی چمکتی ہوئی لکیر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ میں دریا میں تیرا بھی خوب کرتی تھی۔ جب میں تیرہ چودہ برس کی تھی۔ تو ایک ہی سانس میں دریا کے آر پار تیر سکتی تھی،،۔

وہ کچھ غیر متعلقہ باتوں کے ٹکڑے اس طرح جوڑتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے وہ کسی میٹھے سپنے کے درمیان بڑبڑا رہی ہو۔ اور آنند کو تو اس وقت دریا کی وہ بل کھاتی ہوئی چمکتی لکیر اور سنبل کے درختوں کی لمبی قطار اور اسکی شاخوں سے جھومتے ہوئے نکیلے سرخ پھولوں کے درمیان کسی پیاری سی بیل کی طرح جھولتی ہوئی ایک ننھی سی لڑکی جیسے یہ سب کچھ آنند کو اس کی آنکھوں میں جھولتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ ان آنکھوں میں ہونے والے اس ڈرامے کو بس دیکھے جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس لڑکی کو بھی اس بات کا احساس ہو آیا۔

اور پھر جیسے اس کا سپنا ایک دم سے ٹوٹ گیا۔ لڑیاں جیسے ٹوٹ کر دھول میں بکھر گئیں۔ اور وہ رومانی آسمانوں سے اتر کر پھر تلخ حقائق کی مٹی کریدنے لگی۔

,, مسلمان دریا کے اس پار سے کشتیوں میں بیٹھ کر ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے گئے تھے۔ میں لکڑیاں چنتی چنتی کنارے کے بالکل قریب آ چکی تھی۔ میرے پتی بھی تھوڑی ہی دور اسی کام پر لگے ہوئے تھے۔ میں نے کشتیوں کو ادھر آتے نہیں دیکھا۔ میں نے صرف کچھ آوازیں سنیں۔ کہ

,, سبحان اللہ۔ کیا جوان چھوکری ہے،،

"بھئی۔ بسم اللہ تو بہت اچھی ہے"

میں نے جو گھوم کر دیکھا۔ تو تین چار ہٹے کٹے مسلمان چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ بیسیوں ابھی کشتیوں سے اتر رہے تھے۔ اور ان کے پیچھے ابھی کئی اور کشتیاں آرہی تھیں۔

میری چیخ نکل گئی۔ اور میں لکڑیاں پھینک کر اپنے پتی کو آوازیں دیتی ہوئی ایک طرف کو بھاگی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرا پتی مجھ سے بھی پہلے بھاگنا شروع کر چکا تھا۔ اور اب تک بہت دور نکل گیا تھا۔ اُس نے غالباً مجھ سے پہلے ان کو اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لیکن مجھے بچانے کی بجائے وہ اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا۔

میں بھی اپنی پوری طاقت سے بھاگی مگر ... ... "

اور وہ چند لمحوں کے لئے رُک گئی۔

دوبارہ شروع کرتے ہوئے اس کی آواز پہلے سے دھیمی پڑ گئی تھی۔

"میری طرح گاؤں کی کئی عورتیں ان کے قبضہ میں آگئی تھیں۔ اپنے ہاں کے کئی بوڑھوں اور نوجوانوں کی لاشیں ہم نے گاؤں میں دیکھیں۔ لیکن ان میں ہمارے گھر کا کوئی نہ تھا۔ اور تب مجھے اپنے پتی کا بھاگ جانا بے حد عقلمندی کا کام نظر آیا۔ اُس نے خود کو بچا لیا تھا۔ اور میرے ننھے پریم کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔

میرے ساتھ کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں۔ جن کے خاوندوں کی لاشیں بھی اُن ہی گھروں میں تھیں۔ جہاں وہ دوسرے مردوں کی غلامی میں رہتی

تھیں۔ لیکن میں خوش تھی۔ کہ میرا پتی زندہ تھا۔ میرا پتر زندہ تھا ... "،
اور جیسے خوشی کے مارے اس کا گلا بھر آیا۔

" ہمارے گاؤں پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور ایک مہینے تک ہم
اپنے ہی گھروں میں غیر مردوں کے قبضہ میں رہیں "

پھر ایک دن ہم نے ان کی باتوں میں سنا۔ کہ دریا کے اس کنارے
کے گاؤں ہندستان میں آ گئے ہیں۔ اور دوسرے ہی دن انھیں پتہ نہیں
کس فوج کے آنے کی خبر ملی۔ کہ انھوں نے تمام عورتوں کو اکٹھا کر کے کشتیوں
میں بٹھایا۔ اور دریا کے اس پار اپنے گاؤں میں لے آئے۔

ایک ایک عورت کے ارد گرد دس دس پندرہ پندرہ مرد بیٹھے ہوئے
تھے۔ تھوڑا بہت سامان جو ہمارے گھروں میں تھا اُسے تو وہ پہلے ہی
اپنے گاؤں بھجوا چکے تھے۔ آخری سامان صرف ہم رہ گئی تھیں۔ سو وہ ہمیں
بھی لے آئے۔

مجھے نجانے کیوں ان کے ہاں اپنے لے جائے جانے کا اتنا غم
نہ تھا۔ جتنی خوشی اس بات کی تھی۔ کہ ہمارا گاؤں ان کے چنگل سے آزاد ہو گیا
تھا۔ شائد اس خوشی کی تہہ میں یہ امید چھپی ہوئی تھی۔ کہ گاؤں کے آزاد ہوتے
ہی وہ پھر اپنے گھر آ جائیں گے ——— اپنے اسی گھر میں۔ اپنے اسی گاؤں
میں ——— جو صرف دریا کے دوسرے کنارے پر تھا۔ وہ دوسرا کنارہ جسے
میں ہر روز ہر وقت دیکھ سکتی تھی۔ اور جب سے آئی تھی۔ دیکھتی ہی رہتی
تھی۔

ان ہی دنوں راوی میں پانی بڑھ رہا تھا۔ اس کا پاٹ چوڑا ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن دوسرا کنارہ جیسے میری آنکھوں کے اور بھی نزدیک آتا جا رہا تھا ہر دن جو بیت رہا تھا۔ میری نگاہوں کی طاقت بڑھا رہا تھا۔ اور دور ہوتے ہوئے دوسرے کنارے کی چیزیں واضح سے واضح تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اور ... ...

اُس نے جیسے لمحہ بھر کے لئے رکنے کی کوشش کی۔ لیکن داستان کے اس مقام پر آکر ایک لمحے کا قیام بھی شائد اس کے بس میں نہ تھا۔ اور وہ پھوٹتی چلی گئی۔

"اور پھر ایک دن میں نے اپنے پریم کو دریا کے کنارے پر کھیلتے دیکھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُسے ابھی تک اچھی طرح چلنا بھی نہیں آیا۔ چنانچہ وہ دو قدم چلتا اور گر پڑتا۔ اس کا باپ شائد قریب ہی لکڑیاں چن رہا تھا لیکن مجھے ان پر بہت غصہ آیا۔ دریا کی لہریں بپھری ہوئی تھیں۔ باڑھ آنے کے آثار تھے۔ اور انھوں نے اُسے کھیلنے کے لئے کنارے پر اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ جب تک میں واپس نہ پہنچوں۔ کیا انھیں اس کی حفاظت بھی اچھی طرح نہ کرنی چاہئے تھی۔ میں تڑپ اٹھی۔ میں ایک بار وہاں جاکر اُن سے کہہ آنا چاہتی تھی۔ کہ جب تک میں لوٹ نہ آؤں۔ پریم کو اس طرح ندی پر اکیلا نہ چھوڑ دیا کریں۔ لیکن وہاں ایک بار ذرا سی دیر کے لئے جانا بھی ممکن کہاں تھا میں اور میری طرح ہر عورت ان وحشیوں کے درمیان جکڑی ہوئی تھی۔"

اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ لیکن پھر بھی جب اس نے دوبارہ بات

شروع کی۔ تو جیسے اس کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ آنندیتا کی طرح بیٹھا بس سنتا رہا اور وہ اس طرح کہتی رہی۔ جیسے وہاں کوئی سننے والا تھا ہی نہیں۔ اور کہ وہ اپنے آپ کو سنا رہی تھی۔

"پھر مجھے اچانک خیال آیا۔ کہ کہیں وہ مجھے تو نہیں ڈھونڈ رہا۔ وہ اسی بڑے سنبل کے نیچے پھر رہا تھا۔ جہاں اس روز میں لکڑیاں چن رہی تھی، تو گیا انھوں نے اُسے یہ بتا دیا تھا۔ کہ اس جگہ سے مسلمان مجھے اٹھا کر لے گئے تھے۔ یہ سوچ کر مجھے ان پر اور بھی رنج ہوا۔

اُسے ابھی پوری باتیں کرنا تو کہاں آیا تھا۔ لیکن جب میرے واپس جانے پر وہ اپنی توتلی زبان میں صرف ایک لفظ میں کئی سوال بھر کر مجھ سے کہے گا "مسلمان؟" تو میں اسے کیا جواب دوں گی۔ اور اب وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ اس سنبل کے موٹے تنے کے ارد گرد وہ اپنی ماں کو کہاں ڈھونڈتا ہوگا۔ وہ کس طرح مجھے بلا رہا ہوگا۔

"ماں — ماں"

"ماں واری جائے بیٹا" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ لیکن اس تک آواز نہ پہنچ سکی۔ اور میں بے چین ہو اٹھی۔

اسنتے میں اور غضب ہو گیا۔ کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا چلنے کی کوشش میں کنارے کے پاس ہی گر گیا۔ پانی کی لہریں اس کے قریب تک آ رہی تھیں۔ چنانچہ مجھ سے اور برداشت نہ ہو سکا۔ اور میں اس دو منزلے مکان کی کھڑکی سے جہاں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پلک جھپکنے میں ساتھ

والے ایک منزلے مکان کی چھت پر کود پڑی۔

وہ گھاس کی چھت کہاں سے ٹوٹی اور میں کہاں کہاں سے چھلی، مجھے کچھ خبر نہیں۔ صرف یہ خبر ہے۔ کہ زمین پر جہاں میں گری۔ وہاں بہت سا کیچڑ اور گارا تھا۔ لیکن رکنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ چنانچہ میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے سیدھا دریا کا رخ کیا۔

اپنی پوری طاقت سے تیر رہی تھی۔ لیکن نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اور کیا دیکھتی ہوں۔ کہ وہ بھاگے ہوئے آئے۔ اور انھوں نے پریم کو اٹھا کر گود میں لے لیا۔ بس میرے سانس میں سانس آیا۔ تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا۔ اور ساتھ ہی جس کنارے سے آئی تھی۔ اس کنارے پر بہت شور سنائی دیا۔ سر گھما کر دیکھا۔ تو سارے گاؤں کے مسلمان آ گئے تھے۔ ایک کشتی تیار کی جا رہی تھی۔ اور طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ اور کہ اب اگر میں پکڑی گئی تو اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔

سب کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔ چنانچہ میں نے تیرنا چھوڑ دیا۔ ایک دم غوطے کھانا شروع کر دیئے۔ اور پھر ایک ایسی لمبی ڈبکی لگائی۔ کہ انھیں یقین ہو جائے کہ میں واقعی ڈوب گئی ہوں۔

درمیان میں میں نے سانس لینے کے لئے جب ایک دوبار سر نکالا۔ تو دیکھا۔ کہ پریم اپنے پتا کی گود میں بیٹھا گھر کی طرف واپس جا رہا ہے کتنا جی چاہا کہ انھیں زور سے آواز دوں کہ "ٹھہرو۔ میں بھی آ رہی ہوں۔" ایسا

دن جس جگہ پر تم مجھے کھو گئے تھے۔ آج اسی جگہ سے اکٹھے واپس گھر چلیں گے ۔" لیکن پھر اس کنارے کے مسلمانوں کا خیال آتا۔ اور میں بہانے کے طور پر ڈوبنے والے کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگتی۔ اور پھر غوطہ مار جاتی دو تین بار ایسا کرنے کے بعد جب میں نے دوبارہ باقاعدہ طور پر تیرنا شروع کیا۔ تو مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے کئی روز سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ اور مجھ میں وہ طاقت نہیں رہی۔ میں درمیان تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن اس کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اب مجھ سے اور نہ تیرا جا سکے گا۔ اس مکان سے چھلانگ لگانے سے بھی شاید کئی چوٹیں لگی تھیں جو ٹھنڈے پانی میں ابھر آئی تھیں۔ لیکن پھر مجھے پریم کا خیال آیا۔ ان کا خیال آیا۔ اور میں سوچنے لگی کہ پریم مجھے دیکھتے ہی کس طرح میری چھاتیوں سے چپٹ جائے گا۔ اور گٹر گٹر کر کے دودھ پینا شروع کر دے گا۔ اور پھر مجھے یوں لگا۔ جیسے میں بازوؤں کے زور پر نہیں اپنی چھاتیوں کے زور پر تیر رہی ہوں۔

* * *

میں دوسرے کنارے پر لگی تو سانجھ ہونے کو آ گئی تھی۔ اور میرا گاؤں بہت اوپر رہ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دوسرے کنارے پر قدم رکھتے ہی جیسے میری ساری تھکاوٹ، ساری پریشانی دور ہو گئی تھی۔ میں آخر آزاد ہو گئی تھی ـــــ اور اپنے ہندوستان کی دھرتی پر پہنچ گئی تھی۔ میری آتما خوشی سے تھرتھرا اٹھی۔ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی۔ میں بیان

نہیں کر سکتی۔ بس یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کے اندر بیٹھا خوشی سے ناچ رہا ہو۔ اور میں گیلے کپڑوں کے بوجھ کے باوجود تیزی سے اپنے گاؤں کی طرف بھاگ رہی تھی۔ گیلے کپڑے ایک دوسرے سے اٹکتے رہے۔ پاؤں اوبڑ کھابڑ زمین پر ٹیڑھے میڑھے ہو کر پڑتے رہے۔ لیکن میں نے ایک بھی ٹھوکر نہیں کھائی۔ ایک بار بھی نہیں پھسلی۔ اور بھاگتی چلی گئی۔

* * *

ہمارے گاؤں میں کئی چراغ جل رہے تھے۔ جیسے میرے آنے پر دیپ مالا کی گئی ہو۔ اور ان سب سے اوپر ہمارے دو منزلے مکان کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس گاؤں میں صرف ہمارا ہی مکان دو منزلہ ہے میرے سسرال والے کئی پیڑھیوں سے وہاں ساہوکارے کا کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ آس پاس کے گاؤں میں سب انھیں جانتے ہیں۔

میں اپنے گھر کے قریب پہنچ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی۔ کہ کل آس پاس کے کئی گاؤں سے لوگ انھیں مبارک باد دینے آئیں گے۔ ان کی بہو ظالموں کے پنجوں سے بچ کر نکل آئی تھی۔ لوگ اس کی بہادری اور حوصلے کے چرچے کریں گے۔ دور دور سے عورتیں مجھے دیکھنے آئیں گی۔ جو اس طرح تن تنہا اس خون کی ندی کو چیر کر زندہ نکل آئی تھی۔ اور پریم ــــ! وہ بھی تو صرف ایک ہی لفظ میں کئی سوال بھر کر پوچھے گا ــــــ مثلاً ــــ؟ تو ــــ؟

میں نے سوچ لیا تھا کہ میں آج رات ہی اپنے پتی سے لڑوں گی کہ انھوں نے اس بچے کو یہ سب کچھ کیوں بتایا۔ اسے انھوں نے یہ کیوں نہ کہدیا

کہ " وہ تمھاری نانی کے ہاں گئی ہوئی ہے "۔ لیکن پھر وہ جواب دیں گے کہ۔
"میں یہ کیسے کہہ دیتا۔ تمھاری ماں تو خود یہاں تمھیں ڈھونڈنے آئی تھی۔ وہ
پریم کو گود میں لے کر کتنی دیر تک روتی رہی۔ اور میں نے سوچا۔ کہ میری ماں بھی
کتنی خوش ہوگی۔ وہ یہ خبر سن کر پھر ہمارے گاؤں بھاگی آئے گی۔ اور اب کے
بھی روئے گی۔ لیکن یہ رونا کتنا خوشی کا رونا ہوگا۔ میں جب بھی میکے سے
سسرال روانہ ہوتی ہوں۔ تو وہ بے حد رویا کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے
اپنے ہاں بہت دن نہیں رہنے دیتی۔ ہمیشہ یہ کہا کرتی ہے۔ کہ " بیاہ کے بعد
بیٹی کے لئے ماں کے گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ اس کی خوش قسمتی یہی ہے کہ وہ
وہیں اپنے پتی کے قدموں میں اسی کے گھر مرے "

میں سوچتی جا رہی تھی۔ اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ کہ کب میں اپنے مکان
کے دروازے پر پہنچ گئی۔ عین اس وقت وہ باہر کا دروازہ بند کر کے اس کی
کنڈی چڑھا رہے تھے۔ میرے جی میں ایک شرارت آئی۔ میں نے سوچا کہ
انھیں پتہ نہیں کہ اس وقت جب وہ مکان کا دروازہ بند کر رہے ہیں۔ ان
کے من کے دوار کھولنے کا وقت ہے۔ چنانچہ جی میں آئی۔ کہ بار بار دروازہ کھٹ
کھٹاؤں۔ اور بار بار جب وہ کھول کر پوچھیں کہ " کون ہے "۔ تو ہر بار چھپ
جاؤں۔ اور اسی طرح کرتی رہوں۔ حتیٰ کہ وہ تنگ آ کر خود باہر نکلیں اور چور کو
ڈھونڈنے کے لئے پرالی کے اس ڈھیر کے پیچھے تک آئیں جہاں میں چھپی
ہوں۔ تو ... ... !" لیکن ہوا یہ کہ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو
انھوں نے اندر سے ہی آواز دیکر پوچھا۔ "کون ــــ ؟" میں چپ رہی۔ پھر

آواز آئی۔ "کون ہے ۔۔؟" لیکن دروازہ نہیں کھلا۔

میں سمجھ گئی کہ پچھلے واقعات کا خوف ابھی تک اب ان پر اس طرح طاری ہے۔ کہ وہ ایک دم سے دروازہ بھی نہیں کھول سکتے۔ اور مجھے ان پر رحم آ گیا۔ ویسے بھی میں ان کی آواز سن کر چپ نہ رہ سکی۔ اور میں نے جلدی سے کہا۔ "میں ہوں۔ نرملا"۔

پتہ نہیں کیوں میری آواز اتنی دھیمی تھی۔ جیسے کسی کے کان میں کچھ کہہ رہی ہوں۔ لیکن انھوں نے سن لیا تھا۔ کیونکہ انھوں نے حیرت کے مارے جلدی سے کہا۔۔۔ "تم ۔۔۔۔۔!!" اور پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ مکمل خاموشی جیسے سارے سنسار کی نبضیں ایک دم سے تھم گئی ہوں۔ اور جیسے وقت بھی تھم گیا۔ حتیٰ کہ ایک پل بھی ۔۔۔۔۔ وہ منجمد، خاموش ایک پل بھی جیسے ایک مدت میں بیتا۔ اور پھر دوسرا پل ۔۔۔۔۔ اسی طرح بیت گیا۔ لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ شاید انھیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔

میں نے سنا ہوا تھا کہ ایک دم خوشی کی جھپیٹ میں آ جانے سے کبھی کبھی آدمی بے ہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی کوئی تو مر بھی ... ! میں ڈر گئی۔ میں نے زور زور سے دروازے کو تھپتھپانا شروع کر دیا۔ "دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔ میں ہوں نرملا۔ نرملا"۔

آخر دروازہ کھلا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ میرا پتی نہ تھا۔

وہ پھر اچانک چپ ہو گئی۔ جیسے سہم گئی ہو۔ اس نے آنند کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے اس سے پہلے اُسے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔

کہانی نے یہاں پہنچ کر اس زور کا جھٹکا دیا تھا۔ کہ آنند اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔

"تو پھر وہ کون تھا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا

"وہ میرا پتی نہ تھا۔" اُس نے آواز میں بغیر کسی غیر معمولی اتار چڑھاؤ کے وہی فقرہ سادگی سے دہرا دیا" وہ جس نے بھری پنچائت میں میرا پانی گرہن کیا تھا۔ جس نے شادی کے وقت منتروں کے ساتھ کئی طرح کے پرن اور وعدے کئے تھے۔ وہ پتی وہاں نہ تھا۔ گو شکل صورت میں اس وقت بھی وہ ویسے ہی تھے۔ لیکن ... ... لیکن پتہ نہیں اُنھیں کیا ہو گیا تھا۔ انھوں نے اول تو جیسے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ اور پھر انھوں نے نہایت ٹھنڈی آواز میں کہا۔ کہ "اب یہاں کیا کرنے آئی ہو"

گویا کسی نے برف کی بنی ہوئی چھری میرے کلیجے میں بھونک دی میری رگوں میں خون برف کی ڈلیاں بن کر اٹک گیا۔ اور زبان سوکھی لکڑی کے ایک ٹکڑے کی طرح چبھنے لگی۔ میں جواب کیا دیتی۔ میں انھیں کیا بتاتی کہ میں کیا کرنے آئی ہوں ...

اتنے میں میرے سسر کی کھڑاؤں کی آواز آئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح رام نام کا پٹکا لپیٹے آنگن میں آئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کے چرن چھوئے لیکن انھوں نے آشیرباد بھی نہیں دیا۔ اپنے بیٹے کی طرف ایک بار سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر میری طرف اور پھر ان کی زبان سے نکلا — "رام۔ رام"۔ جیسے میرے ناپاک لمس سے بچنے کے لئے وہ رام رام

کی پناہ ڈھونڈ رہے ہوں۔

اس کے بعد ایک مردہ سی خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے کترا رہے تھے۔ مجھ پر ہر لحظ ایک احساسِ گناہ طاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے اس ڈراؤنی خاموشی کے درمیان رفتہ رفتہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے کلنک کی مہریں آگ میں تپا کر میرے جسم کے ایک ایک عضو پر داغ دی ہوں۔ اور گیلے کپڑوں کے اندر بھی مجھے اپنا ایک ایک عضو دہکتا اور جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ حتیٰ کہ کپڑوں کا احساس بھی جاتا رہا۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا۔ گویا میں اپنے سسر کے سامنے بالکل ننگی کھڑی ہوں۔ پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے بدن پر سے وہ پٹکا نوچ لیا۔ جس پر ہزاروں "رام نام" چھپے ہوئے تھے۔ اور اسے اپنے گرد لپیٹ لیا۔ لیکن ... ... میں پھر بھی ننگی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہے بے چاری" میرے سسر نے ہمدردانہ لہجے میں کہا

"پاگل تو ہے ہی" میرے پتی نے جواب دیا "ورنہ اس طرح یہاں نہ چلی آتی"۔

"میں اب تک پاگل نہیں تھی۔ مگر اب ہو رہی ہوں"۔ میں نے چلّا کر کہا۔

"ہشت۔ آہستہ آہستہ" میرے سسر نے دھیمے سروں میں کہا "آس پاس کے لوگ جاگ جائیں گے۔ انھیں تو یہ پتہ ہے کہ تم مر چکی ہو"

"جھوٹ ہے۔ انھیں پتہ ہے کہ ہمارے گاؤں کی لڑکیاں وہ

اٹھا کر لے گئے تھے"۔ میری زبان چلنی شروع ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ اس کی بیٹی یا بہو نے دریا میں ڈوب کر اپنی عزت بچالی"

"تو کیا اب ان میں سے کوئی بھی اپنی لڑکی کو واپس نہیں لائے گا"

"مُردوں کے بھوت نا گھر میں کون رکھتا ہے"

"ہے رام۔ کتنا گھور انیائے ہے" اور میں رونے لگ گئی۔

"انیائے نہیں سنسار کا بیوہار ہی ایسا ہے۔ عزت آبرو کے بنا یہاں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا" میرے سسر مجھے بڑے آرام سے سمجھا رہے تھے "تم تو ہر روز رامائن پڑھا کرتی تھیں۔ کیا خود بھگوان رام نے بھی اپنے کل کی لاج کے لئے سیتا کو گھر سے نہیں نکال دیا تھا۔ اور پھر ماتا سیتا تو ستی تھیں"۔

"ماتا سیتا تو ستی تھیں" یہ کہہ کر جیسے طنز کا ایک نیا انگارہ میرے جسم پر رکھ دیا گیا تھا۔ جس سے وہ سارے داغ پھر سے دہکنے لگ گئے۔ رامائن لکھنے والے رشیوں کے لئے میرے دل سے بددعا نکلی۔ کیا انھوں نے اسی لئے رامائن لکھی تھی۔ کیا اسی لئے ہندو استریوں کو ہر روز رامائن پڑھنے کو کہا جاتا ہے۔ کیا اُن رشیوں نے اسی لئے ہرپتی کو بھگوان بنا دیا تھا۔ کہ ان کے ہر انیاچار کو مریادا کی سند مل جائے"۔ اور وہ میرا مریادا پرشوتم پتی چپ چاپ کھڑا سن رہا تھا۔

مجھے اس پر قطعی غصہ نہیں آیا۔ جو شخص اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی کو غیروں کے نرغے میں گھرتا ہوا دیکھ کر کائروں کی طرح بھاگ سکتا تھا

وہ اب اسے اپنے خاندان کی عزت کے ہاتھوں تباہ ہوتا دیکھ کر اور کیا کر سکتا تھا۔

گھر سے نکالتے ہوئے میرے سسر نے مجھے شاباشی دی کہ "تم نے بڑی عقلمندی کی کہ رات کے اندھیرے میں یہاں آئی ہو۔ ورنہ استنے بڑے گھرانے کی لاج مٹی میں مل جاتی"۔

آتے ہوئے میری ڈھارس بندھانے کے لئے اس نے یہ بھی کہا کہ "دکھی ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے ان سے پورا بدلہ لے لیا ہے۔ جتنی عورتیں ہمارے گاؤں کی وہ اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ ہم ان کی عورتیں گاؤں میں لے آئے ہیں"۔

"اور انھیں آپ نے اپنے گھروں میں بسا لیا۔؟" میں نے چڑ کر پوچھا۔

"ہاں — انھیں اپنے گھر میں رکھنا تو فخر کی بات ہے" میرے سسر کی چھاتی فخر سے پھول اٹھی — اور انھوں نے اندر مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "اپنے ہاں بھی دو ہیں"۔

اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں سن سکی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ابھی تک عورتیں اغوا کرنے والوں، دلالوں اور بردہ فروشوں کے جال میں پھنسی ہوئی ہوں۔

میں وہاں سے بھاگی۔ اور بھاگتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

بھاگتی چلی جا رہی تھی، اور سوچ رہی تھی کہ میں آخر بھاگ کر کہاں جا رہی ہوں۔ شریف عورت کے لئے "اپنے" ہندوستان میں بھی مجھے وہی کچھ دکھائی دیا۔ جو ان کے پاکستان میں تھا۔ یہ دونوں ملک ان مردوں کے تھے، جنھوں نے شرافت کے نقلی پردے پھاڑ کر اپنے اصلی رنگ میں عورت کے ننگے جسم کے گرد ناچنا شروع کر دیا تھا۔ خود عورت کے لئے ان میں کوئی جگہ نہ تھی۔ زمینوں کی طرح ہمارے جسموں کا بھی بٹوارہ تو انھوں نے کر لیا تھا لیکن ایک عورت، ایک ماں کو شاید کوئی بھی اپنے حصے میں لینا نہ چاہتا تھا میں سوچ رہی تھی۔ اور بھاگتی چلی جا رہی تھی لیکن مجھے کہیں پناہ نہ مل رہی تھی۔ ہر جگہ مجھے ہندوستان کی زمین دکھائی دے رہی تھی۔ اور اس زمین پر جگہ جگہ مجھے اس عورت کے خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ جس کی عصمت دری پاکستان اور ہندوستان نے مل کر کی تھی۔ اس عیاشی کے لئے وہ دونوں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اور میں ان دونوں کی پہنچ سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی۔

میرے سامنے راوی تھی۔ اور مجھے وہ بھی اپنی ہی طرح پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جکڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس کو ایک کنارے سے ہندوستان نے پکڑ رکھا تھا۔ اور دوسرے سے پاکستان نے۔ لیکن پھر بھی اس کی پونتر لہریں اپنی عصمت بچانے کے لئے کہیں بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ مجھے اپنی ساتھنیں مل گئیں۔ میں نے سوچا کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ بچا کر لے جائیں گی۔ میں بہت تھک گئی تھی۔ اور مجھ سے اب اکیلے بھاگا نہیں

جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ لیکن ... ...
... وہ بھی مجھے چھوڑ گئیں۔ شاید اس لئے کہ میں ان کی طرح پوتر نہیں تھی،
میری عصمت لٹ چکی تھی ——————!!!

* * *

اس نے کہانی ختم کرتے ہوئے آنند کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ نجانے کب وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ اور کیمپ سے پرے ایک درخت کے تنے سے لگا بے تحاشا روئے چلا جا رہا تھا۔

اس وقت اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہ اس کی اپنی کہانی ہو۔ اوشا کی کہانی ہو۔ اس کی جیب میں اب تک وہ خط پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جو اس نے اپنی صفائی میں لکھا تھا۔ لیکن جسے پہنچانے تک کی فرصت اوشا نے اُسے نہ دی تھی۔

اس وقت سے اب تک وہ اپنی کہانی بار بار کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی کی شکل میں آ کر اس کو سنا جاتی تھی۔ لیکن خود آنند کی سننے والا کوئی نہ تھا۔ اپنی تڑپ کو زہر کے ایک ہی گھونٹ سے ٹھنڈا کر کے وہ ظالم اب اسے بار بار تڑپا کر شاید اپنا بدلہ لے رہی تھی۔ کئی بار اس نے اس خط کو کسی کے آگے رکھ کر کہنا چاہا تھا کہ "مجھے معاف کر دو۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی تھی میں نے اس لئے تمھیں نہیں چھوڑا تھا۔" لیکن ہر بار اوشا اس کی کھلی اڑاتی ہوئی اس سے پہلے ہی کہیں غائب ہو جاتی۔ اپنی کہانی سناتے وقت وہ سب اوشا ہی کی زبان سے بولتیں۔ لیکن جب وہ اپنا خط نکالنے لگتا۔ تو کوئی

صغرا بن جاتی۔ اور کوئی اپنا نام نرملا رکھ لیتی۔ اور وہ اس خط پہ اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر کے محض آنکھوں میں آنسو بھر کر رہ جاتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ اس دن بے بس اور چپ رہ گیا تھا۔ جب وہ اس کی طرف ایک نظر تک دیکھے بغیر اس ٹرک میں بھری ہوئی لاشوں کے درمیان کھو گئی تھی۔ لیکن آج وہ چپ نہ رہ سکا تھا۔ آج اس کے آنسو اپنے اختیار میں نہ رہ سکے چنانچہ وہ ایک درخت کے تنے سے لگا ہچک ہچک کر رو رہا تھا کہ کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔۔۔ "بھیا۔"

چونک کر دیکھا۔ تو کشن چند کھڑا تھا۔ شاید وہ اپنے بھانجے کے متعلق کوئی بری خبر لایا تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ دودھ کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اور یہ لڑکی اوشا نہیں تھی۔ نہ وہ اس کا بیٹا۔ کہ وہ اسے مجبور کر لیتا۔

"آپ کو بہت ڈھونڈا بھیا۔"

اور جب آنند نے محض آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے وجہ پوچھی۔ تو وہ خوشی کے جوش میں کہنے لگا۔

"بس اب بچہ بچ جائے گا۔ اب اُسے کچھ نہیں ہوگا ... وہ لڑکی اُسے دودھ پلا رہی ہے۔ اس نے اُسے گود میں لے لیا ہے۔ تم نے اسے منا کر مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔"

اور واقعی جب اس نے آ کر دیکھا۔ تو وہ لڑکی بڑے پیار سے اسے دودھ پلا رہی تھی۔ اور ہاتھوں سے اس کے بال ٹھیک کرتی ہوئی اُسے سلانے

کی کوشش کر رہی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ !

بالکل اسی طرح جس طرح اس وقت وہ اسے سلانی خود سو گئی تھی ۔ بچے نے ابھی تک اس کی دھوتی کے ایک چھور کو اپنے ننھے ہاتھوں میں بھینچ رکھا تھا ۔ اور بالکل اسی کا بچہ معلوم ہو رہا تھا آنند انھیں دیکھ رہا تھا ۔ اور پچھلے کئی دن کے واقعات ایک فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے آگے چلتے ، رکتے اور بھاگتے چلے جا رہے تھے ۔ اس نے اخبار کا ایک حرف نہ پڑھا تھا ۔ البتہ اس ایک آدھ گھنٹے میں اس نے کئی ماہ کی زندگی پھر سے بتا دی تھی ۔ اور وہ اس میں کچھ اس طرح کھویا رہا ۔ کہ اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ سورج کب ڈوب گیا ۔ اور چاند کب آسمان کی اونچائیوں تک پہنچ گیا ۔

نواں باب

ہوا کے ایک سرد جھونکے نے اس کے بدن کو تھرتھرا دیا ۔ اور جیسے اس کے ساتھ ہی یہ جادو سا ٹوٹ گیا۔ وہ اس طرح اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جس طرح کوئی خواب دیکھنے کے بعد جاگ اٹھتا ہے ۔

چاندنی اس کے خیمے کے اندر آرہی تھی ۔ اور وہ خیمہ ہی کیا تھا۔ درختوں کی تین چار لمبی ٹہنیاں زمین میں گاڑ کر ان کے اوپر سائے کے لئے ایک چادر تان دی گئی تھی ۔ اسی طرح کی پندرہ بیس چادریں ، دھوتیاں ۔ اور کھیس آس پاس کی زمین پر بھی تنے ہوئے تھے ۔ اور انھیں وہ لوگ خیمے کہہ لیتے تھے

ان کے اندر دھوپ بھی آتی تھی۔ اور بارش کی بوچھاڑ بھی۔ لیکن پھر بھی ان سب کو ان کے نیچے بیٹھنے سے پناہ ملنے کا سا احساس ہوتا تھا پتہ نہیں انسان اپنے اور آسمان کے درمیان ایک پردہ ڈال لینے ہی سے اپنے آپ کو محفوظ کیوں سمجھنے لگ جاتا ہے؟

ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ اور زمین بھی بہت سرد ہو گئی تھی۔ اسے سردی کا احساس ہوا۔ اس نے اٹھ کر ایک انگڑائی لی۔ اور اپنے گرد لپیٹنے کے لئے کسی چیز کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ لیکن وہاں کیا تھا۔ صرف ایک پھٹا ہوا کھیس تھا۔ جسے نرملا نے آدھا اس بچے کے نیچے بستر کے طور پر بچھا کر آدھا اس کے اوپر ڈال رکھا تھا۔ چاندنی دونوں کے چہروں کو روشن کر رہی تھی۔ اور دونوں نہایت اطمینان سے سو رہے تھے۔

نرملا اکثر اس بچے کے ساتھ اب اسی کے خیمے میں سو جایا کرتی تھی۔ ویسے بھی اس کیمپ میں کسی کے لئے بھی کوئی جگہ مخصوص نہ تھی۔ مصیبت نے انھیں اخلاقی تکلفات سے بے باک کر دیا تھا۔ ہر کوئی اس قدر خود غرض ہو چکا تھا۔ کہ کسی کو کسی بھی قسم کی کوئی رعائت دینے کا سوال ہی ان کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔ اور پھر عورت کو عورت کے طور پر وہاں دیکھتا ہی کون تھا۔ بھوک نے انھیں جنسیات سے بالکل آزاد کر دیا تھا۔ چنانچہ عورتوں کے لئے کسی الگ انتظام کا خیال تک کسی کو نہ آیا تھا۔ یوں بھی وہاں صرف دو ہی تو عورتیں تھیں۔ ایک نرملا۔ اور دوسری ایک ادھیڑ عمر کی عورت۔ جو صوبہ سرحد کے کسی ضلع کی تھی۔ اور جسے اس کے

ساتھیوں کا قافلہ اس لئے راستہ میں چھوڑ گیا تھا۔ کہ وہ ان کے ساتھ تیز نہیں چل سکتی تھی۔ اُسے سب "نانی" کہتے تھے۔ جوانی میں اس کا پورا نام کیا رہا ہوگا۔ جس کا اب یہ مخفف ہو گیا تھا۔ یہ شائد اُسے خود بھی یاد نہ رہا تھا۔

بڑھیا کہاں سوتی تھی۔ اس کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ لیکن نرملا اگر کہیں اور بھی سوئی ہوئی ہو۔ تو اس بچے کے روتے ہی وہ فوراً اٹھ کر آنند کے خیمے میں پہنچ جاتی۔

کسی بار اُسے اور اس بچے کو اپنی اس کپڑے کی چھت والی کھلی "جھونپڑی" میں سویا ہوا دیکھ کر آنند سوچتا کہ "اگر یہ اوشا اور اس کا بچہ ہوتے!!"

اور پھر اُسے یاد آتا۔ کہ کس طرح کئی بار ان دونوں نے مل کر سوچا تھا۔ کہ "ہم دونوں مل کر ساری دنیا کا مقابلہ کریں گے" اور پھر ہر طرف کی مخالفت سے تنگ آکر اوشا نے کتنی ہی بار اس سے کہا تھا کہ "چلو آنند۔ اس دنیا سے کہیں دور چلے جائیں۔ یہ چاندی اور سونے کی بڑی بڑی عمارتیں اور یہ جگمگاتے ہوئے شہر ہماری تمہاری محبت پر ہنستے ہیں۔ چلو کسی جنگل میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا لیں گے۔ وہاں رہیں گے۔ جہاں ہم کو کوئی تیسرا نہ دیکھے گا"

اور کبھی کبھی آنند چھیڑنے کے لئے کہہ دیتا کہ "اگر تیسرا وہ "منا میاں" ہو گیا۔ تو ...."

ایک کنواری سی لاج کے مارے اوشا کا چہرہ صبح کی پہلی کرن کی طرح لال ہو جاتا۔ اور وہ منہ پھیر کر کہتی کہ "اتنا ہی شوق ہے۔ تو اسے تمہیں گود میں لیکر کھلایا کرنا"

اور آج ایک انجانے مقام پر ایک ننھی سی جھونپڑی میں جب وہ اس بچے کو گود میں لے کر کھلاتا۔ تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اوشا کا حکم پال رہا ہے اور کہ یہ بچہ اوشا کا بچہ ہے اور وہ اس کے کہنے کے مطابق اُسے کھلا رہا ہے۔

یہی وجہ تھی۔ کہ وہ اس بچے کو اپنے خیمے ہی میں رکھتا تھا۔ کشن چند کے پاس بھی نہ بھیجتا تھا۔ کیونکہ وہ ڈرتا تھا۔ کہ کہیں اوشا یہ نہ کہے کہ "تم سے اتنی سی ذمہ داری بھی نہ سنبھالی گئی"۔ لیکن اوشا ——— اوشا کہاں ہے؟ یہ سوال اکثر اس کے دل میں اٹھتا۔ مگر بجانے کس طرح اس کے جواب میں اوشا کی کہیں قریب ہی موجودگی کا احساس بھی اُسے پوری طرح ہوتا۔ وہ کہیں آس پاس ہی تھی۔ اور اس کی ہر حرکت کو دیکھ رہی تھی ——— پھر اُسے خیال آتا۔ کہ شائد اوشا کی روح اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہو۔ وہ ان باتوں کو محض واہمہ سمجھ کر دل سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ایسا کر نہ پاتا۔

حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس پر یہ احساس چھا گیا۔ کہ نرملا کو اوشا نے اس کا امتحان لینے کے لئے بھیجا ہے۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ۔ اگر تمھارے بقول میں نے غلط شک کے ماتحت زہر کھا لیا ہے۔ تو یہ ہے نرملا۔ میرا دوسرا روپ۔ میری ہی طرح کی مظلومیت کا نشان۔ اب یہی ثابت کر دو۔ کہ تمھیں مجھ سے نفرت نہیں ہے"

اور جوں جوں یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ نرملا کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اس پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ اس سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ اس کے پتی کی طرح بے درد اور بے وفا نہیں ہے۔

وہ وہ نہیں ہے جو اُسے اوشا نے سمجھا۔ یا پھر اس کا دوسرا رُخ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہ چاہتا تھا۔ کہ نرملا بھی اُسے وہی نہ سمجھے۔ جو اوشا نے سمجھا تھا۔

لاہور کے واقعات نے اس کی قوتِ تمیز کو ایک زبردست جھٹکا دے کر سُن کر دیا تھا۔ اور اس پر واقعات اور ماحول نے نرملا اور اوشا میں اتنی مطابقت پیدا کر دی تھی۔ کہ وہ کھویا کھویا سا اکثر نرملا کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرتا۔ جو اپنی دانست میں اُسے اوشا کے ساتھ کرنا چاہئے تھا۔ اور اس میں اُسے ایک سکون سا ملتا۔

وہ جب لاہور سے مغربی پنجاب کی طرف اس خیال سے روانہ ہوا تھا کہ مرجھائے ہوئے پھولوں کو ہنسانے کی کوشش میں فنا ہو جانے والی شبنم کی طرح اُسے بھی اپنا سرمایۂ حیات زندگی کے ان اجڑے ہوئے گلستانوں میں لٹا دینا ہو گا۔ جہاں انسانیت زخمی ہو کر سسک رہی ہے۔ اور نفرت و دہشت کا مارا ہوا انسان کسی کی مدد کا منتظر ہے۔ تو اپنے لائحہ عمل کی کوئی واضح تصویر اس کے سامنے نہ تھی۔ اس کا میدانِ عمل کون سا ہو گا۔ اس کا کوئی خاکہ اگر اس کے ذہن میں تھا۔ تو وہ نہایت دھندلا تھا۔ اور اب تک اُسے یوں محسوس ہوتا رہا تھا۔ جیسے ابھی وہ وہاں نہیں پہنچا ہے۔ جہاں اُسے جانا تھا۔ اس گوردوارے کے باہر پڑی ہوئی ان دو لاشوں کو رات رات میں قبر کھود کر نہایت احترام سے دفنانے یا اس کیمپ کے تمام مصیبت زدگان کا غم بانٹنے اور ان کی ان تھک خدمت کرنے سے بھی اُسے وہ تسکینِ قلب حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ جس کے پیچھے وہ بھاگا بھاگا پھر رہا تھا

وہ پھر بھی اور "کچھ" کرنے کو بے چین تھا۔ اور وہ "کچھ" کیا تھا۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ یہ لڑکی ٹھیک اسی طرح اچانک اس کے سامنے آ گئی جس طرح ایک دن اوشا لاہور کے اس کیمپ میں آ گئی تھی۔ اوشا نے آتے ہی یہ کہا تھا کہ "کیا تم مجھ سے اس لئے نفرت کرنے لگ گئے ہو کہ مجھے مسلمان اٹھا کر لے گئے تھے"۔ اور اس لڑکی نے پہلا سوال اس سے یہی پوچھا تھا کہ "کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا؟"

دونوں باتوں میں کتنا تسلسل تھا۔ جیسے یہ ایک ہی افسانے کی دو کڑیاں ہوں۔ اور پھر وہ بچہ ——— اوشا اور اس کے خوابوں کی ایک تلخ تعبیر کی طرح مظلوم اور مرجھایا ہوا وہ یتیم بچہ جس نے نرملا کے ساتھ مل کر جیسے اس کے میدانِ عمل کی حدبندی مکمل کر دی تھی۔ اب اس کا خاکہ دھندلا نہیں رہا تھا۔ اس کے لائحہ عمل کی تصویر واضح ہو گئی تھی۔ اور اسے اپنی منزل پر پہونچ جانے کا سکون محسوس ہونے لگا تھا۔

✻ ✻ ✻

اس نے ایک بار پھر نرملا کی طرف دیکھا۔ نیند میں بازو ہلانے سے وہ آدھا کھیس نہ بچے کے اوپر رہا تھا۔ اور نہ نرملا کے اوپر۔ سرد ہوا کے ایک اور جھونکے نے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ اور اُسے اب اپنے گرد لپیٹنے کے لئے کپڑا ڈھونڈنے کی بجائے نرملا اور اس بچے کو سردی لگنے کا خیال آیا۔

اس نے کھیس کا کونہ اٹھا کر نہایت آرام سے نرملا اور بچے کے اوپر

پھیلانے کی کوشش کی۔ مگر نرملا کا بازو قمیص کے اوپر کچھ اس بری طرح سے پڑا ہوا تھا کہ اُسے اٹھائے بنا قمیص کے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن اس طرح اس کی نیند خراب ہو جانے کا ڈر تھا۔ اور اگر وہ جاگ جاتی۔ تو پھر اس خیال سے کہ آنند کو اس برائے نام "بستر" پر سونا چاہیے۔ وہ اٹھ کر پرے ننگی زمین پر سونے کے لئے چلی جاتی۔ یہ آنند کو اچھا نہ لگتا تھا۔ ویسے بھی وہ بچے اور نرملا کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دیکھ کر ایک سکون ایک خوشی سی محسوس کرتا تھا۔

بالآخر اس نے نرملا کا بازو نہایت آرام سے اٹھا کر جلدی سے قمیص نکال لیا۔ اور پھر اپنی کامیابی پر مطمئن ہو کر ان کے اوپر اچھی طرح کپڑا پھیلا کر باہر نکل گیا۔

اس وقت وہ ایک سرور سا محسوس کر رہا تھا۔ اور اسی عالم میں چاندنی کے سہارے سہارے وہ دریا کے کنارے کی طرف چل دیا۔

وہ باہر نکل گیا۔ تو نرملا نے سر اٹھا کر اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بازو پر اس کے ٹھنڈے ہاتھ لگنے سے جاگ گئی تھی۔ لیکن نجانے کیوں وہ چونک کر اٹھ نہ بیٹھی۔ اسے اس جذبات بھرے لمس سے ایک راحت سی محسوس ہوئی۔ کوئی اس کا اتنا خیال رکھتا ہے۔ یہ تجربہ اسے ایک دم نیا اور سرور آمیز معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ اس سرور سے پورا پورا لطف اٹھانے کے لئے چپ چاپ پڑی رہی۔ حتیٰ کہ آنند باہر چلا گیا۔ اس نے ایک بار سر اٹھا کر اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر لیٹ گئی۔

"یہ شخص انسان ہے یا دیوتا — !" وہ یہ فیصلہ نہ کر سکتی تھی۔ اسی طرح کے خاموش لمحات میں کبھی کبھی اس کی سوچیں بھٹکنے لگتیں۔ اور یہ سوال اس کے سامنے آجاتا کہ "وہ کیوں اس کے خیمے پر اس طرح قبضہ کرتی چلی جا رہی ہے"۔ لیکن پھر جیسے یہ الزام وہ اپنے کندھوں سے جھٹک کر اس پر ڈالنے کی کوشش کرتی۔ اور سوچتی کہ "آخر وہ میرے من میں اس طرح کیوں کھبتا چلا جا رہا ہے"۔ لیکن پھر یہ بھی حقیقت دکھائی نہ دیتی، کیونکہ کبھی کبھی وہ اسی خیمے میں بیٹھا ہوا اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا بھی اُسے اپنے سے کتنا دور دکھائی دیتا تھا۔ اس کی پہنچ سے کتنی پرے — اور کتنا بے تعلق — ! بالکل بھگوان کی طرح — جو گھٹ گھٹ میں موجود ہونے پر بھی انسان کی پہنچ سے کتنی دور ہیں۔

"یہ جو آج ان وحشیوں کے درمیان ایک انسان بن کر پھر رہا ہے — درحقیقت انسانوں میں ایک دیوتا ہے"

اور پھر عقیدت کے مارے اس کا سر خود بخود اس کے آگے جھک جاتا۔

⁂ ⁂ ⁂

دریا کا پانی آج اور بھی چڑھ آیا تھا۔ اور رات کے وقت اس کی آواز غیر معمولی طور پر کچھ ڈراؤنی سی ہو گئی تھی۔ لیکن آشنا ایک ایسے پرسکون موڈ میں تھا کہ اُسے چاندنی میں چمکتی ہوئی لہروں کی اچھل کود کھیلتے ہوئے بچوں کی طرح مسرت آمیز دکھائی دینے لگی۔

وہ ریت کے ایک کگارے کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور اس نظارے سے لطف اندوز ہونے لگا۔

تھوڑی دیر تک وہ اس نظارے میں کھویا رہا۔ اور اسے لہروں کی چھپاک چھپاک میں بچوں کی کلکاریوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ احساس مٹتا گیا۔ اور اس کی جگہ اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا ہوا کی سائیں سائیں میں کوئی آہیں بھر رہا ہے۔ اور لہریں رو رہی ہیں۔ گویا راوی کو اپنے دونوں کناروں کے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کا غم ہو۔

اس کے دل میں آج پھر شاعرانہ خیالات اٹھ رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ۔ اگر راوی کی جگہ چناب ہوتا۔ تو وہ مشہور رومانی دریا کبھی اپنے کناروں کو اس طرح پاکستان اور ہندوستان کی قید میں جکڑے نہ رہنے دیتا۔ وہ چناب جسے پنجاب میں حسن و عشق کا پالنا سمجھا جاتا ہے۔ جس نے ہیر اور رانجھے کو ملا دیا تھا۔ صاحباں کے خط مرزے کے گاؤں تک پہنچائے تھے۔ اور جس کی لہروں نے تمام دنیاوی پابندیوں کو کچے گھڑے کے ساتھ گھلا کر سوہنی اور مہینوال کو اپنی گود میں پناہ دی تھی۔ اگر وہی چناب آج راوی کی جگہ ہوتا۔ تو وہ ان دونوں کناروں کو کبھی الگ الگ نہ رہنے دیتا وہ عشق کے کچے دھاگوں سے ان دونوں کناروں کو کچھ اس طرح سی دیتا کہ دونوں طرف کے سیاسی راہنما ان ازلی عاشقوں کی الگ الگ برادریوں کے چوہدریوں کی طرح اپنا اپنا منہ لے کے رہ جاتے ... .

وہ اسی طرح بیٹھا شاعری کرتا رہا۔ اور ہواہیں آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ساتھ کسی کے بین کرنے کی آواز بھی سنائی دینے لگی ۔اس نے ذرا غور سے سنا۔ آواز انسانی تھی ۔یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی عورت اپنے کسی پیارے کی لاش پر بیٹھی بین کر رہی ہو۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔ اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا ۔چاند کی چھنتی ہوئی سی روشنی میں کہیں کچھ دکھائی نہ دیا۔

اچانک ایک طرف سے خشک پتے کھڑکھڑائے۔اس نے اُدھر دیکھا ۔تو ایک سایہ سا دریا کے کنارے گزر رہا تھا۔ وہ بھوت پریت کو مانتا نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ایک دفعہ تو وہ ڈر سے کانپ گیا۔ آواز پھر دور ہو رہی تھی ۔اس نے ہمت باندھ کر اس طرف قدم بڑھایا۔ اور جس طرف وہ سایہ درختوں کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔ اُدھر چل دیا۔

تھوڑی ہی دور جانے پر اُس نے اُسے درخت کے پیچھے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ سسکیاں بھر بھر کے رو رہی تھی ۔اس کے قریب پہنچتے ہی وہ کھڑی ہو گئی ۔اس کا رونا بند ہو گیا ۔ایک بار اس کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کے بعد اس نے اپنی پھٹی ہوئی دھوتی کو شرمگاہ سے اوپر تک اٹھا کر اپنے آپ کو بالکل عریاں کر دیا۔ اور کہنے لگی ۔

"لو دیکھ لو۔ لو دیکھ لو"

آنند کی آنکھیں جھک گئیں ۔اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چلو ماں۔ کیمپ میں چل کر آرام کرو۔ یہاں سردی ہے"۔

لیکن وہ عورت جیسے وہاں سے ہلنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی آواز سن کر وہ پھر رونے لگ گئی۔" آنند میرے اندر آگ بھڑک رہی ہے۔ اور تم مجھے سردی سے ڈراتے ہو۔ میرا بیٹا اس درخت کے ساتھ بندھا ہوا ہے، وہ مر گیا ہے۔ اب تو اسے کھول دو۔ اب تو اسے کھول دو ... ... اچھا نہ کھولو۔ ذرا رسہ ہی ڈھیلا کر دو۔ اس کے جسم پر چیر پڑجائیں گے۔ اسے مار ڈالو۔ اسے مار ڈالو۔ لیکن رسے کھول دو"۔ وہ پھر پاگل پن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

آنند نے اس کو زور زور سے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

"ماں ــــ ماں ــــ ماں ــــ" وہ خوفناک آواز میں چیخا۔ اور اس عورت کا بدن پھر ڈھیلا پڑ گیا۔

"وہ مر گیا ہے !!!"۔ اور پھر وہ خاص پنجابی دھن میں بین کے انداز میں گانے لگی :" ارے کیا اسی لئے تجھے جوان کیا تھا۔ تیری بہو کو کون جواب دے گا بیٹا۔ وہ جب شادی والے دن آکر پوچھے گی۔ کہ میرا دولہا کہاں ہے۔ تو میں کیسے دولہا بناؤں گی۔ اگر تجھے جوانی میں موت آنی تھی تو تو جوان ہی کیوں ہوا۔ تو بچہ ہی رہتا۔ اور میں تجھے لوریاں دیتی رہتی۔

راجہ بیٹا آیا کھیل کے
میں پوری پکاؤں بیل کے

راجہ بیٹا آیا گھوڑی پر
میں سے لوں بلیاں نئی بوڑھی پر

وہ گانے لگ گئی تھی۔ اور آنندا سے بازو سے پکڑے قریب قریب کھینچتا ہوا لئے جا رہا تھا۔ وہ اتنی تھی۔ ان کے کمیپ کی وہی عورت جسے اس کے قافلے والے راستے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے گاؤں پر کئی ہزار پٹھانوں نے جب حملہ کیا تھا۔ تو قتل کرنے سے پہلے وہاں کے تمام مردوں کو درختوں اور ستونوں سے باندھ کر ان کے سامنے گاؤں کی تمام عورتوں کو ننگا کر کے جلوس کی صورت میں نکالا گیا تھا۔ اتنی نے بتایا تھا کہ جب ان کا جلوس نکالا جا رہا تھا۔ تو بندھے ہوئے مردوں نے منہ پھیر لئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن عورتیں انھیں پکار رہی تھیں۔ وہ اپنے خاوندوں اور اپنے والدوں کا نام لے لے کر پکار رہی تھیں۔ کہ تم کہاں ہو۔ یہاں تک کہ ایک دو نوجوان لڑکیوں نے اس وقت شرم و حیا کو تلانجلی دے کر اپنے عاشقوں کے نام لے کر بھی پکارا۔ کہ آؤ۔ ہمیں بچاؤ۔ آج ہمیں تمھاری ضرورت ہے۔ اس وقت وہ تمھارے زمین و آسمان ملا دینے کے دعوے کیا ہوئے " اور مرد ان ظالموں سے کہہ رہے تھے کہ " بھگوان کے لئے۔ اپنے خدا کے لئے انھیں ہمارے سامنے نہ لاؤ۔ پرے لے جا کر جو جی چاہے کرو "۔ اور اس کے جواب میں ان ظالموں نے چند نوجوان لڑکیوں کو اسی جگہ زمین پر گرا لیا۔ اور ... ...

پھر یہ ایک لمبی کہانی تھی کہ وہ کس طرح ان کے ہاتھوں سے بچ کر بھاگی۔ اور ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو گئی۔ لیکن اب اکثر اسے اس

بات کا افسوس ہوتا۔ کہ وہ آخر وہاں سے بھاگی ہی کیوں۔ اس نے اس طرح بھاگ کر اپنا کیا بچا لیا۔ اور پھر ایسے ہی موڈ میں وہ اکثر اپنی دماغی توازن کھو بیٹھتی۔ اور اونچی آواز میں پکارنے لگتی۔

"لو دیکھ لو۔ لو دیکھ لو"

✻ ✻ ✻

آنند نے اسے لاکر اپنے خیمے میں لٹا دیا۔ اب تک بانو ملا پھر سو گئی تھی۔ چنانچہ وہ خود خیمے کے باہر ایک ڈنڈے کے ساتھ اپنی پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ سارے کیمپ پر اندھیرا اور خاموشی طاری تھی۔ بیچ بیچ میں کبھی کسی کے اونچی آواز میں بڑبڑانے یا چلانے کی آواز آجاتی اور بس ان میں سے اکثر نے اتنے ہولناک واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے کہ ڈراؤنے خواب اکثر ان کی نیندیں حرام کر دیتے۔ وہ سپنوں میں جلتے ہوئے شہر اور کھیت دیکھتے۔ اور اس آگ کے اوپر بڑے بڑے کڑاہے رکھے ہوتے۔ جن میں انسانی خون کھول رہا ہوتا۔ اور اس کھولتے ہوئے خون میں انسان ــــــ ان کے اپنے بھائی بند، بچے، بوڑھے، عورتیں اور خود وہ بھی اس کھولتے ہوئے خون کے کڑاہوں میں مچھلیوں کی طرح تلے جا رہے ہوتے اور پھر وہ لوگ چیخیں مارتے ہوئے نیند سے بیدار ہو جاتے۔

لیکن یہ نظارہ اس کیمپ میں اتنا عام ہو گیا تھا کہ ان آوازوں سے آنند پر کوئی غیر معمولی تاثر طاری نہ ہوا۔ اور وہ اسی طرح بیٹھا بیٹھا صبح کے قریب وہیں سو گیا۔

دسواں باب ۱۰

آنند مزے سے سو رہا تھا۔ لیکن جس طرح سوتے ہوئے بچے کو ماں کی تھپکیوں کا ہلکا سا شعور رہتا ہے۔ اُسی طرح اُسے بیداری کا بھی ہلکا سا احساس ضرور تھا۔

اُسے ایک دھندلا سا احساس اس بات کا بھی ضرور تھا کہ کسی نے اُسے باہر سے اٹھا کر اندر کسی کپڑے پر سلا دیا تھا۔ لیکن ابھی اس نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ کہ وہ کہاں تھا۔ دماغ آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔ لیکن جسم ابھی ذرہ بھر بھی ہلنے کو تیار نہ تھا۔

ہلکا ہلکا شور اس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اور شور کی سب

پچھلی تہوں کے اندر ہی اندر وہ اس بات کا اندازہ بھی کر رہا تھا کہ پنچھیوں نے جو اتنا شور مچانا شروع کر دیا ہے۔ سو اب تک دن خاصا چڑھ آیا ہو گا۔ اور دھوپ کا رنگ سفید ہو گیا ہو گا۔ لیکن اُسے اٹھنے کی جلدی بھی کیا تھی۔ کھانے کے لئے تو اب کیمپ میں کچھ تھا ہی نہیں۔ جس کا انتظام کرنا ہو۔ اور پھر جیسے نیند کا ایک تیز تر جھونکا آتا اور تھوڑی دیر کے لئے بیداری کے ان سب احساسات کو اٹھا لے جانے کی کوشش کرتا۔

لیکن آہستہ آہستہ یہ کوششیں کمزور پڑ رہی تھیں۔ شور کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ اور مختلف اعضاء حرکت کرنے کے حکم کا انتظار کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ کہ کسی نے اسے پکڑتے ہی زور زور سے جھنجھوڑنا شروع کر دیا اس بے تکی حرکت پر جھنجھلا کر وہ اٹھا۔ تو اس نے اپنے سامنے کشن چند کو پایا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

"اُٹھئے۔ دیکھئے۔ انھوں نے ایک مسلمان کو مار ڈالا ہے"

آنند بجلی کی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

کیمپ کے قریب سے بہت سی آوازوں کا ملا جلا شور آ رہا تھا۔ جو پنچھیوں کا شور نہیں تھا۔ اور نہ اب صبح کا سہانا وقت ہی تھا۔ بلکہ سورج نصف النہار تک پہنچ چکا تھا۔ گرمی کے مارے آنند کا جسم پسینے سے تر اور تھا۔ لیکن شاید نقاہت کے باعث اب تک اسے گرمی کا احساس نہ ہوا تھا اس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک طرف کسی نے ایک زنانہ قمیص لٹکا کر دھوپ کو اس پر آنے سے روکنے کی کوشش کر رکھی تھی۔ لیکن اس وقت ان باتوں کے

متعلق سوچنے کی فرصت ہی کسے تھی۔ وہ تو اٹھتے ہی تیزی سے اُس جانب بھاگا۔ جدھر سے شور آرہا تھا۔

وہاں کیمپ کے تمام آدمی جمع تھے۔ اور زمین پر گرے ہوئے ایک آدمی کو ہاتھوں اور لاتوں سے مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ آدمی خاموش تھا۔ صرف قریب کھڑی ہوئی ایک جوان عورت چلا رہی تھی، کہ "اسے مت مارو یہ شریف آدمی ہے۔ اسے مت مارو" لیکن اس کی کوئی سن ہی نہیں رہا تھا۔

آنند نے آتے ہی لوگوں کو پرے ہٹانے کی کوشش کی۔

"کیا ہے ــ کون ہے یہ ــ"

کسی نے جواب دیا "یہ سالا۔ دیکھو اس ہندو عورت کو کہیں لئے جارہا تھا"

ایک اور نے کہا "اس نے سمجھا تھا کہ پاکستان میں اب یہ اس کے باپ کا مال ہو گیا ہے"

اتنے میں آنند اور کشن چند نے سب کو پرے ہٹا دیا تھا۔ وہ بڈھا مرا نہیں تھا۔ بلکہ ان نیم بھوکے "قاتلوں" کے ہاتھوں وہ زخمی بھی نہ ہو سکا تھا۔ صرف اس کے چہرے پر کہیں کہیں نیل پڑ گئے تھے۔ یا اس کی شرعی داڑھی اور سر کے بال نوچ لئے گئے تھے۔ اور بس۔

آنند نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کا نشان تک نہ تھا۔ بلکہ بڑے سکون سے اس نے آنند کو دیکھا۔ اور مسکرا دیا۔

آنند دیکھتے ہی گھٹنوں کے بل گر کر اس سے لپٹ گیا۔

"مولینا آپ ــــــ ! ہمیں معاف کر دو" آنند نے اس کی چھاتی میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

مولینا نے صرف ہاتھ کے اشارے سے اُسے شانت کرنے کی کوشش کی۔ شاید وہ چہرے کی چوٹوں کے سبب بول نہیں سکتے تھے۔ باقی لوگ غیر مطمئن سے ان کی طرف ناپسندیدگی کے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں وہ عورت جگہ پاکر مولینا کے قریب آگئی۔ اور آنند سے کہنے لگی۔

"بھائی ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو مجھے مسلمانوں کے نرغے سے بچاکر لائے ہیں۔ آپ انھیں بچا لیجئے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ یہ تو کوئی دیوتا ہے"

"میں اس دیوتا کو جانتا ہوں بہن" آنند نے اتنا کہا۔ اور پھر مولینا کو بمشکل اپنی گود میں اس نے اٹھا لیا۔ کش چند اس کی مدد کو آگیا۔ اور اس عورت نے بھی سہارا دیا۔ چنانچہ اسی طرح وہ انھیں اپنے خیمے میں لے آیا۔

اور تو کچھ تھا نہیں۔ صرف پانی گرم کرکے مولینا کو پلایا گیا۔ جس سے ان کے بدن میں کچھ گرمی آگئی۔ اور وہ باتیں کرنے لگے۔

آنند نے پھر نہایت شرمندگی کے عالم میں معافی مانگی تو مولینا کہنے لگے۔

"یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ اور پھر یہ تو ان کا حق ہے۔ ان

کے ساتھ جو کچھ کیا گیا ہے۔ یہ تو اس کا عشر عشیر بھی ... ... "

لیکن ایک خوفناک قہقہے نے مولینا کی بات کاٹ دی۔ ایک پھٹے کپڑوں والا پتلا سا سکھ بے تحاشا قہقہے لگاتا ہوا اچانک آ گیا۔ اور آتے ہی اس نے آنند سے کہا۔

"سنا ہے کہ وہ مُسلا ابھی تک زندہ ہے "

"میں یہاں ہوں بھائی "۔ مولینا نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

سکھ نے یہ سنتے ہی ان کی طرف دیکھا۔ ایک چھوٹے ڈنڈے بھر لمبا ٹین کا ٹکڑا اس نے اپنے ہاتھ میں اس انداز میں پکڑ رکھا تھا۔ گویا وہ ایک بھالا ہو۔ اور بالکل نیزے سے حملہ کرنے والا پینترا اختیار کرکے قریب تھا کہ وہ سکھ ان پر حملہ کر دیتا۔ کہ آنند نے جھٹ پیچھے سے اُسے پکڑ لیا۔

"اجاگر سنگھ۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ وہ مسلمان نہیں ہے "

اور پھر کشن چند کی مدد سے زبردستی پکڑ کر اسے پرے لے جایا گیا۔ وہ پھر قہقہے لگانے لگ گیا تھا۔ اور اونچی آواز میں چلا رہا تھا۔

"میں بچ گیا۔ میں بچ گیا۔"

آنند نے معذرت کے طور پر حقیقت حال واضح کرتے ہوئے کہا

"پاگل ہے "

"وہ تو ظاہر ہے "۔ مولینا اسی جانب غور سے دیکھتے ہوئے بولے جدھر وہ اُسے لے گئے تھے۔ اور جدھر سے اب بھی اس کے قہقہوں کی

آواز آرہی تھی۔

آنند نے اس کا حال بتاتے ہوئے کہا۔کہ " یہ راولپنڈی ضلع کا رہنے والا ہے ـــــــ ان کے گاؤں پر بھی مسلمانوں نے حملہ کیا تھا۔ یہ مارچ کا ذکر ہے۔ جب ہندو اور سکھ دیہات کا صفایا کرنے کے لئے فرنٹیر کے مسلمان کئی کئی ہزار کے جتھے بنا کر پیرا کرتے تھے۔

اسی طرح کا ایک جتھہ ان کے گاؤں کی طرف بھی آیا۔ دور سے ان کے ڈھول دھماکوں کی آواز جب ان کی طرف بڑھنے لگی۔ تو یہ لوگ سمجھ گئے کہ اب ہماری باری ہے۔ چنانچہ ان کے گاؤں والوں نے مل کر جلدی جلدی مشورہ کیا۔ اور اپنی قومی روایات کے مطابق نہایت بہادری سے مرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

آس پاس کے دیہات میں ایسے موقعوں پر عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے مختلف طریقے آزمائے گئے تھے۔ کئی گاؤں میں تمام عورتوں اور بچوں کو ایک ہی مکان میں جمع کر کے گورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرنے کو کہا گیا تھا۔ پھر باہر سے دروازے بند کر کے اس مکان کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر مرد اپنی اپنی کرپانیں سونت کر دشمن پر اس طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ جس طرح کوئی مرنے کے لئے سمندر میں کود پڑے۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہی تھی کہ خود مرنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ حملہ آوروں کے خون سے اپنی پیاس بجھا لے۔ کئی مقامات پر ماؤں نے اپنی جوان بیٹیوں کو اپنے بدن کے ساتھ باندھ کر کنوؤں میں چھلانگیں لگا دی

تھیں۔

اسی طرح جب ان کے گاؤں کی باری آئی۔ تو گاؤں والوں نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی عورتوں کی عزت یقینی طور پر بچانے کے لئے اپنے اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں صاف کر دیا جائے۔ تاکہ ایک فی صدی بھی کھٹکا باقی نہ رہ جائے۔

وقت بہت کم تھا۔ نفیری اور ڈھول کی آواز بہت قریب آتی جا رہی تھی۔ چنانچہ سب لوگ جلدی جلدی اپنے گھر گئے۔

اجاگر سنگھ جب گھر پہنچا۔ تو اس کا آٹھ سال کا لڑکا اپنے ایک ٹین کے کھلونے کو توڑ کر اسے ایک پتھر پر گھس کر تیز کر رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ قریب میں روتی ہوئی ماں سے کہتا جا رہا تھا کہ

"ماں تو فکر کیوں کرتی ہے۔ آنے تو دے کسی مسلمان کو۔ میں یہ برچھا تیار کر رہا ہوں۔ بس اسی سے ایک ایک کا خون کر دونگا۔"

اجاگر سنگھ ننگی کرپان سونتے داخل ہوا۔ تو اسے دیکھتے ہی اس کی بیوی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ آنچل سے آنسو پونچھ کر اس نے اپنے چہرے پہ کچھ اس طرح کی سنجیدگی لانے کی کوشش کی۔ جو یہ کہہ رہی تھی کہ

"نہیں — میں موت سے بالکل نہیں ڈرتی —"

اجاگر سنگھ اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اور کچھ کہہ نہ سکا لیکن بیوی نے آواز میں ایک گہرا استقلال ظاہر کرتے ہوئے خود ہی پوچھ لیا۔

"کہاں — ؟ گوردوارے میں۔ ؟"

"نہیں ـــــ اِسی جگہ ـــــ !" اجاگر سنگھ نے مختصر سا جواب دیا۔
عورت نے چلنے کے خیال سے اپنی ننھی سی بچی کو پلنگڑی سے اٹھا کر گود میں لے لیا تھا۔ لیکن خاوند کی بات سن کر اس نے پھر اسے وہیں ڈال دیا۔

"کیا اسی جگہ ـــــ ؟" عورت نے پھر پوچھا۔

"نہیں اندر"

ان مختصر جملوں کی وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا مطلب بخوبی سمجھتے تھے۔

اتنے میں ان کا لڑکا اس کھلونے کا برچھا اٹھائے اپنی ماں کی ٹانگوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور ان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماں نے جب بیٹے پر ہاتھ رکھ کر اُسے باپ کی طرف دھکیلا۔ تو اس کے چہرے کی سنجیدگی اپنا کلیجہ تھامتی نظر آئی۔ اس نے جیسے ٹکڑوں ٹکڑوں میں بکھرتی ہوئی اپنی آواز کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا

"پہلے یہ کہ منی ـــ ؟"

اجاگر سنگھ نے ان تینوں کی طرف نہ دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم سے یہ دونوں نہیں دیکھے جائیں گے۔ اس لئے پہلے تم ـــــــ !!!۔ ... لیکن وقت بہت کم ہے"

اب تک ڈھول کی آواز کے ساتھ انسانی شور بھی سنائی دینے لگ گیا تھا۔ اس عورت نے بس ایک ہی بار اپنے دونوں بچوں کی طرف سے

کچھ اس طرح نگاہیں ہٹالیں جیسے پہلے وار میں اس کی نگاہوں کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ ایک ٹکڑا ان دونوں بچوں سے چپکا رہ گیا ہو۔ اور دوسرا ان آنکھوں کے ساتھ چلا گیا ہو۔ جنھوں نے پھر گھوم کر بھی ادھر نہیں دیکھا۔

اندر جا کر عورت نے چپ چاپ ایک لکڑی کے صندوق پر سر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں۔ اور کہا

"واہگورو"

اس لفظ کے ساتھ ہی اس کا سر تن سے جدا تھا۔

اجاگر سنگھ کے پاس سوچنے یا محسوس کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ لڑکے کو لانے کے لئے تیزی سے باہر کی طرف مڑا۔ لیکن وہ تو سامنے ہی دروازے میں کھڑا بڑے معصومانہ انداز میں یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

اجاگر سنگھ زبان سے کچھ کہے بغیر اسے بازو سے پکڑ کر صندوق کے پاس لے گیا۔ اس کی ماں کا گاڑھا گاڑھا لہو صندوق کے اوپر ادھر سے ادھر پھیل رہا تھا۔ اور ڈھکنے کے اوپر جمی ہوئی مٹی کے ساتھ مل کر کیچڑ ہو رہا تھا۔

لڑکا چپ چاپ باپ کے ہر اشارے کو مانتا گیا۔ لیکن جب اسے اس صندوق پر لٹایا گیا۔ تو وہ اٹھ بیٹھا۔

"یہ بہت گیلا ہے"۔ اس نے اپنے کپڑوں اور ہاتھوں پر لگے ہوئے لہو کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اجاگر سنگھ نے سختی سے کہا ـــ "لیٹ جاؤ"

اور بچہ اب کے سہم کر لیٹ گیا۔ اجاگر نے کرپان اٹھائی ۔ اور بچے نے ڈر کے مارے پہلے ڈنے بغیر کہا

"باپو"

اجاگر سنگھ نے تلا ہوا ہاتھ وہیں روک لیا۔

بچے نے یہ دیکھ کر ہمت کی اور کہنے لگا "ماں تو کہتی تھی کہ ہمیں مسلمان مار ڈالیں گے ۔ پھر تم کیوں مارتے ہو۔؟ کیا تم مسلمان ہو گئے ہو؟"

اجاگر سنگھ نے جواب نہیں دیا۔ اس کے ہاتھ کانپ گئے ۔ پھر اس نے ہمت باندھ کر دونوں ہاتھوں میں کرپان کا دستہ مضبوطی سے جکڑ لیا اور بازوؤں میں طاقت بھرنے لگا ۔

بچہ جواب کے انتظار میں اس کی طرف نہایت معصومانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ لیکن جب اس کے بازوؤں کو مضبوط تر ہوتے دیکھا۔ تو پھر سہم کر لیٹ گیا۔ لیکن اچانک پھر بول اٹھا ۔

"میں نے بھی یہ برچھا مسلمانوں کو مارنے کے لئے بنایا تھا ... "

اور اس نے وہ کھلونا باپ کی طرف بڑھایا۔ اجاگر سنگھ نے بایاں ہاتھ کرپان سے ہٹا کر وہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"تمھارے کام آئے گا نا ۔!" بچے نے چہک کر نقلی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ۔ جیسے وہ اس کے لئے داد طلب کر رہا ہو۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بچہ مرنے سے پہلے باپ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ مرنے کے لئے تو وہ ماں کے کہنے پر ہی تیار تھا ۔ بلکہ بہادروں کی طرح مرنے کے لئے اس نے

وہ برچھا بھی تیار کر لیا تھا۔ پھر بھی باپ کیوں اس طرح غصہ بھرے چہرے سے اُسے مار رہا تھا۔ یہ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ چنانچہ وہ دلیری سے مرنے کی تحسین حاصل کرنے کے لئے باپ کو خوش کرنے کی ایک معصوم کوشش کر رہا تھا

یہ دیکھ کر اجاگر سنگھ کی چیخ نکل گئی۔ لیکن اس سے قبل کہ اس چیخ کی آواز اس کے گلے سے باہر نکلے۔ اس کی کرپان نے اُس شاباش چاہنے والے بچے کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تھا۔

حملہ آور گاؤں کے سر پر آ پہنچے تھے۔ اجاگر سنگھ ننھی بچی کو بھی صاف کرکے جلدی سے باہر نکل گیا۔

تمام ساتھیوں نے خون سے لتھڑی ہوئی اپنی کرپانوں کو ہوا میں لہرانا شروع کیا۔ ابھی حملہ آور کوئی سو گز کی دوری پر تھے۔ چنانچہ یہ لوگ ایک گلی کے منہ پر قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ تاکہ ان سے گلی میں مقابلہ کیا جائے جہاں دشمن ایک دم ان کے گرد گھیرا نہیں ڈال سکتے تھے۔

گاؤں کا سب سے بڑا سردار انھیں جلدی جلدی لڑائی کی چال سمجھا رہا تھا۔ لیکن اس وقت چال کا کسے ہوش تھا۔ جن کرپانوں سے وہ اپنے عزیزوں کو کاٹ کر آئے تھے۔ وہ کرپانیں ان کا بدلہ لینے کے لئے ہاتھوں میں مچل رہی تھیں۔ اس وقت ان کے بازوؤں میں نفرت اور بدلے کی کسی غیبی طاقت نے دوگنا زور بھر دیا تھا۔ اور ان کے دلوں میں اب ایک ہی ارمان رہ گیا تھا کہ وہ ان حملہ آوروں کو چیرتے پھاڑتے ہوئے جلد از جلد

شہید ہو جائیں۔

حملہ آور جتھہ گاؤں کے سامنے آکر رک گیا۔ کچھ مشورے ہوئے اور پھر جتھے کا پچھلا حصہ دونوں اطراف میں پھیلنے لگا۔

جب گاؤں والوں نے دیکھا۔ کہ ان سے لڑنے کی بجائے حملہ آور گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر کر جلا ڈالنے کی ترکیب کر رہے ہیں۔ تو انھوں نے اسی طرح کھلے میدان میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اتنے میں حملہ آور جتھے نے ایک چھوٹی سی توپ بھی گاڑنی شروع کر دی تھی۔ اُدھر سے چند بندوقیں بھی چھوٹ چکی تھیں۔ لیکن ایک آدمی کے معمولی سے زخمی ہونے کے سوا گاؤں والوں کا کچھ نقصان نہ ہوا تھا۔

پہلے تو سکھوں نے بھی اپنے گاؤں کی تینوں بندوقیں فائر کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر اس خیال سے رک گئے۔ کہ دشمن کو ان کے اس طرح گھات لگا کر چھپے ہونے کا پتہ چل جائے گا۔ اور پھر یہ مرنے سے پہلے اپنے دل کی بھڑاس بھی نہ نکال سکیں گے۔ مگر دشمن ان سے زیادہ چالاک نکلا۔ چنانچہ اب انھوں نے کھلے میں ہی آخری ڈسپریٹ (desperate) حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک زور کا نعرہ ہوا میں گونجا " جو بولے سو نہال ست سری اکال "

اور اس کے ساتھ ہی یہ دیہاتی سورمے کرپانیں اور تین بندوقیں سونتے بالکل سامنے نکل آئے۔ اور ایک ہی لمحے میں دشمن کی طرف بڑھے۔ لیکن

عین اس وقت "گڑ۔ گڑ" کی خوفناک آواز آئی۔ اور انھوں نے سارے کے سارے حملہ آور جتھے کو ایک دم پیچھے ہٹتے دیکھا۔ اور پھر بیس گز اور آگے بڑھنے پر کھلے میدان میں پہنچتے ہی انھوں نے دیکھا۔ کہ پانچ چھ فوجی ٹینک خوفناک آواز کرتے ہوئے ان کے اور حملہ آوروں کے درمیان بڑھ رہے ہیں ـــــ

گھرے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لئے حکومت نے جو فوجی دستے بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک نے کیا وقت پر پہنچ کر ان سب کو بچا لیا۔!

✲ ✲ ✲

بہرحال ملٹری جب ان لوگوں کو بچا کر راولپنڈی کے ایک کیمپ میں لے گئی۔ اور ان سے ہتھیار لینے لگے۔ تو دیکھا گیا۔ کہ چار پانچ آدمیوں کی تو انگلیاں کرپانوں کے دستوں پر اس طرح جم کر رہ گئی تھیں۔ کہ پھر وہ کھل ہی نہیں سکیں۔ اور نہ ان ہاتھوں سے وہ تلواریں ہی الگ ہو سکیں۔ بدلے کے کیا کیا ارمان ان کے ہاتھوں میں خون کے ساتھ ہی منجمد ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دو کی گرفت زبردستی کھولنے کی کوشش کی گئی، تو ان کے فالج زدہ ہاتھوں کی انگلیاں ہی ٹوٹ گئیں۔

اجاگر سنگھ نے اپنی کرپان چپ چاپ دے دی۔ لیکن بچے کا وہ کھلونا اس نے آج تک اپنے ہاتھ سے الگ نہیں کیا۔ وہ اسی بچے کی طرح اُسے برچھا بنائے لئے پھر رہا ہے۔ اور شاید اس کے ساتھ کسی مسلمان کو مارنے کی تمنا بھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجاگر سنگھ نہیں بلکہ اس بچے

کی روح ہے۔ جو آج آٹھ مہینوں سے راولپنڈی سے لے کر دادی کے کنارہ تک یہ تمنا لئے بھٹکتی پھر رہی ہے۔ کہ اپنے باپ کی بجائے کوئی مسلمان اسے مارڈالنے کے لئے آئے۔ اور وہ اپنے اس "برچھے" کی مدد سے اپنی ماں کی حفاظت کرتا ہوا نہایت بہادری سے شہید ہو جائے۔

جہاں تک خود جاگر سنگھ کا تعلق ہے۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ اُسے تو شاید ایک ہی بات کا احساس ہے۔ اور یہی احساس ہر وقت طنز کے کانٹے کی طرح اُسے چبھتا رہتا ہے۔ جس کی چبھن سے تڑپ کر اکثر اس کی روح اونچی آواز میں بلبلا اٹھتی ہے۔

"میں بچ گیا ـــــــ میں بچ گیا ـــــــ!"

گیارھواں باب

وہ دونوں شام تک باتیں کرتے رہے۔ مولینا نے آنند کو مشرقی پنجاب کے حالات سنائے۔ کہ وہاں کس طرح مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ کس طرح راشن کے دفتروں سے ایک ایک مسلمان کے نام کی فہرست بنا کر ایک بڑے منظم طریقے سے ایک ایک کو ڈھونڈ کر قتل کرنے کی کوشش کی گئی انھوں نے بتایا کہ کس طرح مشرقی پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کی بڑی بڑی سڑکوں پر دائمی قسم کی چتائیں روشن کی گئی تھیں۔ جن میں ہر راہ چلتے مسلمان کی آہوتی دی جاتی رہی۔ بڑے بڑے چوکوں میں جلتی ہوئی ان آگوں میں زندہ انسانوں کو جھونک کر ہندو اور سکھ کس طرح خوشی سے

ناچا کرتے تھے۔

"یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے انھیں اس بات کا دکھ ہو رہا تھا کہ انسانیت کے چولے کو تار تار کر کے پھاڑ ڈالنے میں مسلمان کیوں پہل کر گئے تھے۔ اور اب وہ جیسے اس کی پوری پوری تلافی کرنے پر تل گئے تھے:۔ تا کہ اگر وہ پہل نہیں کر سکے۔ تو کم از کم تعداد میں زیادہ قتل کرنے کا کریڈٹ تو وہ حاصل کر لیں"

اچانک ان کی بات کاٹ کر آنند نے پوچھا: مولینا۔ ہمارے لاہور کا کیا حال ہے؟"

مولینا خاموش ہو گئے آنکھیں جھکا لیں۔ اور پھر ایک لمبی سانس لے کر کہنے لگے۔ کہ "اس کے جواب میں مجھے تیر کے وہ شعر یاد آ گئے۔ جو اُس نے دِلّی کے لئے کہے تھے۔

دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اس میں دِلّی کی جگہ لاہور اور فلک کی جگہ ہم اپنے نام لکھ دیں۔ تو لاہور کی حالت پر یہ موزوں ترین شعر ہو گا۔ وہ لاہور اب کہاں ہے میرے عزیز اُسے بھول جاؤ۔ جسے تم لاہور کہا کرتے تھے۔ وہ رنگین اور حسین شہر جس کے لئے لوگ کہا کرتے تھے۔ کہ "عروس البلاد" کا محاورہ ایجاد ہی اس کے

سے لئے گیا گیا تھا۔ اُسے یوں سمجھ لو کہ کبھی ایک حسین خواب دیکھا تھا۔ جسے دوبارہ دیکھنے کی تمنا زندگی بھر کرو گے۔ لیکن دیکھ نہیں پاؤ گے۔

میرے ایک پروفیسر دوست نے کہا تھا۔ کہ لاہور اب اس دلہن کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جس کے زیور اور کپڑے ڈاکوؤں نے نوچ لئے ہوں۔ اور جس کے حسن اور جسم کو جگہ جگہ سے زخمی کر دیا گیا ہو۔ اب لوگ پوچھتے ہیں۔ کہ کیا یہی جنگلی انصاف، حاصل کرنے کے لئے وہ "پاکستان۔ پاکستان"، کے نعرے لگاتے رہے۔ اب نہ کہیں وہ ہمارا پیارا ہندوستان دکھائی دیتا ہے۔ جس کو بچانے کے زعم میں بھائی لوگوں نے اپنے اسی اتحاد کے آدرش کو قربان کر دیا۔ اور نہ وہ پاکستان ہی کہیں موجود ہے۔ جس کا تصور ہم لوگوں کے سامنے رکھا گیا تھا اور جس کی خاطر یار لوگوں نے اس دو جہان کے مالک کی تعلیم کو بھی ٹھکرا دیا۔

میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ آج مجھے لاہور میں ایک بھی آدمی ایسا دکھائی نہیں دیا۔ جو ایک مہذب شہر کا باشندہ دکھائی دے سکے۔ وہاں ہر ایک زخمی ہے۔ کسی کا بازو کٹا ہوا ہے، تو کسی کی آنکھ نہیں۔ کسی کی ٹانگ کچلی ہوئی ہے۔ تو کسی کی عصمت لہولہان۔ اور باقی جو مر نہیں گئے۔ ان کی روحیں زخمی ہیں اور ضمیر کچلے ہوئے۔ ہر ایک کے جسم پر یا دل پر کسی نہ کسی چوٹ، کسی نہ کسی زخم یا کسی نہ کسی موت کا انمٹ نشان ہے۔ لاہور جو کبھی حسن کا مسکن تھا آج زخمیوں کی ایک بستی ہے۔ بلکہ خود لاہور مجھے ایک بڑا زخم دکھائی دیتا ہے —— وہ زخم جس کا علاج کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ اور جس میں کیڑے پڑ گئے ہیں —— زخمی اور کراہتے ہوئے انسانوں کی شکل میں رینگتے ہوئے کیڑے۔!"

مولینا کی آنکھوں میں پانی لبالب بھر آیا تھا۔ اور وہ خاموش ہو گئے" یا آگے ان کی آواز ہی گلے میں اٹک کر رہ گئی۔

اس کے بعد کتنی ہی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ آنند کو لاہور کا کیا کچھ پھر سے یاد آنے لگا تھا۔ وہاں اس کا کیا کچھ نہ تھا۔ اس کی زندگی کا بہترین حصہ جیسے وہیں رہ گیا تھا۔ اُن گلیوں میں، ان مکانوں میں، اس بام پر، جہاں آنند کو گلی میں سے گزرتے ہوئے دیکھنے کے لئے دو حسین سے پاؤں کتنی مرتبہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جھلستے رہے تھے۔ وہاں کی ہواؤں اور فضاؤں میں جن میں کئی پیاری پیاری باتیں اور حسین وعدے، دبی دبی کھانسیاں اور دھیمے دھیمے گیتوں کے سُر ادھر سے اُدھر تیرتے رہے تھے ـــــــ اس کا سبھی کچھ تو وہاں تھا۔ لیکن یہ سارا سرمایہ ان حالتوں میں وہاں محفوظ کیسے رہ سکے گا۔ مولینا نے بتایا تھا کہ اب بھی ادھر ادھر سے پڑی ہوئی لاوارث لاشیں مل جاتی ہیں۔ تعفن اور سڑاند کی ماری ہوئی ـــــــ تو کیا وہ ایک لاش جسے اُس دن اچھا کفن بھی نہیں ملا تھا۔ کہیں وہ بھی تو ابھی تک اسی طرح کہیں ... ... "

اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہ سکا۔ اس نے جلدی جلدی مولینا سے اور اور سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ اور مولینا بھی اسی طرح جلدی جلدی اُسے مختلف باتیں اور واقعات سناتے گئے۔ جن میں کوئی تسلسل نہ تھا۔ اب وہ اپنے موضوع جلدی جلدی بدل رہے تھے۔ گویا کسی خیال سے دور بھاگنے کی ناکام کوشش میں ادھر سے اُدھر بھٹک رہے ہوں۔

انھوں نے دلی کے واقعات سنائے۔ کہ کس طرح وہاں کے مسلمانوں نے لال قلعہ میں جاکر پناہ لی۔ کس طرح قدرت نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور پھر کس طرح بے پناہ بارشوں میں وہ لوگ کسی باڑے میں بندھے ہوئے جانوروں کی طرح گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے بھیگتے رہے۔ کس طرح ان کے سامان اور صندوق پانی پر تیرتے ہوئے ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ اور کوئی انھیں اپنا کہنے والا نہ تھا۔ کس طرح نمونیا اور بخار سے کئی بچے مر گئے۔ اور پھر ان کی لاشیں بھی اسی طرح لاوارث سامان کے ساتھ ادھر سے اُدھر تیرتی رہیں۔ پھر کس طرح پانی اتر جانے پر اس دلدلی گراؤنڈ میں سانپ نکل آئے۔ اور بڑے اطمینان سے انسانی خون پیتے رہے۔ حتیٰ کہ شہر میں کسی بھی پناہ گزیں کو جب قلعے میں چلے جانے کا مشورہ دیا جاتا تو وہ اس طرح چیخ اٹھتا۔ جیسے کئی سانپ اس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے ہوں۔

مولینا ان دنوں میں دہلی تک کئی شہروں کا چکر لگا آئے تھے۔ انھوں نے کئی انفرادی واقعات بھی سنائے۔

انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اس وقت جامعہ ملیہ کے کتب خانے پر پہنچتے دیکھا تھا۔ جب اندر اس کی کتابیں جلائی جا رہی تھیں۔ اور باہر امن کے محافظ، فوجی پہریدار چارپائی پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ پنڈت جی اندر گئے۔ تو جلتے ہوئے ڈھیر سے پہلی کتاب جو انھوں نے اٹھائی وہ ان کی اپنی کتاب Discovery of India کا اردو ترجمہ تھا۔

اس آدھی جلی ہوئی کتاب کو تھوڑی دیر ہاتھوں میں لئے لئے جانے وہ

کیا سوچتے رہے ۔ اور پھر اُسے اسی آگ میں پھینک دیا۔ مولینا کو اس وقت یوں دکھائی دیا تھا۔ جیسے پنڈت جی نے اس نفرت اور بٹوارے کی آگ میں اپنی اس تلاشِ عظیم ہ کو نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو قربانی کے لئے جھونک دیا ہے۔ کہ شاید اسی سے اس جہنمی آگ کا پیٹ بھر جائے ۔ اور وہ شانت ہو جائے

پنڈت جی اور اندر گئے ۔ تو انھیں ایک آدمی ملا۔ جو نہایت اطمینان سے کتابیں اکٹھی کر کے انھیں گٹھڑی میں باندھ کرلے جا رہا تھا۔ اور انھیں دیکھ کر اس نے بڑے اطمینان سے داد طلب انداز میں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"جے ہند" ۔ اور پھر ایک نعرہ لگایا۔

"پنڈت جواہر لال نہرو کی ـــــ جے"

جس پر پنڈت جی نے اپنے کمزور ہاتھوں سے اس کا گلا دبا کر اس کی آواز بند کرنے کی مضحکہ خیز کوشش کی تھی ـــ اور ان سے یہ بھی نہیں ہو سکا تھا۔

☆ ☆ ☆

مولینا نے چند بہادری کی مثالیں بھی دیکھی تھیں۔

کیرول باغ دلی میں ایک ملٹری ٹرک میں گھومتے ہوئے انھوں نے ایک ہندو پور بئے کی لاش دیکھی تھی۔ جس نے اپنے ہاں پناہ لئے ہوئے ایک مسلمان خاندان کے گیارہ افراد کو بھڑکے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کے ایک ہجوم کے حوالے کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ

" اس دروازے کے اندر جانے کے لئے تمھیں میری لاش پر سے

گزرنا پڑے گا"

اس پر ہجوم میں سے آواز آئی کہ "گیارہ مسلے ملتے ہیں۔ تو ایک ہندو کی قیمت دے کر بھی انھیں مارنا مہنگا نہیں"

اور پھر وہ بہادر کس طرح اپنی لاٹھی سے لڑتا ہوا ان کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا بھی اپنے تیرہ سالہ بچے کو پکار کر کہہ گیا۔ کہ۔

"بیٹا۔ اپنے شرناگتوں کے لئے مرجانا۔ پر اپنے جیتے جی انھیں ان راکششوں کے حوالے نہ کرنا" اور پھر اس کا ننھا بیٹا بھی دروازے کا راستہ روکتا ہوا مارا گیا تھا۔

دلی کے ساتھ ہی اردو شاعروں اور مصنفوں کا ذکر آیا۔ تو انھوں نے بتایا کہ اسی دلی میں انھوں نے اس دیش بھگت مصنف خواجہ احمد عباس کو ایک دوست کے مکان پر تمام ضبط کے باوجود پھوٹ پڑتے دیکھا تھا۔ کیونکہ اسی دن صبح دہلی پہنچتے ہی ہوائی اڈے پر پولیس نے تمام ہندو مسافروں کو کھلے بندوں جانے کی اجازت دے کر صرف اسی کو روکا تھا۔ اور اس سے الٹا پلٹا سوالات پوچھے تھے کہ

"تم دلی میں کیوں آئے ہو؟ کہاں ٹھہرو گے۔ کس سے ملو گے اور کتنے دنوں میں چلے جاؤ گے؟ وغیرہ

قومی جنگ کا وہ نڈر سپاہی اس جذباتی چوٹ کو برداشت نہ کر سکا تھا۔ کہ اسی دلی میں جو اس کی اپنی دلی تھی۔ جو اس کے باپ داداؤں کی دلی تھی۔ جس کی تعمیر و تہذیب کے ارتقا میں اس کے بزرگوں کا ہاتھ تھا۔ جہاں

وہ زبان بولی جاتی تھی جو اس کے بزرگوں نے لکھی۔ اسی دلی میں اس سے ملزموں کی طرح جرح کی گئی۔ کہ تم دلی میں کیوں آئے ہو۔ اور کب چلے جاؤ گے۔؟

اور وہ بڑے سے بڑے محاذ پر بھڑ جانے والا بہادر اس تذلیل کی چوٹ کو برداشت نہ کر کے رو اٹھا تھا۔

شملے میں مولینا نے اسی کے ایک اور ہمعصر مصنف راجندر سنگھ بیدی کو رات کے اندھیروں میں گہری پہاڑی کھڈوں، کرفیو آرڈروں اور اپنے مجاہد، بھائیوں کی کرپانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے کئی مسلمان خاندانوں کو محفوظ مقامات پر پہنچاتے دیکھا تھا۔ اور پھر چند روز بعد اسی راجندر سنگھ کو اپنے بیوی بچوں کو لئے ہوئے ایک ریفوجی ٹرین کی چھت پر لٹکتے دیکھا تھا۔ جہاں اس نے اپنی پگڑی کے ساتھ اپنے بچوں کو ڈبے کی چھت پر لگے ہوئے ایک کیل سے باندھ رکھا تھا۔ اور جنھیں ہر نئے پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے لڑھکنے کے خطرے کو دل سے نکال کر اُسے بالکل بٹا دینا پڑتا تھا کیونکہ ہر پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے۔ وہ چار آدمی ٹکرا کر چلتی گاڑی سے گر جاتے تھے۔ وہاں سے نیچے اترنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ وہ لوگ چھت پر پڑے پڑے ہی ہر اسٹیشن پر پانی پانی کے لئے چلاتے رہتے۔

ریفوجی گاڑیوں کا ذکر آیا۔ تو مولینا نے نم آلود آنکھوں کے ساتھ اس ریفوجی ٹرین کا ذکر کیا۔ جس میں سفر کرتے ہوئے آٹھ ہزار ہندوؤں کو لاہور سے آگے نکلتے ہی بالکل صاف کر دیا گیا تھا۔ وہ ٹرین جب امرتسر پہنچی۔ تو لوگوں

نے اُسے وہاں ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ " اسے دلی لے جاؤ۔ اور ہمارے عدم تشدد کے پیرو لیڈروں کو دکھاؤ"۔ حتیٰ کہ واقعی اسے دلی لے جایا گیا۔

اس گاڑی میں خون اور لاشوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مُردہ عورتوں کو ننگا کر کے ڈبوں کے باہر لٹکا دیا گیا تھا۔ ان کی چھاتیوں پر "پاکستان" لکھا ہوا تھا۔ اور شرمگاہوں میں لکڑیاں ٹھونسی ہوئی تھیں۔

جب ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو اُسے دیکھنے کے لئے لایا گیا۔ تو وہ یہ نظارہ دیکھ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ لوگوں نے مہاتما گاندھی کو بھی مجبور کر دیا۔ اور وہ بھی آئے۔ لیکن بڑے صبر اور شانتی کے ساتھ اتنا کہہ کر چلے گئے۔ کہ

"یہ دیکھ لو۔ تشدد کا انجام کیا ہوتا ہے"

اور اس گاڑی کے جواب میں کئی مسلم گاڑیوں کے ساتھ مشرقی پنجاب میں جو کچھ کیا گیا۔ وہ بھی کم ہولناک نہ تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی میں تیرہ ہزار انسانوں میں سے صرف پندرہ بچے تھے۔ اور وہ بھی لاشوں کے نیچے دب جانے کے باعث۔

ان پندرہ نے بے حد بھوک اور پیاس کے سبب فرش پر جمے ہوئے اپنے بھائیوں بیویوں اور بچوں کے خون کو چاٹا تھا۔ اپنے بدن میں دانت کاٹ کر خون چکھا تھا۔ اور انتہا یہ کہ کئی روز پیاسے رہنے کے بعد آخر انھوں نے ایک دوسرے کے منہ میں پیشاب کیا۔ تاکہ حلق تو

تر ہو سکیں۔

اسی گاڑی میں ، ساقی ، دہلی کے ایڈیٹر شاہد احمد بھی تھے۔ دلی کی پرانی کلچر کے دلدادہ اس نازک سے ادیب کو اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ۔ پاکستان پہنچ کر بھی وہ آج تک کسی سے بات ہی نہیں کرتا۔ نہ اُس نے کسی دوست کو خط ہی لکھا ہے۔ نجانے اس خاموشی کے پیچھے کھڑا وہ کیا سوچ رہا ہے جانے اسے اب انسان اور انسان کے درمیان کسی بھی قسم کے دوستانہ تعلقات پر اعتماد بھی باقی رہ گیا ہے یا نہیں "۔

اسی سلسلے میں دہلی ریڈیو کی ایک خبر کا ذکر بھی انھوں نے کیا کہ مغربی پنجاب سے آئی ہوئی ایک ریفوجی ٹرین کو منٹگمری اور رائے ونڈ سے ہو کر لاہور پہنچنے میں پانچ دن لگ گئے تھے۔ اس میں دس ہزار ہندو سکھ تھے، ان پر کئی مرتبہ حملے کئے گئے۔ اور محافظ دستوں نے بڑی بہادری سے انھیں بچالیا۔ لیکن پیاس سے انھیں کوئی نہ بچا سکا۔ راہ میں پاکستان کے کسی بھی اسٹیشن پر تین دن تک انھیں پانی کا ایک گھونٹ تک نہ دیا گیا جس سے چار سو ننھے بچے بلک بلک کر مر گئے۔

* * *

مولینا ایک کے بعد دوسرا واقعہ سنا رہے تھے۔ اور آنند، نرملا اور کرشن چند انگشت بدنداں ہو کر سن رہے تھے۔ وہ ننھی لڑکی بالکل غیر دلچسپی سے چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے اس کے لئے یہ کوئی غیر معمولی باتیں نہ تھیں کیمپ کے باقی لوگوں کو جیسے مولینا میں کوئی دلچسپی نہ تھی ، البتہ

چند ایک انھیں مشکوک نگاہوں سے گھورتے ہوئے ضرور گزر جاتے۔

"کاش آنند وہاں نہ ہوتا۔ اور ان کا بس چل سکتا ... ..."

مولینا پھر انفرادی واقعات پر آ گئے تھے۔ اب وہ بہیمیت کی انفرادی مثالیں دے رہے تھے۔

جالندھر کے ایک ڈاکٹر کی لڑکی کا ذکر انھوں نے کیا۔ جس نے اپنی چھوٹی بہن اور باپ کے ساتھ بیس گھنٹے تک ہندو سکھوں کے ایک بپھرے ہوئے ہجوم کا مقابلہ کیا تھا۔ بیس گھنٹے وہ تینوں ایک ریوالور اور دو رائفلوں سے لڑتے رہے۔ لیکن آخر کار انھیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ڈاکٹر کو باہر لایا گیا۔ تو ایک جوان گبرو آگے بڑھا اس نے کہا کہ "اسے چھوڑ دو۔ یہ میرا شکار ہے"۔ اور پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک بوجھل کھانڈے کا ایک بھرپور ہاتھ ایسا مارا۔ کہ کھانڈا ڈاکٹر کی کھوپڑی کو چیر کر چھاتی کے ایک طرف سے ہوتا ہوا ایک کولھے کے قریب سے نکل گیا۔ اور پھر قریبی دیوار میں جا کر ایسا لگا، کہ کند ہو گیا۔

ڈاکٹر کے دونوں ٹکڑے زمین پر اس کے قدموں میں پڑے تھے اور وہ اپنے کند کھانڈے کو دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا کہ "اگر تم اتنے ہی نرم تھے، تو پہلے کہتے۔ میں اپنا کھانڈا ہی خراب نہ کرتا"۔

اس کے بعد ان دونوں لڑکیوں کو باہر لا کر ان کے متعلق کئی طرح کی اسکیمیں مرتب کی گئیں۔ لیکن دونوں لڑکیاں بڑے بہادرانہ انداز میں خاموشی سے کھڑی رہیں۔ آخر میں انھیں کہا گیا کہ "جے ہند" کا نعرہ

لگائیں۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ انھیں ہر طرح کی دھمکی دی گئی۔ لیکن انھوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ "ہم لڑائی ہار رہے ہیں۔ آپ کا جو جی چاہے ہمارے ساتھ کر سکتے ہیں۔ لیکن خود ہمیں کچھ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے"۔

ان لڑکیوں کے ساتھ ایک دس سال کا ان کا چھوٹا سا بھائی بھی تھا جو حیران ہو کر دیکھ رہا تھا کہ میری بہنیں جو کبھی پردے کے بغیر غیر مردوں کے سامنے نہیں گئی تھیں، آج کس ڈھٹائی سے تبر تبر باتیں کر رہی ہیں۔ آخر انھیں ننگی عورتوں کے اس فاتحانہ جلوس کے آگے چلنے کو کہا گیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔

انھوں نے زمین پر گھسیٹا جانا منظور کر لیا۔ لیکن اپنی رضا و رغبت سے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔ آخر میں کسی نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ان کے کپڑے بالکل چیر دیئے۔ اور وہ دونوں بالکل عریاں کر دی گئیں۔ پھر بھی جب ان کی سرکشی، نہ دب سکی، تو ایک نوجوان نے طیش میں آ کر اپنی تلوار کی نوک اس کی شرمگاہ میں اس طرح ٹھونس دی۔ کہ وہ چیرتی ہوئی لڑکی کے پیٹ تک آ گئی۔

اسی وقت چھوٹی بہن کو ایک اور نے سڑک پر لٹا لیا تھا۔ اور کھلے عام کئی بہادروں نے وہیں دادِ عشرت دی۔

یہ دیکھ کر چھوٹا بچہ چلایا۔ اور اس نے انھیں روکنے کی کوشش کی۔ تو کسی نے لوہے کی ایک کند سلاخ اس کے پیٹ میں اس زور سے

لکھوودی، کہ وہ اسی پر ٹنگ گیا۔

یوں معلوم ہوتا تھا، کہ کسی میں اتنی ہمت ہی نہ رہی تھی۔ کہ مولینا سے اتنا ہی کہتا کہ "بس کرو"۔ اور مولینا ــــــ! جیسے آنند کے سامنے آ کر ان کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ایک انسان کے خاندان کے کئی افراد ایک ساتھ ہی مر گئے تھے۔ اور وہ پاگل سا ہو کر کبھی ایک کی لاش پر۔ اور پھر اُسے چھوڑ کر دوسرے کی لاش پر رونے اور بَین کرنے میں مصروف تھا۔ اور کہ اسے اس بات کا کچھ ہوش نہ تھا۔ کہ کس کی موت کا صدمہ اُسے سب سے زیادہ ہے

✲ ✲ ✲

مولینا سنائے جا رہے تھے کہ "افسوس تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو انسانیت کے دعویدار تھے۔ جو دنیا کو ایک نئے دور کا پیغام دیتے نہ تھکتے تھے، ادھر ہمارے شاعر اور ادیب بھائی۔ ان میں سے بھی کئی اس انسانیت کش مرض سے نہ بچ سکے۔ لاہور میں میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ہندو شاعر فکر تونسوی کو اس کے ایک اپنے ہی مسلمان ہمعصر کے ہاتھوں ایک بپھرے ہوئے مسلم ہجوم کے حوالے ہوتے دیکھا ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بچ گیا۔ لیکن اس کا وہ ہمعصر اُسے قتل کرنے کے گناہ سے نہیں بچ سکتا۔

یہ میں جانتا ہوں کہ گناہ کی سزا سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کوئی نہیں اور اسی لئے جب بھی میں اپنے ان ہم وطنوں کے مستقبل کا خیال کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ جب ایک بے گناہ کے قتل پر قاتل کی کئی پشتیں

اس کے ردِعمل سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔ تو یہاں جہاں ہزاروں نہیں لاکھوں معصوموں کا خون بہایا گیا ہے۔ اس کی سزا کتنی خوفناک ہوگی۔ وہ خدائی قہر کیا ہوگا۔ اس کے بارے میں سوچنے سے بھی میں کانپ اٹھتا ہوں۔ مجھے تو ساری کی ساری نسل ختم ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اس کا قہر ان تینوں مذہبوں کو سرے ہی سے نہ مٹا ڈالے اور پھر یہ تو میں بھی بابل اور نینوا کی تہذیبوں کی طرح کسی محکمہ آثارِ قدیمہ کے کاغذوں ہی پر رہ جائیں۔۔۔۔۔ اور کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا"

یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے مولینا کو کچھ خوفناک مناظر دکھائی دے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں مارے دہشت کے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اور وہ کہے جا رہے تھے۔

"کچھ ضرور ہوگا آنند ــــــ چاہے یہاں کی زمین پھٹ جائے یا یہاں کے دریاؤں میں فرعون کش نیل والے طوفان آ جائیں۔ یا زمانہ ما قبل تاریخ کی طرح پنجاب کے علاقے میں پھر سے سمندر بن جائے مگر جو کچھ بھی ہوگا، نہایت خوفناک ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ان قاتل قوموں کے گھر آئندہ بچوں کی جگہ لاشیں ہی پیدا ہوں۔ ــــــ مرے ہوئے لڑکے اور عصمت دریدہ لڑکیاں ہی اس قوم کی کوکھ سے جنم لیں۔ اور ساری کی ساری قوم اپنی ہی دہشت اور خوف کے مارے دریاؤں میں کود کود کر مر جائے حتیٰ کہ ایک بھی انسان باقی نہ رہے"

"نہیں مولینا۔ اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" آنند نے

یاس و درد کی اس بہتی ہوئی رَو کو تھامنے کی کوشش کی۔ "خدا اور قدرت کو اتنا ظالم نہ بناؤ۔ وہ رحیم بھی تو ہے۔ بخش دینا بھی تو اسی کا وصف ہے۔ بڑے سے بڑے پیغمبروں اور اوتاروں نے ہمیں یہ بھی تو بتایا ہے کہ ایک بار جو خلوصِ قلب سے اس کے آگے جھک گیا۔ اور جس نے توبہ کر لی۔ اس پر اس کی رحمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں"

• لیکن توبہ کرنے کا موقعہ ہی گزر چکا ہے۔ جنھیں اتنا کچھ ہو جانے کے بعد ہوش نہیں آیا۔ وہ اب کیا سنبھلیں گے"۔ مولینا نے اسی مایوس ٹون میں کہا۔

• نہیں مولینا۔ موقعہ گزرا نہیں۔ بلکہ آنے والا ہے"۔ آنند نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں اس دن کو دیکھ رہا ہوں۔ جب ان حرکتوں کا انجام لوگوں کے سامنے اپنی خوفناک صورت میں نمودار ہوگا۔ جب اناج اور انسانیت دونوں کا قحط پڑ جائے گا۔ جب انسان نہ صرف روٹی کا بھوکا ہوگا۔ بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ کا، ایک دوسرے کی صحبت کا بھی بھوکا ہوگا۔ جب ان کی نفرت اس عروج پر پہنچ چکی ہوگی۔ کہ ایک دوسرے سے پیار کرنے والا کوئی نہیں ہوگا اس وقت یہی لوگ محض ایک دوسرے سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈیں گے یہ جو انسان اور انسان کے درمیان نقلی سرحدوں کی دیواریں ڈال دی گئی ہیں انھیں اپنے پاؤں کی ٹھوکروں سے مٹا کر لوگ ادھر سے ادھر اناج کے چند دانے مانگنے جائیں گے۔ اور ایک دوسرے کو اپنا دکھڑا سنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس وقت ——— یاد موقعہ ہوگا اس کے در رحمت وا ہونے کا ——— تم

اسے میری شاعری سمجھتے ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا۔ جب تک آدمیوں کے اس ہجوم میں تم جیسا ایک بھی انسان مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ میں مایوس نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کسی دن میں مایوس ہو گیا، تو مولینا ــــــ یاد رکھو، کہ میرے لئے اب اپنی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہیں، اُسی دن میں خودکشی کر دوں گا "

"اُس دن انسان مر جائے گا ــــ!" مولینا نے اس کی تحسین کرتے ہوئے کہا "۔ لیکن مجھے اس بات کا ڈر ہے۔ کہ کیا تم آخر تک ایسے ہی رہ سکو گے میرے عزیز ــــــ یہ دیکھو ــــــ!"

اور مولینا نے اپنی جیب سے چند روز پہلے کا ایک اخبار نکالتے ہوئے کہا "اس میں کلکتہ میں مہاتما گاندھی کی پرارتھنا سبھا کے گزشتہ کچھ ایڈیشنوں کا خلاصہ ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔ یہ دیکھو ۴ ستمبر کی ان کی تقریر۔ جس میں انھوں نے وہاں کی عورتوں کو مشورہ دیا ہے۔ کہ وہ اپنے پاس خودکشی کے لئے ہر وقت زہر رکھیں۔ یہ ۱۰ ستمبر کی تقریر۔ جس میں انھوں نے اپنے مرن برت کا ذکر کیا ہے۔ اسی میں انھوں نے کہا ہے، کہ اس طرح سکھ دھرم یا ہندو مت یا اسلام زندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ہم سب جانور بن جائیں گے" اور یہ ۱۲ ستمبر کی تقریر کا خلاصہ۔ جس میں انھوں نے مایوس ہو کر کہا ہے کہ "میں چاہتا ہوا بھی اس وقت آپ کو اہنسا کا اپدیش نہیں دے سکتا"۔ یہ دیکھو۔ یہ آج کا پیغمبر ہے۔ لیکن وہ بھی آج مایوس ہو کر مرن برت کے ذریعہ خودکشی کرنے پر تل گیا ہے۔

اُدھر میں نے کل ہی ریڈیو پر سنا تھا۔ کہ جمنا اور بیاس میں طغیانی زوروں پر ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ہندو اور مسلم پناہ گزیں اس طغیانی میں بہہ گئے ہیں۔ یہ بھی خبر تھی کہ اسی وادی میں بھی پانی بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت ہمیں سزا دینے کی تیاری کر رہی ہے۔ اب ہمارے دن پورے ہو چکے ہیں۔ پھر بھی میری دعا یہی ہے۔ کہ خدا تمھیں سلامت رکھے تمھارے ان خیالات کو سلامت رکھے۔ شاید اس طوفان میں تمھیں ہی نوح کے فرائض سرانجام دینے پڑیں۔

بارھواں باب (۱۲)

رات کے وقت آنند اور نرملا دونوں اس آگ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے جسے کیمپ والے کبھی بجھنے نہ دیتے تھے۔ کیونکہ اگر وہ ایک مرتبہ بجھ جاتی۔ تو پھر اسے جلانے کے لئے ماچس کہاں تھی۔ چنانچہ وہ لوگ اس پر ہر وقت سوکھی ٹہنیاں اور خشک پتے ڈالتے رہتے۔ گو پچھلے چار دن سے ان کے پاس پکانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ پھر بھی آگ جلتی رہنے سے جیسے بھوکے پیٹوں کو ایک نیم شعوری سی تسکین ضرور ہوتی رہتی۔

آنند کشن چند کا منتظر تھا۔ جسے اس نے مولینا کو بحفاظت اپنے کیمپ سے دور تک چھوڑ آنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے دن بھر اپنے کیمپ واپس

کی آنکھوں میں کئی خوفناک ارادے جھلکتے دیکھے تھے۔ چنانچہ اس نے مولینا کو راتوں رات ہی وہاں سے نکال دینا بہتر سمجھا۔

اس لڑکی کو مولینا آنند کے حوالے کر گئے تھے۔ کہ اس سے بہتر پناہ اسے اور کہیں نہ مل سکتی تھی۔ اور اس وقت وہ لڑکی تھکی ہاری آنند کے خیمے میں بچے کے ساتھ سو رہی تھی۔

ادھر نرملا آنند کے قریب بیٹھی اُسے چند دہکتے ہوئے کوئلوں کی روشنی میں اخبار پڑھتے دیکھ رہی تھی۔ شعلوں کے عکس سے اس کا گندمی چہرہ سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے کٹھالی میں پگھلا ہوا سونا ہو۔ اور اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ۔ یہ سونا تپ کر کندن بن گیا ہے، اس نے دن بھر مولینا اور آنند کی باتیں سنی تھیں۔ اور اس کی عظمت بلکہ وسعت سے بہت مرعوب ہو چکی تھی۔ ویسے تو گزشتہ چند دنوں ہی سے وہ اسے ایک عام آدمی سے کہیں بلند درجے کا انسان سمجھنے لگ گئی تھی۔ لیکن آج جب اُس نے آنند کو اپنا دل کھول کر باتیں کرتے ہوئے سنا۔ تو اسے اس بات کا احساس ہوا۔ کہ وہ انسان سے بھی کہیں اونچا ہے۔ اس پر جب مولینا نے مہاتما گاندھی سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا۔ کہ جہاں آ کر مہاتما گاندھی بھی مایوس ہو گئے تھے۔ اس مقام پر بھی اس نے امید کا چراغ بجھنے نہیں دیا تھا۔ تو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ گھٹنے ٹیک کر اس کے چرنوں میں سیس جھکا دے۔ اور چندن دھوپ سے اس کی آرتی اتارے۔ کیونکہ اس نے مہاتما جی کے متعلق سن رکھا تھا۔ کہ اگر وہ بھگوان کے اوتار نہیں ہیں، تو

کوئی بہت بڑے دیوتا ضرور ہیں۔ اور مولینا نے تو آنند کا درجہ مہاتما جی سے بھی اونچا بنا دیا تھا۔

شردھا اور بھگتی کے یہ چشمے جو آج اس کے دل سے پھوٹ نکلے تھے۔ انھوں نے اسے ایک نئی شانتی، ایک نیا سکون اور ایک نیا جیون عطا کیا تھا۔ اور جیسے اس نئے جیون کے تمام راستے آنند کے چرنوں کی طرف جا رہے تھے ——— "یہ کیسا نیا رشتہ تھا۔ جو مایوسیوں اور آنسوؤں کی بنیاد پر قائم ہو گیا تھا ... ... " وہ سوچتی رہی اور اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔

آنند اخبار پر ایک بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔ اخبار کئی روز کا پرانا تھا لیکن اس کے لئے نیا تھا۔ مولینا جو کچھ بتا گئے تھے۔ اس سے بھی زیادہ ہولناک تفصیل کے ساتھ کئی واقعات اس میں درج تھے۔ حتےٰ کہ یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ ساری دنیا میں ایک بھی اچھی خبر نہ رہ گئی تھی۔

پہلے صفحہ کے درمیان میں ایک موٹے چوکھٹے کے اندر موٹی سرخیوں کے ساتھ کسی نامہ نگار کی اطلاع تھی کہ "پارلیمینٹ میں آزادی ہند کا قانون پاس ہو جانے کے بعد انگلینڈ کے چھٹے جارج، اب شہنشاہ کے لقب سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور یہ گزشتہ دو ہزار برس کی تاریخ میں پہلا موقعہ ہے کہ رومن سیزروں کے بعد آج دنیا میں کوئی شخص "شہنشاہ" کا لقب یافتہ نہیں ہے"۔ اس پر اسے مولینا کی وہ طنز یاد آ گئی۔ جو انھوں نے اس خبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کی تھی:- "اور انسان سمجھ رہا ہے کہ وہ ترقی کی

طرف بڑھ رہا ہے ... ... " اور پھر اُن کے وہ فقرے کہ " آزادی کہاں ہے آزادی کا مستحق انسان کہاں ہے۔ انسان کو آزادی دو۔ تو وہ اسے دوسروں کو غلام بنا لینے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ عدم تشدد سکھاؤ تو وہ کائر اور بزدل ہو جاتا ہے۔ اُسے بہادری سکھاؤ تو وہ ظالم بن جاتا ہے۔ اور اگر اسے عیسیٰ دو۔ تو وہ اسی پیغمبر عدم تشدد کے نام پر کروسیڈ کی خونیں جنگوں میں مصروف ہو جاتا ہے ـــــ ان لاکھوں کروڑوں نیم انسانوں کو جہالت اور بھوک سے آزادی دلانے والا انسان کہاں ہے ... "

آنند نے غصے میں آکر اخبار کو آگ میں پھینک دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے پھر اُسے جلدی سے اٹھا لیا۔ اور پھر سے نئی خبروں کی تلاش کرنے لگا۔ نرملا نے یہ حرکت دیکھ کر پوچھا " کیا بات ہے۔ کوئی بُری خبر تھی کیا۔؟ "

" اچھی خبر ہی کہاں ہے "

" پھر بھی مجھے تو کچھ سناؤ۔ ذرا اونچی آواز میں پڑھو "۔ نرملا نے اُسے سہارا دینے کی کوشش کی۔

آنند اُسے فساد کی خبریں نہیں سنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے یو۔ این۔ او کی ایک خبر پڑھنی شروع کر دی۔ دکھنی افریقہ میں ہندستانیوں سے بُرے برتاؤ کے خلاف مسز وجے لکشمی پنڈت کی تقریر کا ذکر تھا۔

نرملا نے درمیان ہی میں ٹوک دیا " یہ یو نو کیا ہے "

آنند نے اُسے بتایا کہ " یہ یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن ہے، جہاں

دنیا بھر کے ہر ملک کی فریاد سنی جاتی ہے۔"

"تو پھر جواہر لال کی بہن وہاں میری بات کیوں نہیں کرتی۔ میری ہی کیا۔ ہم سب کے لئے فریاد کیوں نہیں کرتیں۔ ساری دنیا کے پنچ کچھ تو ہمارا نیائے کریں گے۔ شاید میرا ننھا پریم ... ... "

آنند کے کانوں کے اردگرد جیسے سناٹا چھا گیا۔ وہ اور کچھ نہیں سن سکا۔ اس لڑکی نے انجانے میں کتنی بڑی طنز کی دنیا کی اس پنچایت پر، اور وہ اپنے آپ کو جواب دے سکنے کے قطعی ناقابل محسوس کرنے لگا۔

" ... ... وہ آرگنائزیشن کب بنے گی جو دنیا کے ہر انسان کے لئے ہو گی۔ جہاں محض بڑی بڑی حکومتوں کے نمائندوں کی شنوائی نہیں ہو گی۔ بلکہ ہر انسان کی پہنچ ہو گی۔ ہر انسان جہاں کھڑا ہو کر فریاد کر سکے گا۔ اور انصاف پا سکے گا۔ ... ... " وہ محض سوچتا رہا لیکن جواب نہ دے سکا۔

نرملا نے محسوس کیا کہ شاید اس نے پھر سے اپنا ذکر چھیڑ کر ایسی بات کی ہے۔ جس سے آنند کو صدمہ پہنچا ہے۔ اور اُسے اپنی اس حرکت پر افسوس ہونے لگا۔ وہ اس دیوتا کو جو پہلے ہی ساری نسلِ انسانی کے دکھ سے دکھی تھا۔ اپنے غم کی کہانی یاد دلا کر اور دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے تو آئندہ اس کے دکھوں کو بانٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے آنسو اپنے دامن سے پونچھنے کی تمنا کی تھی۔ پھر یہ اس نے کیا کیا ... ... ! اس نے اپنی غلطی کو جلدی سے سدھارنے کی کوشش کی۔ اور ایک اور ہی سوال پوچھ لیا۔

"کیا افریقہ انگریزوں کا گھر ہے"

"نہیں۔ وہاں بھی وہ اسی طرح گئے تھے۔ جیسے ہندستان میں آئے تھے"۔ آنند نے جواب دیا۔

"تو پھر وہ ہندستانیوں کو وہاں نہ رہنے دینے والے کون ہوتے ہیں۔ ہندستانی بھی آدمی ہیں جانور تو نہیں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دیسی اور بدیسی کا نام لے کر آدمی اور آدمی کے بیچ دیواریں کیوں ڈال دیتے ہیں۔؟"

اور آنند سوچ رہا تھا کہ ان سادہ سے سوالوں میں کتنی گہرائی ہے۔ لیکن نرملا تو خواہ مخواہ ادھر ادھر کی باتیں پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ سوال پر سوال کرتی گئی کہ "کیا ہر دیش میں ایسا ہی ہوتا ہے۔؟ اچھا اگر ایک دیش کا آدمی دوسرے دیش میں رہ نہیں سکتا۔ تو وہاں شادی بھی نہیں کر سکتا ہوگا؟" نرملا بڑی سادگی سے پوچھتی جا رہی تھی۔ اور آنند اس کے سادہ سے سوالوں کی گہرائی ناپتا ہوا سوچ رہا تھا کہ "یہ انسان جو اس زمین کے ننھے ننھے ٹکڑوں کے لئے ہڈی پر لڑنے والے کتوں کی طرح لڑ رہا ہے۔ کس قانون کی رو سے چاند اور ستاروں تک راکٹ پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا وہاں سے غیر ملکی کہہ کر باہر خلا میں نہ پھینک دیا جائے گا ——— ہائے رے انصاف! انصاف کب ہوگا۔ وہ وقت کب آئے گا۔ جب انسان اور انسان کے درمیان سے امتیاز کی دیواریں توڑ دی جائیں گی۔ جب ایک ملک کے انسان اور دوسرے ملک کے انسان کے درمیان ہتھیار بند

سپاہی نہ رہیں گے۔ جب کسی آنند اور اوشل کے درمیان روپے کی دیواریں نہ کھڑی ہوں گی۔ وہ مساوات کا دن ــ وہ آزادی کا دن ... ... "

وہ خوش آنند خوابوں کی تمنا کرتا رہا۔ اور نرملا نے یہ سمجھ کر کہ اب بھی بات نہیں بنی۔ اس کا دھیان بٹانے کے لئے اخبار پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"تم تو چپ ہو گئے۔ پڑھو تو سہی۔ یہ کیا خبر ہے جو اتنی موٹی موٹی لکھی ہوئی ہے"۔

آنند کو اپنی اس طرح کی بے رخی پر افسوس ہوا۔ اور اس نے نرملا اور اس کی خبروں میں دلچسپی کو دیکھ کر تمام خیالات دماغ سے جھٹک دیئے۔ اور وہ خبر پڑھنا شروع کی۔ پنڈت جواہر لال نے ۹ ستمبر کو ریڈیو پر جو تقریر کی تھی اس کا خلاصہ دیا ہوا تھا ــــــ پنڈت جی نے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"آج جب میں مہاتما گاندھی کے سامنے گیا۔ تو میں ان سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا۔ شرم سے میری گردن جھکی ہوئی تھی ــــــ وہ عظیم انسان ــــ ہمارا گورو آج کیا سوچتا ہوگا۔ کیا زندگی بھر وہ ہمیں اسی لئے اپدیش دیتا رہا کہ ہم یہ کارنامے کریں جو آج کر رہے ہیں۔

جب میں ان کارناموں کا خیال بھی کرتا ہوں تو خوف و دہشت کے مارے میں جیسے اپنا خون چوسنے لگ جاتا ہوں۔ اور آج کل خون ہی تو رہ گیا ہے ہمارے پینے کے لئے ... ... ان ہزاروں لاکھوں اموات

سے بھی بدتر ہے وہ ذلت اور شرمندگی جواب کئی نسلوں تک ہمارے ساتھ چپکی رہے گی۔

...... اتنے کئی سالوں سے جو خواب ہم دیکھتے آرہے تھے کیا ان کی تعبیر یہی تھی! ایک نسل نے جو کام اپنی ساری زندگی میں کیا تھا کیا وہ یوں تباہ ہو جائے گا؟ ...... یہ بڑی نازک گھڑی ہے۔ یہ سوچنے کا مقام ہے۔ کہ ہم آخر ہندستان کو کیا بنانا چاہتے ہیں، ہم کیسا ہندستان اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جانا چاہتے ہیں ......

دوسری طرف جو کچھ ہوا۔ وہ سن کر ہمیں بھی جوش آتا ہے۔ مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ جو میں کرنے لگا ہوں۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیا ہم لٹیروں کا ملک بنانا چاہتے ہیں؟ عورتوں اور بچوں کے خون سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں میں لوٹ مار کا سامان لئے ہوئے فسادیوں کے ہجوم جب مجھے دیکھ کر "جواہرلال کی جے" اور مہاتما گاندھی کی جے، کے نعرے لگاتے ہیں۔ تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ کیا میں لٹیروں اور ڈاکوؤں کا سردار ہوں؟

میرے بھائیو۔ یاد رکھو کہ ملک پاگل پنے سے نہیں بنتے۔ نہ پاگل آدمی ملکوں کو بناتے ہیں۔ ہم اس وقت محض لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں سے نہیں کھیل رہے ہیں۔ بلکہ ایک قوم اور ایک ملک کی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ اپنے مستقبل سے کھیل رہے ہیں —— سمجھو اور سنبھلو —— !!"

آنند نے اطمینان سے اخبار رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے آثار جھلکنے لگے۔ اور اس نے الاؤ سے باہر نکلی ہوئی ایک لکڑی پر سر کو ٹیکتے ہوئے کہا "ابھی انسان مرا نہیں۔ ابھی وہ موت کے ساتھ لڑ رہا ہے"

نرملا نے اس کے چہرے پر خوشی کے آثار پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔ اب تک وہ اس کی باتوں کا مطلب بھی سمجھنے لگ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے شعلوں کی روشنی میں دمکتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے ہی کہا "ہاں۔ ابھی وہ بالکل مایوس نہیں ہوا۔ اور جب تک امید کی ڈور نہیں ٹوٹی وہ زندہ رہے گا"

"اور یہ ڈور نہیں ٹوٹے گی" - آنند نے جوش میں اٹھتے ہوئے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ نرملا کی آنکھوں میں دیکھتے ہی جانے کیوں اسے یہ احساس ہوا جیسے اس نے ان بظاہر خوشی سے چمکتی ہوئی نگاہوں کے پس پردہ گہری مایوسیوں کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہو۔ اور اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اس نے بات کا انداز بدل دیا "میرا مطلب ہے کہ اس ڈور کو نہیں ٹوٹنا چاہیئے۔ ورنہ جس دن یہ کچا دھاگا ٹوٹ گیا۔ اس دن انسان خودکشی کرے گا"

"خودکشی ـــ ؟" نرملا اس بات کو سمجھ نہ سکی تھی۔

"ہاں۔ خودکشی ـــ! کیونکہ انسان کو کوئی دوسری مخلوق نہیں مار سکتی۔ اگر مارے گا۔ تو انسان خود انسان کو مارے گا۔ وہی انسانیت کی خودکشی کا دن ہو گا۔ جب انسان مر جائے گا۔ اور مارنے والا ـــــــ انسان

نہیں رہے گا "

نرملا نے اس کی بات سمجھتے ہوئے من ہی من میں اسے پرنام کرتے ہوئے سوچا کہ " جب تک تم جیسا ایک بھی انسان زندہ ہے۔ انسانیت نہیں مر سکتی "

"میں بچ گیا۔ میں بچ گیا " پاگلوں کی طرح ڈراؤنے قہقہے لگاتا ہوا اجاگر سنگھ کسی بھوت کی طرح اچانک سا جانے کہاں سے نمودار ہو گیا۔ نرملا اس کی صورت دیکھ کر کانپ گئی۔ اور لاشعوری طور پر آنند کے ساتھ لگ گئی۔ آنند بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔

اجاگر سنگھ کے کپڑے بالکل بھیگے ہوئے تھے۔ اور ان سے پانی نچڑ نچڑ کر زمین پر چھوٹی چھوٹی دھاریاں بنا رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر آنند نے پوچھا۔

" اجاگر۔ کیا تم اس وقت دریا میں اتر سکتے "

کہیں اندر سے کے سے آواز آئی " نہیں بھیا۔ بلکہ دریا چڑھ آیا ہے " اور یہ کہتا ہوا کشن چند اجاگر کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس کے کپڑوں کی بھی یہی حالت تھی۔ " مولینا کو بڑی مشکل سے پیچھے نالی ڈھلان کے اس پار تک پہنچا کر آیا ہوں۔ آتے ہوئے مجھے قریب قریب تیرنا پڑا۔ بلکہ اگر اس آگ کی روشنی دور سے دکھائی نہ دیتی تو میں پانی میں راستہ بھول جاتا۔ پانی ہر لحظہ چڑھتا جا رہا ہے۔ ہم سب کو ابھی یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ ورنہ گھر جانے کا خطرہ ہے " کشن چند ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

اجاگر سنگھ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس کھلونے کے بجائے کو ہوا میں لہراتے ہوئے پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"میں بچ گیا۔ میں بچ گیا۔"

یوں معلوم ہو رہا تھا۔ گویا وہ اس بڑھتے ہوئے طوفان پر طنز کر رہا ہو۔

نرملا اتنے ہی میں وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ وہ تیر کی طرح اپنے خیمے تک گئی۔ اور اس نے سوتے ہوئے بچے کو اس طرح جھپٹ کر اٹھا لیا۔ کہ اس نے ڈر کے مارے ایک زور کی چیخ ماری۔ اور پھر بے تحاشا رونے لگا۔

بچے کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ قریب قریب سارے کیمپ میں شور و غل مچ گیا۔ جو اٹھتا تھا۔ وہ کچھ اپنے ہی بارے میں شکوہ شکایت کرتا تھا۔ لیکن کشن چند اور آنند کے سوا کوئی کسی دوسرے کو پکارنے یا جگانے کی تکلیف گوارا نہ کر رہا تھا۔ پھر بھی اس شور کے مارے آدھے سے زیادہ لوگ خود ہی جاگ گئے تھے۔

تیرھواں باب ۱۳

سب لوگ اسی ننھے سے الاؤ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اب بڑھتے ہوئے پانی کا شور ہر ایک کو سنائی دے رہا تھا۔ اور ہر ایک وہاں سے دور چلے جانے کے متعلق اپنا اپنا مشورہ دے رہا تھا۔ جو تھوڑا بہت سامان وہاں موجود تھا۔ اُسے اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ گزشتہ دو چار دن بالکل بھوکے رہنے کے باعث اب کسی میں سامان اٹھا کر چلنے کی ہمت ہی نہ تھی۔ پھر بھی لوگوں نے اپنے اپنے کھیس اور چادریں کندھوں پر ڈال لی تھیں۔

بہر صورت اب سوال یہ تھا۔ کہ وہ جائیں کدھر کو۔ کیونکہ جو پگڈنڈیاں

انھیں معلوم نہیں۔ وہ پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ اور اندھیرے کے باعث انھیں یہ پتہ نہ لگ رہا تھا۔ کہ پانی نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ یا ابھی کوئی طرف خالی ہے۔

روشنی کا واحد ذریعہ وہ الاؤ کی آگ ہی تھی۔ کیونکہ نہ کسی کے پاس اب تک کوئی ماچس باقی تھی۔ نہ بیٹری۔ اسی لئے چند روز سے وہ ہر وقت سوکھی ٹہنیاں اور پتے ڈال کر اس الاؤ کو بجھنے نہ دے رہے تھے۔

کسی نے مشورہ دیا۔ کہ ایک جلتی ہوئی لکڑی کو مشعل کے طور پر استعمال کرتے ہوئے چاروں طرف گھوم کر راستہ تلاش کیا جائے۔ بس یہ آواز نکلنی تھی۔ کہ لوگ اس ننھے سے الاؤ پر ٹوٹ پڑے۔ حتیٰ کہ اس کی چار پانچ جلتی ہوئی ٹہنیاں ایک دوسرے کے ہاتھ سے چھینا جھپٹی کے دوران میں بالکل بجھ گئیں۔ اور وہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھی گل ہو گئی۔ اس پر سب نے ایک دوسرے پر لعنت پھٹکار شروع کر دی۔

اتنے میں کشن چند نے پھر بکھری ہوئی راکھ میں سے سلگتی ہوئی چنگاریوں کو پھونکیں مار مار کر ایک ننھا سا شعلہ بلند کیا۔ اور اس پہ ان ٹہنیوں کو رکھ کر پھر سے روشن کیا گیا۔

اب کے پانچوں ٹہنیاں کشن چند کے ہاتھ میں دے دی گئیں۔ اور وہ انھیں پھونکیں مار مار کر روشن کرتا ہوا اس ہجوم سے آگے آگے اردگرد کی جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر چکر لگانے لگا۔

ان کا کمپ قدرے اونچی جگہ پر تو تھا۔ لیکن تھا وہ بالکل ریت پر۔ جس میں جا بجا ننھی ننھی کھائیاں اور گھاٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس وقت ان سب میں پانی آگیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ ارد گرد کی ریت بھی گرتی جا رہی تھی۔ اس اندھیرے میں یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا۔ کہ کس مقام پر پانی کتنا گہرا تھا۔ کیونکہ ریت کا معاملہ تھا۔ جانے کہاں سے اس کے بند کھل گئے ہوں۔ اور دریا کا پانی نیچے ہی نیچے سے سوراخ بنا کر نکل آیا ہو۔

اسی دیکھ بھال میں مصروف تھے کہ اچانک مجمع میں سے کسی نے زور سے چیخ ماری۔ اور وہ ساتھ ہی زمین پر لوٹنے لگی۔

کشن چند فوراً روشنی لے کر اس کے قریب گیا۔ چوڑی کی آج ہی مولینا کے ساتھ آئی تھی۔ اُسے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔

ایک دم سے سارے مجمع پر دہشت طاری ہو گئی۔ اور سب لوگ پیچھے کی طرف ہٹنے لگے۔ کسی ایک کو بھی اس وقت اس بے کس مرتی ہوئی لڑکی کا کچھ علاج کرنے کا خیال نہیں آیا۔ جسے ایک مسلمان کے چنگل سے بچانے کے لئے آج صبح وہ مولینا کو مار ڈالنے پر تل گئے تھے۔ البتہ اس بات پر وہ سب بحث کرنے لگے کہ " اس کا مطلب یہ ہے کہ آس پاس کی جھاڑیوں کی جڑوں میں بھی پانی بھر گیا ہے۔ جس کی وجہ سے سانپوں کو اس سردی کے وقت میں بھی باہر نکلنا پڑ گیا ہے "

* * *

سب لوگ واپس الاؤ والی جگہ پر آگئے تھے۔ اس لڑکی کو گھسیٹ

کر آنند ساتھ لے آیا تھا۔ کشن چند نے ڈنک والی جگہ پر دو جلتے ہوئے کوئلے رکھ دیئے۔ لیکن اس کو زہر کے علاوہ نقاہت اور دہشت نے بھی بے ہوش کر دیا تھا۔ ایک دوبار اس نے "پانی، پانی" کہا۔ لیکن اس چڑھتے ہوئے دریا میں سے پانی کا ایک گھونٹ بھی لانے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ اور پھر جب یہ ڈر بھی ان کے دل میں بیٹھ چکا تھا، کہ جھاڑیوں اور بلوں سے سانپ باہر نکل آئے ہوں گے۔ اور کیا جانے کہ کچھ جانور اوپر سے بھی بہتے ہوئے آ گئے ہوں۔

نرملا نے بچے کو چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ اور خوف اس کی نگاہوں میں بھرا ہوا تھا۔ آنند نے الاؤ کے قریب پڑے ہوئے ڈھیر میں سے ایک سوکھا پتا اٹھایا۔ اسے دونے کی شکل میں بنایا۔ اور پانی لانے کے خیال سے اس بھیڑ میں سے باہر نکلا۔ تو نرملا نے آگے بڑھ کر راستہ روک لیا۔

"کہاں جا رہے ہو"

"پانی لانے۔"

"کیوں فضول جان گنواتے ہو۔ وہ تو مر گئی"

نرملا نے نہ جانے کیوں آنند کو پانی کی طرف جانے سے روکنے کے لئے اپنی طرف سے جھوٹ ہی کہہ دیا۔ لیکن جب آنند نے دوبارہ بھیڑ کے اندر آ کر اسے دیکھا۔ تو وہ واقعی مر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

سب کے چہروں پر اندھیرے کی سیاہی تھی۔ اور سب اچانک

خاموش ہو گئے تھے۔ اس سناٹے میں پانی کی آواز اور بھی خطرناک ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی ریتیلے کناروں کے ٹوٹ کر گرنے کی "دھب" سی آواز بھی آجاتی۔

"اجالا!" ایک آدمی چلایا۔

"وہ دیکھو" . .

سب نے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن کسی کو اندھیرے میں اس کی انگلی ہی دکھائی نہ دی، کہ وہ کدھر کو اشارہ کر رہا ہے۔ پھر سب نے چاروں طرف منہ پھیر کر دیکھنا شروع کر دیا۔ تو سب کی نگاہیں دریا کے دوسرے کنارے کی طرف لگ گئیں۔ جہاں دور افق پر صبح کاذب کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔

✗ ✗ ✗

صبح کاذب سے صبح صادق کے اجالے تک پہنچتے پہنچتے انہیں ڈر، مایوسی اور اندھیرے کے کئی دوروں میں سے گزرنا پڑا۔ لیکن بالآخر روشنی ہوئی۔ اور آسمان میں روشنی کے چمکتے ہی ان کے اردگرد کا سارا علاقہ چمک اٹھا۔ کیونکہ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔

ان کے کیمپ کے کنارے والے کچھ حصے بھی شاید بہہ گئے تھے، ادھر دریا میں ہر ریلے کے ساتھ پانی بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دریا کا پاٹ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اور یوں پتہ چلتا تھا۔ کہ دوسرے کنارے کے اونچے اونچے درخت دریا کے وسط میں اُگے ہوئے تھے۔ ان کے

علاوہ کئی بڑے بڑے درخت پانی کے ریلوں میں تنکوں کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔ کئی بھینسیں اور گائیں بھی اسی طرح چلی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کیا کچھ نہ تھا۔ اور دور بہتی ہوئی سیاہ سی چیزوں پہ انسانی جسموں کا بھی دھوکا ہوتا تھا۔ اور یہ بھی تو یقینی طور پر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ انسانی جسم نہ تھے۔

پانی اب تک ان کے کیمپ والی جگہ پر بھی پھرنے لگ گیا تھا اور یہ سب لوگ ریت کے ایک اونچے ٹیلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کشن چند نے بتایا کہ "مولینا رات کو کہہ گئے تھے کہ یہاں سے مغرب کی طرف تین چار میل دور جاؤ گے تو وہ بڑی سڑک ملے گی۔ جس پر ان دنوں ہندوؤں کے بڑے بڑے قافلے جا رہے ہیں۔ اور سیدھا جانے پر راستے میں مسلمانوں کا کوئی گاؤں بھی نہیں ہے"

اس خبر میں جہاں تین چار میل کے الفاظ نے چند ایک کی ہمت پست کر دی۔ وہاں سب کو پُرامید بھی بنا دیا۔

اے کاش انھیں پہلے سے اس بات کا پتہ ہوتا۔ اور وہ مسلمانوں کے دیہات میں سے گزرنے کے خیال سے ڈرتے ہوئے اس طرح اتنے دن یہاں نہ پڑے رہتے۔ بلکہ جس طرح آج وہ بھوک کے مارے صرف تین چار میل چلنے کے نام سے لرز گئے ہیں۔ اس صورت میں اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ تب ان کے پاس کھانے کا سامان بھی تھا۔ اور وہ بڑے آرام سے قافلے کے ساتھ ساتھ نکل جاتے ... ..."

مگر اب ماضی پر افسوس کرنے کا وقت کہاں تھا۔ وہ سب چلنے کے لئے تیار ہونے لگے۔ اور کشن چند چاروں طرف پھر کر یہ اندازہ کرنے لگا کہ کس طرف پانی کم ہے۔

آنند چپ چاپ کھڑا ہوا اپنے قدموں میں پڑی ہوئی اس لڑکی کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ جو آج ہی پناہ ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچی تھی۔ اور آج ہی جسے دائمی پناہ مل گئی تھی۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کسی طوفان کا خوف نہ تھا۔ کتنا سکون حاصل ہو گیا تھا اُسے۔ کتنا چین ... ... وہ یہی کچھ سوچتا ہوا اس کے نیلے ہو گئے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

... ... اوشا کے چہرے کو بھی زہر نے اسی طرح نیلا کر دیا تھا، لیکن کیا اسے بھی اسی طرح سکون حاصل ہو سکا تھا؟ اس کے چہرے پر کیوں موت کے بعد بھی بے چینی اور کرب کے آثار تھے ــــ! تو کیا موت میں بھی ہمیشہ سکون نہیں ہوتا ــــ؟ نہیں۔ موت میں ضرور سکون ملتا ہوگا کم از کم اس کی گود میں پناہ تو مل جاتی ہے۔ ہر قسم کے خطروں سے، ہر روز کے خوف سے چھٹکارا تو پا جاتا ہے انسان۔ پھر اُسے جان بچانے کے لئے ادھر سے ادھر بھاگنا تو نہیں پڑتا ... ... "

" وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔ سنبل کا درخت "۔ اچانک نرملا اس کا بازو جھنجھوڑتی ہوئی چلانے لگی۔ دور پرے کنارے کے قریب ایک بہت بڑے درخت کا اوپر والا حصہ پانی کے اوپر تیرتا نظر آیا۔ نکلتے ہوئے سورج کی سرخ کرنوں سے اس کے بڑے بڑے پھولوں کی سرخی بہت

نمایاں ہوگئی تھی۔

"یہ ہمارے گاؤں کا درخت ہے۔ یہ ہمارے مکان کے قریب تھا، یہ ندی ہے۔ یہ وہی ہے۔ ہائے ہمارا گاؤں بہہ گیا۔ اُن کا کیا ہوا۔ میرا پریم ۔۔۔"

اور پھر اس نے آنند کی آنکھوں میں کچھ ایسی نگاہیں گاڑ دیں۔ جن میں ہزاروں لاکھوں سوال تڑپ رہے تھے۔

آنند ڈر گیا۔ وہ اس قسم کی نگاہوں سے لرز جاتا تھا۔ پہلے ہی سے وہ ان نیزوں کی طرح چبھتی ہوئی سوالیہ نگاہوں کا ستایا ہوا تھا۔ ان سے بچنے کے لئے تو وہ لاہور سے بھی بھاگ آیا تھا۔ لیکن یہاں بھی ... ... !

وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

سامنے پرلے کنارے کے ساتھ ساتھ کئی چارپائیاں، لکڑیاں اور گھروں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بہتی چلی جا رہی تھیں۔ نرملا انھیں دیکھ رہی تھی۔ اور بڑبڑا رہی تھی "وہ پلنگ ہمارا ہوگا۔ اس پر پریم سویا کرتا تھا لیکن ... نہیں ... ... وہ آج بھی وہ جان بچا کر دور بھاگ گئے ہونگے وہ پریم کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے"۔ اور پھر جب کئی انسانی جسم بے بس تنکوں کی طرح بہتے نظر آنے۔ تو وہ آہستہ ہوتی ہوئی آواز میں کہنے لگی "ہیں۔ یہ تو سارا گاؤں بہہ گیا ہے۔ اب وہاں جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سب ڈوب گئے ہیں۔ سب ڈوب گئے ہیں ۔۔۔"

اور سب کی نگاہیں پانی پر تیر رہی تھیں۔ اچانک ایک آدمی چلّایا۔

"کشتی ——— کشتیاں ... ... "

اور واقعی دو خالی کشتیاں کسی درخت سے جوے ٹوٹے ہوئے دو پتوں کی طرح تیز لہروں کے ساتھ بہتی، بھنوروں میں چکراتی اور پھر کسی تندرو کے کندھوں پر سوار ہو کر تیر کی طرح آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ کشتیاں کیمپ والے کنارے کے قریب تھیں۔

"یہ ادھر رہنے والے ان ہی مسلمانوں کی کشتیاں ہیں۔ شاید ادھر کے گاؤں بھی بہنے لگے۔"

لیکن نرملا کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ وہاں تو کشتیوں کو قریب آتا دیکھ کر سب شور مچانے لگ گئے تھے۔ کسی نے پکارا "منہ کیا دیکھتے ہو۔ کوئی تیرنے والا انھیں پکڑ لائے تو سب کا بیڑا پار ہے۔"

لیکن تیراک ان میں کوئی ہوتا تو اب تک اس مقام سے نکل نہ گیا ہوتا۔ پھر بھی دو آدمیوں میں جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ وہ آگے بڑھے

کسی نے پوچھا "تیرنا آتا ہے ——؟"

ایک نے جواب دیا "نہیں۔ لیکن یہ کنارے کنارے تو آ رہی ہیں۔ یہاں پانی کم ہوگا۔"

اور وہ آگے بڑھنے لگے۔ انھیں دیکھ کر اور بھی کئی ایک میں ہمت آگئی۔ اور دوسروں کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کہیں ہم پیچھے نہ رہ جائیں۔ چنانچہ اسی طرح اکا دکا کرکے لوگ پانی میں اترتے گئے۔

وہ دونوں آگے جانے والے کمر کمر تک گہرے پانی میں پہنچ چکے

تھے۔ کشتیاں ان کے قریب پہنچنے والی تھیں۔ دوسرے لوگ جلدی جلدی ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ کہ اچانک کشتیاں ان کے قریب آتے ہی ایک ایسی تند رو سے ٹکرائیں کہ گولی کی طرح سے ان کے پاس سے گذر گئیں۔ پھر بھی انھوں نے روکنے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو کشتیوں سے ٹکراتے ہی انھوں نے خود بھی ایک ایسا جھٹکا کھایا۔ کہ پھر وہ دونوں پلک جھپکتے میں کئی گز آگے دریا میں ہی ہاتھ مارتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور دوسرے لمحے میں وہ بھی دریا میں بہنے والی اور کئی، چیزوں، میں شامل ہو گئے۔

⁂ ⁂ ⁂

اس واقعہ سے پچھلے لوگ سنبھل گئے۔ اور واپس ہونے لگے لیکن ان میں سے بھی ایک آدمی کا پاؤں اچانک ایک ایسے گڑھے میں جا پڑا۔ کہ پھر وہ وہاں سے نکلا ہی نہیں۔

سب وہیں واپس آ گئے۔ جہاں آنند اس لاش کے قریب چپ چاپ کھڑا تھا۔ کشن چند نے آہستہ سے اُسے کہا کہ "دو آدمی بہہ گئے"۔

"مصیبت سے تو چھوٹے" آنند نے سرد سی آواز میں جواب دیا۔

کشن چند نے اس کا موڈ عجیب سا دیکھ کر مزید گفتگو مناسب نہ سمجھی اور ھر نرملا دوسرے کنارے کی طرف نگاہیں گاڑے کچھ دیکھ رہی تھی شاید وہ بہنے والی چیزوں اور لاشوں میں کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

باقی لوگ ابھی کچھ فیصلہ نہ کر پائے تھے، کہ انھیں کیا کرنا چاہئے ان تین آدمیوں کے بہہ جانے کے بعد، انھیں کشن چند سے یہ پوچھنا بھی

یاد نہ رہا تھا، کہ باہر نکلنے کے راستوں کے متعلق اس کی چھان بین کا کیا نتیجہ نکلا ہے کہ اتنے میں پھر ایک کشتی بہتی نظر آئی۔

اب کے کسی میں آگے جا کر اُسے روکنے کی جرات نہ ہوئی۔ سب اُسے لاچاری کے انداز میں دیکھتے رہے۔ البتہ اگر نگاہوں میں اُسے کنارے کی طرف کھینچنے کی کوئی طاقت ہو سکتی ہے۔ تو وہ اسے پوری طرح استعمال کر رہے تھے۔ گویا وہ کشتی اس وقت دریا میں نہیں۔ بلکہ ان سب کی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔

کشتی نے جانے کس چیز سے ٹھوکر کھائی۔ کہ اچانک اس کا رُخ کنارے کی طرف ہو گیا۔ اور اپنی پچھلی رفتار کے زور پر وہ واقعی اسی کنارے کی طرف تیزی سے بڑھی۔ اور جس جگہ کل ان کے خیمے، تنے ہوئے تھے وہاں پہنچ کر وہ ریت میں پھنس گئی۔

پھر کیا تھا۔ سب لوگ بے تحاشا اس طرف بھاگے۔ اور اُسے جاتے ہی دبوچ لیا۔ اور ایک دوسرے کے اوپر سوار ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

یہ دیکھ کر کشن چند بھاگا ہوا وہاں گیا۔ اور اس شور و غل سے بلند تر آواز میں چلا چلا کر کہنے لگا کہ "اس طرح سب ڈوب جاؤ گے۔ باری باری جاؤ۔ پہلے عورتوں اور بوڑھوں کو بیٹھنے دو۔ باقی کچھ نوجوان اس کے سہارے تیرتے ہوئے جا سکتے ہیں" لیکن وہاں اس کی کون سنتا تھا۔

ادھر نرملا نے چپ چاپ کھڑے ہوئے آنند سے کہا "آپ

نہیں جائیں گے ۔؟"

"میں تو اُدھر ہی سے بھاگ کر آیا ہوں ـــــ تم جاؤ کشن چند عورتوں کے لئے جگہ بنا رہا ہے "

نرملا چپ چاپ بچے کو گود میں لئے کھڑی رہی۔ نہ کچھ بولی نہ ادھر گئی۔

ان کے قریب ہی اجاگر سنگھ بھی کھڑا تھا۔ آنند نے اس سے کہا: "اجاگر۔ تم نہیں جاؤ گے ۔؟"

"بک مت۔" اجاگر چیخا: "میں چلا جاؤں گا تو مسلمانوں کو کون مارے گا۔ مجھے میرے وطن سے نکالتے ہو ۔؟" اور اس کی آنکھوں میں سرخی جھلکنے لگی۔

ادھر کشن چند کے چلانے کے باوجود کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کے اوپر لد رہے تھے۔ چند چار نوجوانوں نے دھکا دیکر کشتی کو کھلے پانی میں کر دیا تھا۔ اور جونہی کشتی ایک تند ریلے کی جھپٹ میں آنے لگی۔ تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی چمٹ گئے تھے۔

اتنے وزن کے نیچے کشتی سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اور ہر لحظہ یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ اب گئی۔ اب گئی۔ لیکن تمام سوار جرأتمندانہ وار اس خطرے کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کسی نے اونچی آواز میں چیخ تک بلند نہیں کی۔

لہریں انھیں اپنے قابو میں دیکھ کر خوشی کے مارے ان کے ارد گرد

ناچتی رہیں۔ تیز و تند ریلے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ان سب پر ٹڈ راؤ سے آوازے کستے رہے۔ لیکن وہ سب خاموش رہے ساری کشتی میں کہیں کوئی ہلتا ہوا بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ البتہ عین درمیان میں بیٹھے ہوئے دو تین آدمی کچھ عجیب قسم کی دھکم پیل میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ اور اچانک پھر ایک عورت ان کے درمیان سے اپنا آپ چھڑا کر کھڑی ہو گئی۔

وہ اتنی تھی۔ اس کشتی میں بیٹھی ہوئی واحد عورت۔ جسے ان تڑپتی ہوئی لہروں اور قہقہے لگاتے ہوئے ریلوں کے اس وحشیانہ ماحول میں پھر سے جوش آگیا تھا۔ اور آخر وہ اپنا آپ چھڑا کر کھڑی ہو گئی ... ...

اتنے میں ایک تیز لہر غصہ میں بل کھاتی ہوئی جو آگے بڑھی ہے تو اس نے آتے ہی کشتی کو کتاب کے ورق کی طرح الٹ دیا۔

اسی ایک لمحے میں جو تصویر آنند کے سامنے آئی۔ اس میں صرف ایک لمبی ڈوبتی ہوئی سی چیخ تھی۔ اور یا پھر کشتی کے وسط میں کھڑی ہوئی ایک عورت دکھائی دیتی تھی۔ جو اپنی دھوتی کو پیٹ سے اوپر تک اٹھا کر چلا رہی تھی ــــ "لو دیکھ لو ... لو دیکھ لو ... ..." اور بس!! اس کے بعد تو ایک بہت بڑی آبی قبر کی خلا پر چاروں طرف سے جھپٹ کر ملتی ہوئی لہریں ہی رہ گئی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی فضاؤں کو دہلاتا ہوا ایک خوفناک قہقہہ کہیں قریب سے گونج اٹھا ــــــ اجاگر سنگھ اس جگہ پر نظریں گاڑے

جہاں کچھ دیر پہلے ایک کشتی تیر رہی تھی ۔ قہقہے لگاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔
"میں بچ گیا ۔ میں بچ گیا۔"

آنند جیسے ڈر کے مارے کانپ گیا ۔ نرملا نے فوراً اس کا بازو تھام لیا۔

آنند کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اجاگر سنگھ خود اس پر طنز کر رہا ہو۔ جیسے اس وقت ان چاروں کا بچ جانا بالکل ویسا ہی بچ جانا ہو، جیسا اجاگر سنگھ کا اپنے بیوی بچوں کو قتل کرنے کے بعد بچ جانا۔

✻ ✻ ✻

کشن چند ابھی تک اسی جگہ پانی میں کھڑا تھا۔ جہاں سے کشتی روانہ ہوئی تھی ۔ اس کی نگاہیں اسی جگہ جم کر رہ گئی تھیں۔ جہاں کشتی پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی تھی ۔ اس کے سارے اعضا جہاں تھے وہیں رہ گئے تھے حتیٰ کہ وہ کسی تیز رفتار کیمرے سے اتاری گئی تصویر کی طرح ایک خاص حرکت کے دوران ہی میں منجمد ہو کر رہ گیا معلوم ہوتا تھا۔ اگر اس کے سارے جسم میں کہیں کوئی حرکت دکھائی دیتی تھی۔ تو وہ اس کے آنسوؤں کی روانی میں تھی۔ جو بے اختیار بہے چلے جا رہے تھے۔

آنند نے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تم بڑے سادست ہو کشن"

"نہیں" اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بڑے اذیت پرست ہو تم" آنند اسی ٹھنڈی آواز میں کہتا

گیا "تمھیں اس بات کا دکھ ہو رہا ہے کہ یہ سب لوگ کیوں اس طرح ایک ہی ساتھ سکون اور شانتی کی گود میں چلے گئے ہیں "

" بھیا۔ ؟ " کشن چند نے حیرت سے آنند کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہا ہے کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟

لیکن آنند نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف جمی ہوئی برف کے کناروں کی سی تیز نگاہیں کشن چند کے چہرے پر کچھ اس طرح گاڑ دیں جیسے کوئی نیزے کی انی کسی کی آنکھوں پر رکھ کر پوچھے۔ کہ کیوں۔ ؟ کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے تھے ؟

⁂ ⁂ ⁂

نرملا اندرا جاگر سنگھ کے قریب پہنچ کر کشن چند نے کہا۔ کہ اب جلدی سے نکل چلنا چاہیئے۔ میں وہ اوپر والی کھائی دیکھ کر آیا تھا۔ اس میں سے ابھی نکل سکنے کی گنجائش ہے۔ چلئے جلدی کیجئے۔ پانی اوپر بڑھ رہا ہے "

چلنے سے پہلے آنند نے ایک نظر پھر اس لڑکی کی لاش کی طرف دیکھا۔ جو اب بڑھتے ہوئے پانی میں بھیگ رہی تھی۔ پھر وہ ہنسا اور کہنے لگا۔

"پناہ گزین ــــــ !"

" چلو۔ اب جلدی کرو "۔ نرملا نے اُسے بازو سے پکڑ کر وہاں سے قریب قریب گھسیٹتے ہوئے کہا۔

کشن چند نے ایک ہاتھ میں بچہ اٹھایا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ اجاگر سنگھ کا بازو پکڑے ہوئے تھا۔ نرملا آنند کو پیچھے نہ رہنے دے رہی تھی۔ اور وہ اس طرف چل دیئے۔ جدھر کا راستہ مولینا کشن چند کو بتا گئے تھے۔

چوتھا حصہ

... اور انسان مر گیا

چودھواں باب[۱۴]

آنند نے لاہور کا قتلِ عام بھی دیکھا تھا۔ وہاں کے مرگ انبوہ میں اس نے لاشوں کے جشن بھی دیکھے تھے۔ مہینوں تک بھڑکتی رہنے والی آگ اور اس آگ میں جل جانے والا وہ لاہور کا حسن ——— اُسے سب یاد تھا۔ لیکن شاید ان سب کی یادیں مل کر بھی اتنا ہول طاری نہ کر سکتی تھیں جتنا شرنارتھیوں کے اس قافلے کا ایک نظارہ کر سکتا تھا۔ جس کے ساتھ وہ گزشتہ چار دن سے چل رہا تھا۔ نہیں بلکہ گھسٹ رہا تھا۔

ان چار دنوں میں کسی ہمراہی نے انھیں روٹی کا ایک ٹکڑا تک عنایت نہ کیا تھا۔ بلکہ کسی نے پوچھا تک نہ تھا۔ کہ تم کون ہو، کہاں سے

آئے ہو۔ اور پھر روٹی کھانے کا کوئی وقت بھی تو مقرر نہ تھا۔ ہر وقت کھانے کا وقت تھا۔ یا پھر کھانے کا وقت ہی کوئی نہیں نہ تھا۔ کیونکہ جب کسی کو بھوک بہت زیادہ ستاتی۔ تو وہ اپنی جیب سے یا کسی کپڑے میں بندھی ہوئی روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا نکالتا۔ ایک آدھ لقمہ اس میں سے کاٹتا۔ اور باقی ٹکڑا پھر اسی طرح حفاظت سے باندھ کر رکھ لیتا۔ کسی کو کسی دوسرے کا خیال تک نہ تھا۔ کسی لمبے ساحل پر جمع ہو گئے سنگریزوں کی طرح وہ سب ایک دوسرے سے جدا جدا تھے۔

دن بھر لوگ اسی بھیڑ میں ایک دوسرے کے کندھوں سے کندھے ٹکراتے رینگتے رہتے۔ اور رات پڑنے پر بھی اسی طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر لیٹ جاتے۔ لیکن اس لاتعلقی کے انداز میں جیسے ان کے ارد گرد زندہ انسان نہیں۔ بلکہ کسی گھنے جنگل کی جھاڑیاں ہوں۔

آنند نے لاہور میں لاشوں کو بھی ایک دوسرے سے بغلگیر حالت میں دیکھا تھا۔ ان کے محلے کا وہ گریجویٹ کلرک اور اُسے ایک دن ربر کستی روکنے والا وہ نوجوان اندر دونوں کی لاشوں نے جیسے ایک دوسرے کا دامن تھام رکھا تھا۔ سیٹھ کشور لال کے لڑکے پریمن اور کملنی کی لاشیں کنوئیں میں بھی ایک دوسرے کی چھاتی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ لیکن یہاں زندہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جیسے ہزاروں میل دور دور تھے۔ جیسے ان کے درمیان کوئی رشتہ نہ تھا۔ کوئی تعلق نہ تھا۔ جنم کے، نسل کے، یا ملک کے تعلقات جیسے ہر قدم پر گرد راہ

کی طرح اٹھتے اور مٹتے چلے جا رہے تھے۔

یوں تو قافلے کا سارا شور ہی ایک مسلسل چیخ معلوم ہوتا تھا لیکن پھر بھی بیچ بیچ میں کبھی کبھی کوئی انفرادی چیخ سنائی دیتی ——— کسی کا خاوند مر گیا تھا۔ کسی کا بچہ تڑپ کر رہ گیا تھا ——— لیکن ایسے موقعوں پر یہ یقین نہ آتا تھا۔ کہ کوئی کسی اپنے کے لئے رو رہا ہے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا۔ جیسے کسی کو مرتے دیکھ کر انسان اپنی موت کے تصور سے تڑپ کر چیخ اٹھتا ہے۔

یہاں آکر جیسے انسانیت ننگی ہو گئی تھی۔ مذہب کا پول کھل گیا تھا۔ اور انسان اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہو گیا تھا۔ اس نے آج ہزاروں لاکھوں برسوں کی روایات کے زور پر بنے ہوئے تمام رشتے توڑ دیئے تھے۔ اور اب جیسے وہ بالکل آزاد ہو گیا تھا ——— کوئی عورت دم بھر کے لئے ٹھٹک کر ذرا بیٹھی نہیں۔ کہ پھر وہ اپنے خاوند، بیٹے یا بھائی کے برائے نام ساتھ سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ کوئی کسی کی خاطر گھڑی بھر کے لئے بھی نہیں رکتا تھا۔ خواہ خود اسے بھی چند ہی قدم آگے چل کر گر جانا پڑے۔ اور پھر اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا۔ وہ بھی اسی طرح چلنے جانے والے اپنے ساتھیوں کو دیکھتا رہتا۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا۔ زیادہ سے زیادہ کسی کے ساتھ اتنا کیا جاتا۔ کہ اگر وہ راستے ہی میں گر پڑا ہوتا تو پیچھے آنے والے جس شخص کا راستہ رکتا۔ وہ اسے گھسیٹ کر راہ سے ایک طرف کر جاتا۔ اور چلا جاتا۔

آنند نے اس دورِ آزادی کے باوجود کچھ آدمیوں کو ابھی تک رشتے کے جذباتی بندھنوں میں پھنسا ہوا بھی دیکھا۔ ان کے ہاں اگر کوئی بیمار ہو جاتا یا مزید چلنے کے قابل نہ رہ جاتا۔ تو اُسے وہ ایک طرف کسی سایہ دار درخت کے نیچے کوئی کپڑا ڈال کر لٹا دیتے۔ اور پھر باری باری سب اس کو پرنام کرتے تھوڑا بہت روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں دیتے۔ اور خود قافلے کے ساتھ ہو لیتے۔ دو چار دن وہ اسی طرح پڑا رہتا۔ اتنے میں اگر اس میں اٹھنے کی ہمت آ جاتی۔ تو وہ قافلے میں شامل ہو جاتا۔ نہیں تو پانچ چھ دن بعد قافلے کے آخری حصے کو جاتے ہوئے حسرت سے دیکھتا رہ جاتا۔ حتیٰ کہ لاشیں کھا کھا کر موٹے ہو گئے گدھ اس کے اردگرد جمع ہو کر اُسے طرح بھری نگاہوں سے دیکھنے لگ جاتے۔

کچھ ان سے بھی زیادہ جذباتی ہوتے۔ تو وہ اس مریض یا تھکے ہوئے آدمی کے پاس خود بھی بیٹھ جاتے۔ حتیٰ کہ پانچ چھ دنوں میں قافلے کا آخری سرا وہاں سے گزرتا۔ آخر اس وقت وہ بھی اسی طرح اسے باری باری پرنام کر کے قافلے کے آخری حصے میں شامل ہو جاتے۔ اور آخر میں فوجی جیپ گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے قافلے کے محافظ فوجی افسر اس کے قریب سے سگرٹوں کے دھوئیں اڑاتے گزر جاتے۔ اور ان میں بیٹھا ہوا کوئی منشی اپنی تفصیل میں ایک کا ہندسہ اور بڑھا دیتا۔

وہ قافلہ بہت لمبا تھا۔ ایک فوجی کے بیان کے مطابق اس کی لمبائی ساٹھ میل سے کچھ زیادہ تھی۔ جب ایک جگہ سے گزرنے میں

کوئی چھ سات میل لگتے تھے۔ اور اس میں کوئی چار لاکھ کے قریب ہندو سکھ شرنارتھی ہندوستان کی طرف جا رہے تھے۔

انھیں دیکھتے ہوئے آنند سوچ رہا تھا کہ آج یہ سب لوگ اپنی اپنی جان بچانے کے لئے اُس سرزمین سے بھاگ رہے ہیں۔ جس پر غیروں کو قدم تک رکھنے سے روکنے کی خاطر ان کے بزرگوں نے اپنا لہو بہایا تھا۔ جن بزرگوں نے بڑے بڑے خطرناک پہاڑوں کی قدرتی سرحدوں کو بھی نہ مان کر کابل، قندھار بلکہ وسط ایشیا تک ایک ہی ملک بنا دیا تھا۔ انھیں کے خون سے رنگی ہوئی زمین پر آج دو بھائیوں نے نقلی سرحدیں کھڑی کر دی ہیں۔ جو غیروں کی تلواروں سے بھی نہ دبے۔ ان کی اولاد آج بھائیوں کی سیاست کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اور آج چند گنتی کے لیڈروں نے اتنے لاکھ انسانوں کو بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اِدھر سے اُدھر ہانکنا شروع کر دیا ہے۔

جب انسانوں نے انسانوں کو قتل کیا۔ تو وہ اتنا مایوس نہ ہوا تھا اس میں اُسے انسان اور انسان کے درمیان ایک باہمی تعلق تو دکھائی دیتا تھا۔ خواہ وہ دشمنی کا یا نفرت کا تعلق تھا۔ مگر تعلق تو تھا۔ لیکن یہاں اس قافلے میں پہنچ کر اس نے انسان اور انسان کے درمیان جو لاتعلقی دیکھی تھی وہ اُسے مایوس کر رہی تھی۔ یہاں کوئی کسی کو مارتا بھی نہ تھا۔ تو کیا اہنسا کے یہی معنی تھے؟

وہ اسی طرح کی سوچوں میں غرق چلتا چلا جا رہا تھا۔ بھوک اور تھکن کے باعث اس کے پاؤں بہت آہستہ اٹھ رہے تھے۔ اور دوسرے لوگ

اس سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ نرملا اور کشن چند اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لیکن ان کی حالت بھی ویسی ہی تھی پھر بھی کشن چند بار بار ہمت بندھانے والی باتیں کرتا رہتا تھا۔ جس سے آنند کی بڑھتی ہوئی خاموشی کے باوجود نرملا کا دل لگا رہتا۔

بچہ پھر مرجھا گیا تھا۔ اُسے تینوں باری باری اٹھاتے۔ اور اس طرح لاپروائی سے مختلف گودوں میں الٹتے پلٹتے رہنے سے اس کے بھی بند بند تھکاوٹ سے چور ہو گئے تھے۔ اور اب وہ آٹے کی تھیلی کی طرح ہر حال میں پڑا رہتا۔ تھکاوٹ یا بھوک کے مارے اب اس کا رونا بھی بند ہو گیا تھا۔ اور یا پھر اگر وہ روتا تھا۔ تو اس کی آواز ہی سنائی نہ دیتی تھی۔ کئی روز سے کچھ نہ کھانے کے سبب نرملا کی چھاتیوں میں دودھ سوکھ رہا تھا۔ ادھر ہر روز کمزور ہوتے ہوئے بچے میں اتنی طاقت نہ رہ گئی تھی کہ وہ اس کے سوکھے ہوئے تھنوں کو اتنے زور سے چوسے کہ ان میں سے تھوڑا بہت دودھ نکل آئے۔ چنانچہ بیچ بیچ میں ایک کنارے پر بیٹھ کر نرملا اس کا منہ کھول کر اپنے ہاتھوں سے تھنوں کو زور زور سے نچوڑ کر کچھ قطرے اس کے منہ میں ڈالتی۔ اور وہ پوپلے انداز میں انھیں چاٹ جاتا۔ شرم کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ کیونکہ اس قافلے میں صورت شکل سے کوئی آدمی ہی نہیں دکھائی دیتا تھا۔

پندرھواں باب ۱۵

اسی قافلے کے ساتھ انھیں چوتھی یا پانچویں رات تھی ــ سارے جسم کی چھیلیوں میں دائمی قسم کے کھل پڑ گئے تھے۔ جس سے محض درد کا احساس ہوتا تھا۔ تھکاوٹ کا نہیں ۔ اور پھر بھوک کے مارے نیند بھی نہیں آرہی تھی ــ

کشن چند نے خوشخبری سناتے ہوئے کہا : سنا ہے، کہ ہم کل شام کو سلیمانکی کا پل پار کر لیں گے "۔

" سچ ــ ؟ " نرملا نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا: کیا تم نے کسی ملٹری والے سے پوچھا ــ ؟ "

"ہاں — ! کہتے ہیں کہ بس پانچ میل رہ گیا ہے۔ آج تک آدھا قافلہ تو پل کے پار تک جا بھی چکا ہو گا۔"

"وہ لوگ تو ہندوستان پہنچ کر بڑے آرام میں ہو گئے ہوں گے" نرملا نے حسرت بھری آواز میں کہا۔

"کہہ نہیں سکتا۔ لیکن پھر بھی اس مصیبت سے تو چھٹکارا مل گیا ہو گا انہیں"۔ کچھ دیر رک کر اس نے کہا "لیکن سنا ہے۔ کہ اسی پانچ میل کے علاقے میں پاکستانی ملٹری زیادہ ہونے کے سبب بہت سے لوگ قافلوں پر لوٹ مار کے لئے دھاوے بھی کرتے ہیں"

"مگر ہمارے ساتھ بھی تو ملٹری ہے"

"لیکن کافی نہیں۔ آج ایک فوجی کہہ رہا تھا۔ کہ اسی لئے کل شاید ہندوستان کی اور ملٹری اس قافلے کی حفاظت کے لئے پہنچنے والی ہے — سنا ہے کہ وہ روٹیاں بھی لائیں گے"

"کتنی روٹیاں لائیں گے؟ کیا سب کو ایک ایک ملے گی۔؟" نرملا نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ کتنی لائیں گے۔ ویسے ہوائی جہازوں سے بھی روٹیاں گرائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ قافلے کے اگلے حصے پر تو کل بھی ہوائی جہاز سے کتنے من روٹیاں پھینکی گئی تھیں۔ جواہر لال جی خود جہاز میں آئے تھے"

"غلط ہے۔" آنند جو اب تک چپ چاپ پڑا سن رہا تھا۔ ایک دم سے بول اٹھا۔ "بھلا انہیں کیا پڑی ہے کہ ہمارے لئے روٹیاں بھیجیں۔ آخر

جواہر لال کے ہم کیا ہوتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ یہاں جو اپنے قریبی رشتہ دار ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو سڑک پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر جواہر لال ہمارا کون ہے۔ اس کے اگر کوئی رشتہ دار ہوں گے تو وہ یو۔ پی میں ہوں گے"

"لیکن بھیا۔ ہم سب بھی تو اس کے اپنے ہیں"

"نہیں کوئی کسی کا نہیں۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں" آنند اٹھ کر بیٹھتا ہوا کہنے لگا۔"ہاں البتہ ایک بات ہو سکتی ہے۔ اُسے کوئی غرض ہوگی۔ شاید اُسے ان سب لوگوں سے ووٹ لینے ہوں۔ یا پھر انھیں کسی جنگ کی بھٹی میں جھونکنا ہو۔ وگرنہ کون کسی کو روٹی دیتا ہے۔ ہُنہ۔ !" اور وہ طنزیہ آواز پیدا کرتا ہوا آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

کشن چند بھی اٹھ کر بیٹھ گیا "تمھیں کیا ہو گیا ہے بھیا۔ تم بیمار ہو گئے ہو۔ تم یہ سب ہذیان میں کہہ رہے ہو" اور پھر اس نے نرملا کی طرف دیکھ کر کہا۔ کہ "ہم ایک دو دن یہیں آرام کریں گے۔ تاکہ یہ ٹھیک ہو جائیں۔ وگرنہ ہم دنیا کے عظیم ترین انسانوں میں سے ایک کو کھو دیں گے۔ مولنا بھی کہہ گئے تھے کہ یہ ایک عظیم ہستی ہے۔ یقیناً یہ ہوش میں ایسی باتیں نہیں کر سکتے"

نرملا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنند کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم لیٹ جاؤ۔ ذرا آرام کرو"

"میں آرام نہیں کر سکتا"۔ آنند نے اسی طرح رکھائی سے جواب دیا

"تم کیا چاہتے ہو"؟ کشن چند نے قریب آکر پوچھا

"میں جو چاہتا تھا۔ وہ پہلے کب ہو سکا جو اب ہو جائے گا" آنند نے

کسی قسم کا جوش و کھائے بغیر کہا: "میں کچھ نہیں چاہتا۔ مجھے تو صرف افسوس ہے۔"

"افسوس کس بات کا۔؟" کشن چند اس کا دل کھولنا چاہتا تھا۔

"اس بات کا۔ کہ اس کشتی میں میں بھی کیوں نہ جا بیٹھا۔ وہ سب بہت عقلمند تھے۔ سب سمجھ دار تھے ـــــ کتنے اطمینان سے اور پھر کتنی جلدی دریا کی گود میں انھیں پناہ مل گئی، کتنی شانتی ـــــ کتنا سکون ـ!"

وہ خواب میں بولنے والے کی طرح کہے جا رہا تھا۔

کشن چند نے ایک بیمار کے ساتھ دلیل بازی کرنا مناسب نہ سمجھ کر پینترا بدل کر اسی کی دلیل سے جواب دیا: "لیکن وہ وقت تو نکل گیا۔ گئے وقت پر افسوس کرنے سے اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"اب بھی ہو سکتا ہے" آنند نے زور دیتے ہوئے کہا: "ابھی وقت ہے۔ کاش اب بھی مسلمانوں کی کوئی ٹولی ہم پر حملہ کر کے ہمیں ختم کر دے تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ ورنہ ہندستان میں کیا رکھا ہے۔ وہاں سکون کہاں ہے۔"

⁂

اور جیسے اس کی دعا قبول ہو گئی۔ دوسری صبح قافلے کے چلتے ہی ایک ہلہ ہو گیا۔ صبح کے اجالے میں ابھی رات کے سرمئی اندھیرے کی ملاوٹ موجود تھی۔ کہ ان سے چند ہی قدم آگے ایک شور بلند ہوا۔ اور پھر عورتوں اور بچوں کے رونے کی چیخ و پکار کے ساتھ ساتھ 'بچاؤ۔ بچاؤ' کی آوازیں آنے

لگیں۔

فوجی محافظ دستے کا کوئی سپاہی شائد قریب نہیں تھا۔ چنانچہ لوگ فوج فوج کے لئے پکارتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ جس سے ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔

لوگ ان کے قریب سے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن وہ چاروں وہیں کھڑے رہے۔ بلکہ کشن چند تو جلدی سے اونچی آواز میں لوگوں سے یہ کہتا ہوا آگے بڑھا "ارے بزدل کیوں بنتے ہو۔ مقابلہ کرو"

لوگ پھر بھی بھاگتے رہے۔ اور کشن چند آگے بڑھتا ہوا آنند اور نرملا کی نگاہوں سے گم ہوگیا۔ اس کی مدھم سی آواز دور سے سنائی دیتی رہی۔

نرملا نے چپ چاپ کھڑے ہوئے آنند سے کہا "آگے چلئے"

"کس کے لئے" وہ آنند نے نہایت روکھائی سے پوچھا۔

اتنے میں اس طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی۔

بھاگتے ہوئے لوگ رک گئے۔ کسی نے کہا "فوج آگئی" اور لوگ پھر پیچھے کو مڑنے لگے۔ نرملا بھی آنند کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی۔

ذرا آگے گئے۔ تو دیکھا کہ کشن چند ایک مسلمان سے گتھم گتھا ہو رہا ہے۔ مسلمان کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ جسے کشن چند دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس طرح چمٹ گیا تھا کہ اسے اپنی بندوق چھڑانی مشکل ہو رہی تھی۔ کشن چند کے کپڑے خون میں تر ہو رہے تھے۔ جس گولی کی آواز آئی تھی۔ وہ غالباً اسی چھینا جھپٹی میں چلائی گئی تھی۔ اور کشن چند ہی کے لگی تھی۔

دوسرے لوگ ذرا دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ اس قدر بزدل ہو چکے تھے کہ کسی میں آگے بڑھ کر کشن چند کی مدد کرنے کی ہمت پیدا نہ ہوئی۔

کشن چند بندوق کو نہ چھوڑتا ہوا کہہ رہا تھا: نہیں اسماعیل، نہیں یہ ظلم نہ کرو۔ خدا کے لئے انھیں بھی آواز دو۔ اور ان لڑکیوں کو چھوڑ جاؤ۔"

"دیکھو تم مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا" یہ مسلمان نے جواب دیا۔ اور ایک لات کشن چند کے گولی سے چھدے ہوئے سینے میں مار کر اسے نیچے گرا دیا۔

کشن چند نے پھر بھی بندوق نہ چھوڑی۔ لیکن اس لات سے اس کی آواز اکھڑ گئی تھی۔ اس نے اکھڑتی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا کے لئے ... رسول کے لئے"

"خدا اور رسول کا نام لیتے اب تمھیں شرم نہیں آتی ___ کافر!" مسلمان نے ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

کشن چند نے وہ جھٹکا بھی سہ لیا۔ اور پھر کہنے لگا: "میں مر رہا ہوں اسماعیل یہ میری آخری درخواست ہے ... میں تمھارا بھائی ہوں"

"نہیں تم میرے بھائی نہیں ہو۔ مجاہدوں کے راستے میں روڑے اٹکانے والے تم کافر ہو ___ کافر"۔ اور پھر اس نے بندوق کا دستہ اس زور سے اس کی طرف دھکیلا کہ کشن چند کے پیٹ میں کھب سا گیا۔

"تمھاری یہی سزا ہے رحمان۔ یاد رکھو کہ قیامت کے دن بھی اب تمھاری سفارش کرنے والا کوئی نہ ہوگا!!"

کشن چند نے چوٹ کھا کر بھی دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "لا الہ الا اللہ"
اتنے میں تیزی سے آتی ہوئی ایک فوجی جیپ کی آواز آئی۔ اور اُسے دیکھتے ہی وہ مسلمان اپنی بندوق وہیں چھوڑ کر تیزی سے ایک طرف کو بھاگ گیا۔

سڑک سے کچھ دوری پر پاکستانی فوج کا ایک دستہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیئے ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ اس مسلمان کے کچھ ساتھی قافلے کی دو چار لڑکیوں کو اٹھا کر پہلے ہی اس دستے کے پیچھے پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی تیزی سے ان کے ساتھ جا ملا۔ مسلمان فوجیوں نے فوراً اسے اندر جانے کے لئے راستہ دیا۔ اور پھر اپنی قطار ٹھیک کر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔
ادھر کشن چند کلمہ پورا کر رہا تھا۔ ... ... رسول اللہ"
تماشہ دیکھنے والوں میں سے کسی نے کہا۔ "ارے یہ بھی مسلمان ہے"
اور اس آواز کے ساتھ ہی قافلے کے تمام "بہادر" خون میں لت پت کشن چند پر اس طرح پل پڑے۔ جیسے کسی چبائی ہوئی ہڈی پر کتے ٹوٹ پڑیں۔

نرملا سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بچہ تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے لوگوں کو ایک جھٹ پٹاتی ہوئی عورت کے انداز میں پیٹنا شروع کیا۔ لیکن وہاں اس کی کون سنتا تھا۔ وہ پریشان ہو کر آنند کی طرف پلٹی۔
آنند گم سم کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا ہوا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ نرملا

نے آتے ہی اُسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

"اُسے بچاؤ۔ اُسے بچاؤ ـــــ یہ لوگ اسے مار ڈالیں گے"

"چپ رہو" آنند نے فلسفیانہ انداز کی سختی سے کہا۔ "لاتعلقی کا جمود ٹوٹ رہا ہے۔ اسے ٹوٹنے دو۔ دشمنی اور نفرت کا تعلق ہی۔ لیکن انسان اور انسان کے درمیان تعلق پیدا ہو رہا ہے"۔ اور وہ مسکرانے لگا۔

نرملا اس کی بات کو بالکل نہ سمجھ سکی۔ پھر بھی وہ اسے اسی طرح جھنجھوڑتی گئی۔ "تم کیا سوچ رہے ہو۔ اُسے بچاتے کیوں نہیں"

"میں بچ گیا۔ میں بچ گیا" کہتا ہوا اور قہقہے لگاتا ہوا اجاگر سنگھ جانے کہاں سے آگیا۔ اور پھر ہاتھ میں وہی ننھا سا ٹین کا بھالا، لئے وہ اس ہجوم کی طرف لپکا۔

"کیا ہے وہ مسلا؟ کہاں ہے وہ؟"

اس نے اس طرح گرج کر پوچھا۔ کہ رحمان کے گرد کھڑے ہوئے لوگ سہم کر ایک طرف ہٹ گئے۔

مگر آنند کو اچانک جانے کیا ہوا۔ کہ وہ بھی اجاگر کے پیچھے ہی اس طرف لپکا۔

ادھر اجاگر سنگھ نے بڑا پر تکلف پینترا اختیار کر کے ایک نیزہ باز کے انداز میں اپنا 'بھالا' سنبھالا۔ اور کشن چند کی چھاتی کا نشانہ تاک کر اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے ہی آنند نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ اور اُسے گود میں جکڑ کر کہنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو اجاگر۔ یہ وہ مسلمان نہیں ہے"

نرملا کی رگوں میں اب تک ایک عجیب سا تناؤ آچکا تھا۔ وہ اب بت سی بن کر ہر حادثے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ لیکن آنند کو یوں کرتے دیکھ کر جیسے اس کا سانس دوبارہ چلنے لگا۔ ایک روحانی اطمینان کے باعث اس کے اعضا پھر ڈھیلے پڑ گئے۔ اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے جسم کو جیسے آنند کے اوپر گرا دیا۔

اب اس کی آنکھوں سے آنسو بھی رہا ہو گئے تھے۔ اور گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو آنند کی قمیض میں جذب کرتے ہوئے وہ کہنے لگی ——

"تم دیوتا ہو ——"

آنند طوفان کے بعد آنے والے سکون کی طرح گرتی ہوئی آواز میں بولا "ہاں۔ دیوتا ہی تو ہوں ... ... انسان بننا بہت مشکل ہے"

اتنے میں دو تین فوجی گاڑیاں جائے وقوعہ پر پہنچ گئی تھیں، انھوں نے ابھی ابھی زبردستی اٹھائی گئی لڑکیوں کے نام وغیرہ ان کے رشتہ داروں سے پوچھنا شروع کر دیئے۔ اور پھر وہ اپنی رپورٹ لکھنے میں مشغول ہو گئے۔

سامنے سڑک سے چند گز پرے پاکستانی فوج اپنے ملک کی حفاظت کے لئے قطار باندھے ڈٹی کھڑی تھی۔

***

قافلہ پھر آہستہ آہستہ رینگنا شروع ہو گیا تھا۔ گزرتے ہوئے لوگ خون میں لت پت کشن چند اور اس کے قریب بیٹھی ہوئی نرملا کو دیکھتے

ہوئے گزرتے تو انگلیاں اٹھا اٹھا کر اپنے ساتھ والوں سے کچھ کہتے اور آگے چلے جاتے۔

کشن جیسے رکتی ہوئی سانسوں کے درمیان اپنی کہانی مختصر کرکے سنا رہا تھا "یہ میرا نام رحمان ہے یہ میرا بھائی اسماعیل تھا ... ہمیں جالندھر میں لوٹ لیا گیا تھا ... ... پاکستان میں آکر ہم نے بھی اسی طرح لوٹ مار کرنا چاہی ... ... ہماری بہن کو ہندو لے گئے تھے۔ اسی لئے یہاں کی لڑکیوں کو ہم ... ... " وہ پھر رک گیا۔ اس کے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔

نرملا اس کی چھاتی کے زخم پر اپنا دوپٹہ رکھے روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔
"یہ تم نے کیا کیا کشن"

"نہیں۔ میرا نام رحمان ہے ... ... جب ہم نے پہلی لڑکی کو اٹھایا۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ کہ میری بہن بھی اسی طرح چیختی چلاتی گئی ہو گی ... ... پھر میں اس کا یہ بچہ اٹھا کر کسی ہندو قافلے کو ڈھونڈتا پھرا، ... ... شاید اس کی ماں ... ... "

آنند قریب کھڑا تھا۔ اور اب تک ایک تماشائی کی طرح بالکل خاموش رہا تھا۔ لیکن اب وہ خود بخود ہی کہنے لگا "میں پہلے ہی جانتا تھا۔ کہ تم سادیت ہو۔ اذیت پرست ہو۔ تم نے اس بچے کو بھی اس وقت چین سے مر جانے نہیں دیا۔ تم نے اسے اسی لئے زندہ رکھا۔ تاکہ وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرے"۔

اور رحمان نرملا سے کہتا گیا "بھیا کی حفاظت کرنا ... بہت سارے صدموں نے ان کا دماغ ہلا دیا ہے۔ وہ بیمار ہو گئے ہیں ... ... اس انسان کو مرنے نہ دینا بہن ... بس ... اب میں ... جا ... ؤں ... ... "

نرملا چیخ اٹھی "کہاں جاتے ہو! کہاں جاتے ہو رحمان بھائی؟"

رحمان نے پھر آنکھیں کھول دیں "جہاں گناہ نہیں ہے ... ... جہاں نیکی ہی نیکی ... ہے ... "

آنند ہنسا ——— "ایسی کوئی جگہ نہیں ہے"

رحمان نے آنکھیں بند کئے ہوئے ہی کہا "ہے ... ... خدا نے ضرور بنائی ہو ... گی ... ... "

کہ اچانک شکاری عقاب کی طرح ایک کھلے بالوں والی لڑکی نرملا پر اس طرح جھپٹی۔ جیسے باز کسی کبوتری پر۔

"میرا بیٹا۔ میرا بیٹا۔" چلاتی ہوئی وہ نرملا کی گود سے بچے کو یوں جھپٹ کرلے گئی۔ جیسے ڈالی سے پھول نوچ لیا جائے۔

نرملا تڑپ کر اس کے پیچھے دوڑی۔ اور اس کے ایک قدم آگے بڑھنے سے پہلے اس نے بچے کی ٹانگیں پکڑ لیں۔

"کہاں لئے جاتی ہو میرے بیٹے کو"

آنند کو بھی ایک زوردار جھٹکا سا لگا۔ اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے جھٹ اس بے ہودہ لڑکی کے چہرے پر ایک زور کا طمانچہ مارا اور

جھپٹ کر بچہ چھین لیا۔

"یہ اوشا کا بچہ ہے۔ دیکھتی نہیں"! اس نے نہایت سختی سے کہا۔

طمانچہ اس زور کا پڑا تھا کہ اس کے میلے چیکٹ منہ پر بھی انگلیوں کے نشان پڑ گئے۔ لڑکی کا نچلا ہونٹ لٹک گیا۔ اور ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے وہ آنند کی طرف اس طرح دیکھنے لگی۔ جیسے اس کے ہوش و حواس اس کے ساتھ نہ ہوں۔ پھر بھی جب آنند نے "اوشا کے بیٹے" کا نام لیا تو اس نے بڑے پر امید انداز میں کہا۔

"تو تم مجھے جانتے ہو۔ لیکن پہچانتے نہیں"

"کیا۔۔۔؟" آنند نے نیم غصہ اور نیم حیرت سے پوچھا

"کیا میری شکل اتنی بدل گئی ہے"! وہ لڑکی اسی طرح منہ پر ہاتھ رکھے کہنے لگی "کہ اب میں پہچانی بھی نہیں جاتی شاید سب کی یہی حالت ہے۔ تمھیں بھی تو میں نہیں پہچان سکتی۔ مگر پھر بھی بھگوان کا شکر ہے۔ کہ تم نے میرے بچے کو پہچان لیا کہ یہ اوشا کا بچہ ہے۔ اوشا کو بھلے ہی نہ پہچانو لیکن اوشا کے بچے کو تو پہچانتے ہو"۔ اور خوشی کے مارے اس کے آنسو بہنے لگے۔

"تمھارا نام اوشا ہے؟" آنند نے کانپتے ہوئے پوچھا

"ہاں۔ کیا تمھیں یقین نہیں آتا۔! میں ہی اوشا ہوں۔" اور پھر کشن چند کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی "یہ ظالم مجھے زبردستی اٹھا کر

لے گئے تھے۔ پھر وہاں سے وہ مجھے ... ... "

آنند نے پاگلوں کی طرح ایک زور کی چیخ ماری "نہیں ۔ مت سناؤ مجھے ۔ یہ لے جاؤ اپنے بیٹے کو ۔" اور اس نے اس کا بیٹا اس کی گود میں پھینک دیا ۔ اور خود رحمان کی طرف منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا ۔

رحمان اسی جھگڑے کے دوران میں نجانے کب مر گیا تھا ۔ البتہ اس کی چھاتی میں سے خون ابھی تک رِس رہا تھا ۔

اسے دیکھ کر آنند کے چہرے پر ایک زہر خند کے نقوش پھیلنے لگے ۔

"اب تو چین سے مر گئے ہونا ۔" اس نے جیسے رحمان کو طعنہ دیا لیکن رحمان کے چہرے پر جیسے ایک جوابی طعنہ لکھا ہوا تھا "آخر مل گئی نا اوشا تمہیں ۔؟"

یہ کٹار کی سی تیزی سے دل میں اترتا ہوا سوال آنند کو اس مقام پر لے گیا ۔ جہاں پہنچ کر اسے ہنسی آنے لگی ۔ اور اس کا جی چاہا ۔ کہ وہ زور زور سے ہنستے ہنستے لگ جائے ۔

چند لمحوں کے لئے تو اسے یہ سب کچھ ایک بہت بڑا مذاق دکھائی دینے لگا ——— اس کے قریب سے رینگتا ہوا یہ قافلہ حیران و پریشان کھڑی ہوئی نرملا ، اپنے بیٹے کو چھاتی سے چمٹا کر بیٹھی ہوئی اوشا ، خون میں لت پت رحمان کی لاش اور ٹرک سے چند ہی گز کے فاصلے پر اکڑ کر کھڑے ہوئے پاکستان کے محافظ اور ان کی قطار کے پیچھے گم ہو جانے

والے وہ رحمان کے بھائی بند جو ابھی ابھی قافلے سے چند لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے، اور پھر وہ ہندوستانی محافظ بھی جو ابھی ابھی ان اٹھائی جانے والی لڑکیوں کی فہرست بنا کر لے گئے تھے ——— یہ سب کچھ اُسے ایک بہت بڑا مذاق دکھائی دینے لگا۔ جیسے کسی سستے قسم کے مذاحیہ ڈرامے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ بے ہودگیوں کی انتہا کر دی جائے۔ اور جیسے یہ ڈرامہ ختم ہوتے ہی یہ سب کردار ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ان بے ہودگیوں کو یاد کر کے پھر سے ہنسنے لگیں گے۔ قہقہے لگائیں گے ——— اور اس کا جی بھی چاہنے لگا۔ کہ وہ ایک زور کا قہقہہ لگائے۔

✲ ✲ ✲

نرملا ان پے درپے حادثات میں جیسے گم ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ جو دیکھتے ہی دیکھتے ہو گیا تھا۔ وہ اسے سمجھنے اور ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے سامنے زمین پر بیٹھی ہوئی اوشا بچے کو چھاتی سے چمٹائے اُسے بار بار چوم رہی تھی۔

بچہ جو پہلے ہی بھوک سے نڈھال تھا۔ اس چھینا جھپٹی میں جیسے بالکل چور ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اب اس کے بازو بھی حرکت نہیں کر رہے تھے، اور نہ وہ آنکھیں کھول سکتا تھا۔ البتہ ماں کی چھاتی کے ساتھ لگا ہوا وہ اس طرح منہ ہلا رہا تھا۔ جیسے خواب میں دودھ پی رہا ہو۔

"اِسے بھوک لگی ہے"۔ نرملا نے اس لڑکی سے اس طرح

کہا۔ جیسے کسی روٹھے ہوئے ساجن سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈا جاتا ہے"۔

"بھوک لگی ہے۔؟ میرے بیٹے کو بھوک لگی ہے؟" یہ کہتے کہتے اوشا نے جھٹ اپنی قمیص اٹھا کر بچے کا منہ اپنی چھاتی پر رکھ لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنا منہ اس کے منہ پر رکھ کر خود بلک بلک کر رونے لگی۔

نرملا نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ تو ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے جلدی سے اپنی انگلیاں دانتوں تلے دے دیں۔ اور پھر اس زور سے دانت بند کئے کہ انگلیوں سے خون بہنے لگا۔

بچہ ننگی چھاتی کی گرمی پاکر ماں کے تھنوں کو ڈھونڈنے کے لئے منہ مار رہا تھا۔ لیکن وہاں تھن کہاں تھے۔ وہ تو کسی ظالم نے چھری سے کاٹ دیئے ہوئے تھے۔

نرملا یہ دیکھ کر بے ہوش ہونے والی تھی، کہ اوشا نے بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر بچہ واپس اس کی گود میں پٹک دیا۔

"لو تم دودھ پلاؤ اسے — یہ میرا بچہ نہیں ہے۔ یہ میرا بچہ نہیں ہے ... ..."

اور یہ کہتے کہتے وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی قافلے کی بھیڑ میں گم ہو گئی۔ صرف اس کی آواز دور سے بھی آتی رہی۔

"یہ میرا بچہ نہیں ہے — یہ میرا بچہ نہیں ہے"

اس سے پہلے کہ نرملا اس نئے صدمہ سے سنبھلتی۔ آنند نے جھپٹ کر اس کی گود سے بچہ چھین لیا۔ اور جدھر وہ لڑکی گئی تھی۔ اسی طرف بھاگنے

ہی لگا تھا۔ کہ نرملا نے اس سے تیز تر دو قدم اٹھا کر اس کا راستہ روک لیا۔
" کیا کر رہے ہو۔ جانے دو اس بیچاری کو ——— لاؤ دے دو
اسے مجھے۔"

آنند نے آگے بڑھنے کے لئے زور کرتے ہوئے کہا "نہیں۔ یہ
تمھارا بچہ نہیں ہے۔ یہ میرا اور راوشا کا بھی نہیں ہے۔ یہ صرف اسی کا ہے،
"... تم نہیں جانتیں۔ کہ یہ سب صرف مجھے ستانے کے لئے آتے ہیں
اور پھر خود بھاگ جاتے ہیں۔ کبھی زہر کھا کر اور کبھی گولی کھا کر ... "

" تمھیں کیا ہو رہا ہے۔ بھگوان کے لئے دیا کرو۔ اپنے آپ پر
دیا کرو۔" اور یہ کہتے کہتے اُسے روکنے کے لئے اُس نے اپنی باہیں آنند اور
بچے کے گرد ڈال دیں ——— اُسے اب آنند پر ترس آنے لگ گیا تھا۔ اور
اسی ترس کی وجہ سے وہ اس کے قریب تر ہو گئی تھی۔

" اسے مجھے دیدو۔ اسے بھوک لگی ہے۔" اس نے بڑے پیار بھرے
انداز میں اُسے سمجھانا چاہا۔

" لیکن تمھاری بھوکی چھاتیوں میں بھی دودھ کہاں ہے؟" آنند
نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا

" ... اور یوں تو اب بچے کو کسی دودھ کی ضرورت ہی نہ تھی
وہ آنند کی گود ہی میں مر چکا تھا۔

سولھواں باب ۱۶

آنند بچے کی لاش کو سینے سے چمٹائے اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی نیند میں چل رہا ہو۔ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کسی بہت بڑی خلا میں قدم رکھتا ہوا کسی انجانی طرف کو جا رہا تھا۔ جہاں صرف وہ بچہ اس کے ساتھ تھا باقی سب کچھ اُسے اپنے سے بہت دور دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس سے باتیں کرتی ہوئی نرملا کی آواز بھی اُسے وسیع خلاؤں کے اس پار سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

نرملا اُسے بار بار سمجھا رہی تھی۔ کہ اب اس لاش کو پھینک ہی دینا چاہئے۔ لیکن آنند جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی زبان سے

بھی تو کچھ نہیں کہتا تھا۔ کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیا سوچ رہا ہے۔ صرف اسے سینے سے لگائے چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ اور بس۔

☆ ☆ ☆

آدھا دن اسی طرح بیت گیا۔ نرملا نے اسے ہر طرح سے سمجھایا۔ اس نے اسے سڑک کے کنارے پڑے ہوئے وہ زندہ بچے دکھائے، جنھیں ان کی مائیں اپنے ہاتھوں سے وہاں رکھ گئی تھیں۔ کیونکہ انھیں اٹھا کر چلنے کی ہمت اب ان میں باقی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ کئی کئی دن کی بھوک کے باعث ان کی چھاتیوں میں دودھ کی تو کیا شاید لہو کی بوند بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر یہاں تک بھی کہا کہ "تم سے زیادہ مجھے اس بچے کا دکھ ہونا چاہیے۔ کیونکہ میں اسے اپنا پریم کر بیٹھی تھی ۔۔ لیکن پھر بھی ۔۔ ۔۔ " اور اس سے آگے اس کے آنسوؤں نے گلا بند کر دیا۔

لیکن آنند کے تو آنسو بھی نہیں آئے۔ اسے تو جیسے اب کوئی دکھ ہی نہیں رہ گیا تھا ـــــــ بالکل اس بچے کی طرح۔ جسے اب بھوک پیاس گرمی یا تھکن کچھ بھی نہ رلاتی تھی۔ حتیٰ کہ بیچ بیچ میں کسی وقت آنند بھی اسے بچے کی طرح محض ایک لاش دکھائی دیتا۔ اور نرملا کانپ اٹھتی۔ پھر اس کے کانوں میں رحمان کا وہ فقرہ گونج جاتا۔ کہ " اس انسان کو مرنے نہ دینا" اور وہ نئے سرے سے کوشش شروع کر دیتی۔

٭ ٭ ٭

.... اور آخر کار وہ کامیاب ہو گئی۔

شاید آنند کو حقیقت کا احساس ہو آیا تھا۔ چنانچہ بچے کو ساتھ والے بنجر کھیت کی طرف لے جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے ..... وہ پھر سے محسوس کرنے لگ گیا تھا۔

سڑک سے پرے ہٹ کر وہ اور آگے بڑھنے لگا۔ تو نرملا نے سڑک کے کنارے سے آواز دی۔

"آگے کہاں جا رہے ہو"

"تو کیا یہیں خاک میں پھینک دوں"۔ آنند نے چڑچڑے سے انداز میں کہا "کوئی سایہ دار گھاس والی جگہ ڈھونڈ رہا ہوں"

اور وہ آگے بڑھتا گیا۔

چند ہی قدم آگے گیا تھا۔ کہ سامنے سے ایک سخت آواز آئی۔

"کدھر آ رہے ہو"

سڑک سے کوئی سو گز دور کھڑے ایک مسلمان فوجی نے ہاتھ میں ٹامی گن لئے ہوئے اُسے للکارا۔

"اس بچے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈھ رہا ہوں" آنند نے جواب دیا

"واپس سڑک پر چلے جاؤ۔ یہ پاکستانی علاقہ ہے"۔ سامنے کو را جواب آیا۔

اتنے میں اس سپاہی کی بندوق دیکھ کر نرملا بھاگی ہوئی آنند

کے قریب آ گئی تھی۔ اس نے آنند کو سمجھاتے ہوئے کہا " وہ دیکھو، تھوڑی تھوڑی دوری پر پاکستان کے فوجی آخری تک کھڑے ہیں۔ وہ آگے نہیں جانے دیں گے۔ لا، ادھر یہیں سہی "

اور یہ کہہ کر اس نے ایک ایسے مقام پر جہاں گھاس کے صرف چار پانچ پتے اُگے ہوئے تھے۔ زمین صاف کر کے اپنا وہ پھٹا ہوا دوپٹہ بچھا دیا۔ جس پر رحمان کا خون جما ہوا تھا۔

آنند نے دل سے اٹھتی ہوئی ایک ہوک کو سینے کے اندر ہی دبا کر بچے کو اس طرح اس پھٹے ہوئے دوپٹے پر ڈال دیا۔ جیسے کسی روتی ہوئی آنکھ نے اپنا آخری آنسو کسی کے خشک دامن پر گرا دیا ہو۔ ... ...

* * *

آہستہ آہستہ زملا اس کا بازو پکڑ کر اُسے پھر سڑک کی طرف لے گئی۔ دونوں خاموش تھے۔

سڑک کے قریب پہنچ کر آنند نے ایک بار پھر مڑ کر اُس طرف دیکھا۔ جہاں وہ بچہ پڑا ہوا تھا۔ اتنی ہی دیر میں دو گدھ اس کے قریب آ گئے تھے۔ دوسری طرف سے ایک کتے نے اسے گھیر لیا تھا۔ اور تینوں کا انداز کچھ ایسا تھا۔ جیسے ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں کہ " پہلے آپ ـــ!"

آنند نے ایک جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑا لیا۔ اور تیر کی طرح واپس اس مقام پر پہنچ گیا۔

دونوں گدھ اور وہ کتا وہاں سے ہلے نہیں۔ بلکہ اُسے دیکھ کر ان

کا انداز کچھ ایسا ہو گیا۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ ہمیں تو آج کل کھانے کو بہت ملتا ہے۔ لیکن آپ بھوکے معلوم ہوتے ہیں۔ تو چلئے — پہلے آپ ہی کھا لیں —!"

آنند نے اُس ننھی لاش کو اس طرح جھپٹ کر اٹھا لیا۔ جیسے کسی سے اُسے چھین رہا ہو۔ اور پھر بھاگ کر نرملا کے پاس آ گیا۔

"وہاں اسے وہ گدھ کھا جائیں گے"۔ اس نے پاگلوں کے سے انداز میں آ کر نرملا سے کہا۔ پھر میں اُسے کیا جواب دونگا"

"کسے —؟"

"اوشا کو —"

نرملا کو اب یقین ہو گیا۔ کہ بیماری میں اس کے دماغ پر بھی اثر ہو گیا ہے۔ رحمان نے ٹھیک کہا تھا۔ کہ وہ بیمار ہے۔ اس کا سارا بدن بھی اس وقت بھٹی کی ریت کی طرح تپ رہا تھا۔ نرملا کے دل میں اس کے لئے جو جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ ان حالات میں وہ جذبے اور بھی طاقت پکڑتے دکھائی دینے لگے۔ وہ دل ہی دل میں ایک جذباتی سا پروگرام بنانے لگی۔ جب وہ کل ہندستان کی سرزمین میں پہنچ جائے گی۔ جب یہ ہر وقت کی بھاگ دوڑ ختم ہو جائے گی۔ جب وہ کسی ریفیوجی کیمپ ہی میں سہی۔ لیکن چین سے کہیں بیٹھ سکیں گے۔ تو وہ اس دیوتا کی کس طرح سیوا کرے گی، کس طرح اسے اچھا کر دے گی۔ مولانا جسے دنیا کے سب سے بڑے انسان کی ٹکر کا سمجھتے ہیں۔ رحمان جس کے لئے مرتے ہوئے بھی سفارش کر گیا کہ

جو ایک مردہ بچے کو بھی دھوپ اور خاک میں نہیں ڈال سکتا۔ اس کے دکھوں کو دور کرنے کی خوش نصیبی اسے حاصل ہو گی۔ جس پر وہ زندگی بھر فخر کر سکے گی۔ اُسے یقین تھا۔ کہ یہ عظیم انسان ایک دن سنسار بھر کے دکھی انسانوں کا سہارا ہو گا۔ اور آج وہ اس کا سہارا بن رہی ہے ... ... "

وہ سوچتی ہوئی آنند کا بازو تھامے قافلے کے ساتھ آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ آنند بالکل چپ تھا۔ اور لاش اس کی گود میں تھی۔

قافلے کی رفتار بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ سلیمانکی کا پل چند فرلانگ دور رہ گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف پاکستان کے فوجیوں کی قطار گھنی ہوتی جا رہی تھی۔ جس سے سرحدی چوکی کے قریب آنے کا پتہ چلتا تھا۔

اب بھی کہیں کہیں سے کوئی چیخ بلند ہو کر کسی اور کے مرنے کی اطلاع دے جاتی تھی۔

* * *

اچانک قافلے کے اگلے حصوں میں کچھ ہلچل پیدا ہو گئی۔ اور دوسرے لمحے ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی ... ... اور پھر جوں جوں ہوائی جہاز آگے بڑھتا آیا۔ جیسے ایک چیخ و پکار کی لہر آگے بڑھتی چلی آئی۔

وہ ہوائی جہاز بہت کم اونچائی پر قافلے کے اوپر سے گزرتا ہوا روٹیاں پھینکتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس آہ و بکا اور چیخ و پکار سے خیال ہوتا تھا۔ کہ ہوائی جہاز روٹیاں نہیں بم پھینک رہا ہے۔

لوگ رو رہے تھے۔ لوگ چلّا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ ایک دوسرے سے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھین رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پیروں تلے روند رہے تھے۔

ایک عجیب دل ہلا دینے والا سماں تھا۔ جنھیں کچھ ٹکڑے مل گئے تھے۔ وہ خوشی کے مارے رو رہے تھے۔ اور جن کے ہاتھ میں آکر بھی روٹیاں چھن گئی تھیں۔ ان میں سے بعض یاس کی سرحد پار کر کے ہنسنے لگ جاتے تھے۔ آدھی سے زیادہ روٹیاں پیروں تلے کچلی گئی تھیں۔ اور ایک درجن سے زیادہ آدمی اور بچے بھی ان کے ساتھ اس طرح کچلے گئے تھے کہ ایک طرف ان کی چربی اور دوسری طرف خون میں کچلی ہوئی روٹیوں کے آٹے میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

اسی دھکم پیل کی لہر نے آنند اور نرملا کو بھی بُری طرح اپنی جھپیٹ میں لے لیا تھا۔ نرملا نے اپنی پوری طاقت لگا کر آنند کا بازو تھامے رکھا۔ اور آنند نے اس بچے کی لاش کو۔

لیکن ان تینوں کا ساتھ بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ نرملا نے اس کا بازو اس زور سے تھام رکھا تھا۔ کہ ایک دھکّے میں آکر نرملا کے قدرے دور ہونے سے آنند کا وہ بازو اس زور سے کھینچ گیا۔ کہ بچے پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اور بچہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے پوری طاقت لگا کر اسی جگہ کھڑے رہنے کی کوشش تو کی۔ لیکن پلک جھپکنے سے پہلے وہ جانے کتنی دور پہنچ گیا تھا۔

اتنی دیر میں بچہ نجانے کن لوگوں کے درمیان کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ انسانی جسموں کے درمیان رگڑتا ہوا ہی کچلا گیا۔ یا زمین پر پیروں تلے اس کا بھی ملیدہ ہو گیا ... ...
... ...

سترہواں باب ۱۷

دوبارہ جب قافلہ تیل کی طرف رینگنے لگا۔ تو آنند شاید اس امید پر سر جھکائے زمین کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ کہ شائد اس ننھے سے جسم کا کہیں نشان مل جائے۔

نرملا کی موجودگی کا بھی جیسے اُسے اب احساس نہ رہا تھا۔ وہ کیا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا اظہار اس نے صرف ایک ہی فقرے میں کر دیا تھا، کہ "جس نازک سے جسم کو میں گدھوں اور کتوں سے بچا لایا۔ اُسے میں ان انسانوں سے نہ بچا سکا۔۔۔ ۔۔۔"

اور یہ فقرہ اُس نے اس طرح کہا تھا۔ جیسے وہ کسی کے سامنے اپنی صفائی

پیش کر رہا ہو۔ وہ کس ان دیکھی شخصیت سے اس طرح باتیں کرنے لگ جاتا تھا۔ یہ نرملا کو پتہ نہ چل سکا۔ لیکن اس کے باوجود وہ آنند کے دل پہ لگنے والی چوٹ کی گہرائی ناپ سکتی تھی ______ اور وہ ڈر گئی۔

آنند اب بالکل خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے شرمندگی کے مارے زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ نرملا اس کی حالت دیکھ کر سہم گئی تھی۔ لیکن سلیمانی پل کو صرف چند گز دور رہ گیا دیکھ کر اس میں نئے سرے سے ہمت ابھی پیدا ہو رہی تھی۔

پھر سے اس کے ذہن میں وہ پروگرام گھومنے لگا تھا۔ جو اس نے ہندستان پہنچ کر آنند کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے سوچا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آنند کی کئی پچھلی باتیں اس کے ذہن میں اُجاگر ہوتی چلی جا رہی تھیں وہ کبھی نراس نہ ہوا تھا۔ اور غالباً اس خاموشی کے پردے کے پیچھے وہ آج بھی نراشا اور مایوسی سے لڑ رہا ہو گا۔

اُسے یاد آیا کہ ایک دن جب وہ خود بالکل نراش ہو چکی تھی، اسی آنند نے اُسے کہا تھا کہ "نہیں ابھی نراش ہونے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی انسان مرا نہیں۔ وہ بالکل ختم نہیں ہوا۔ ابھی وہ ایک انسان زندہ ہے۔ جس کا نام مہاتما گاندھی ہے۔ اور جب تک ایک بھی انسان زندہ ہے۔ نراش ہونے کی ضرورت نہیں"۔

اور پھر جب ایک دن مولانا نے پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی کے ایک اپدیش کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ " وہ پیغمبر بھی مایوس ہو کر

آج نہ صرف عورتوں کو زہر کھا لینے کا مشورہ دے رہا ہے۔ بلکہ خود بھی مرن برت کے ذریعہ خود کشی پر تل گیا ہے"۔ اور جب اس وقت بھی آنند نے امید کے چراغ کو اور روشن کر دیا تھا۔ اور مولینا نے اس کا درجہ مہاتما گاندھی جیسے اوتار سے بھی اونچا بنایا تھا۔ تو کس طرح اس نے چاہا تھا۔ کہ اس کے چرنوں میں سیس جھکا کر چندن دھوپ سے اس کی آرتی اتارے۔ وہ عظیم انسان جس کے متعلق اسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ ایک دن وہ سنسار بھر کے دکھیوں کا سہارا ہو گا۔ آج خود دکھی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ اسے دکھی نہیں رہنے دیگی۔ صرف چند گز کی بات رہ گئی تھی۔ پھر سلیمانکی کے پل کے اس پار ہندستان میں پہنچتے ہی وہ اسے پھر سے شانت کر سکے گی۔ وہ جو اسے دیوتاؤں سے بھی بلند تر دکھائی دینے لگ گیا تھا۔ جس کے ایک اپنچ بھی نیچے گر جانے سے جیسے یہ سارا نظام شمسی ڈگمگا کر ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر چکنا چور ہو جائے گا۔ وہ اس وقت اندر ہی اندر دکھ اور مایوسی کے ساتھ لڑتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اے کاش — وہ آرام سے پل کے اس پار چلا جائے۔ اے کاش ... ...

اور اس نے آنند کا ہاتھ چپکے سے تھام لیا۔ عقیدت کے مارے یا محبت کے مارے — ؟ مگر اس میں جذبات کی گرمی ضرور تھی۔

آنند نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کا لمس پاتے ہی ایک نظر اس کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے کئی ہزار خلاؤں کے اس پار سے دیکھ رہا ہو اور ... ... چلتا گیا۔

* * *

سیلمانکی کا پل صرف چند قدم پر رہ گیا تھا۔ پاکستانی فوج کے ہتھیار بند سپاہیوں کی ٹولیاں قافلے والوں کو اس طرح دیکھ رہی تھیں۔ جیسے کسی بازار کے ایک کونے میں بیٹھ کر تاش کھیلتے ہوئے آوارہ چھوکرے گزرتی ہوئی لڑکیوں کو تاڑتے ہیں۔

پل کے اُس پار ہندستانی فوج کے دستے دکھائی دے رہے تھے۔ اور بھی ہزاروں لوگ بڑے بڑے جھنڈے اٹھائے اُس طرف آنے والوں کا جیسے استقبال کر رہے تھے۔ اور "ہندستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ پاکستانی سپاہی ان نعروں سے اس طرح لاپرواہ اپنے کام میں مشغول تھے۔ جیسے کہیں کتے بھونک رہے ہوں۔

پل کے نیچے زور شور سے بہتا ہوا پانی بھی اب دکھائی دینے لگ گیا تھا۔

ان آخری چند گزوں میں قافلہ اور بھی آہستہ چلنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ اس میں کوئی حرکت ہی دکھائی نہ دیتی تھی۔ پاکستان کے فوجی محافظ بھی کسی قسم کی حرکت کے بغیر بندوقیں سنبھالے کھڑے تھے۔ اگر کہیں حرکت تھی۔ تو وہ پل کے نیچے بہتے ہوئے پانی میں تھی۔ لہریں ایک دوسری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ناچتی گاتی چلی جا رہی تھیں۔ جیسے یہ ان کا ہمیشہ کا معمول ہو۔ جیسے وہ ازل سے اسی طرح ایک دوسری کی گود میں بہتی چلی آئی ہیں۔ اور ابد تک اسی طرح بہتی رہیں گی۔

آنند نے دیکھا۔ کہ ان لہروں کو ان شرنارتھی قافلوں سے بھی کوئی

خاص دلچسپی نہیں - گویا نظام قدرت میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی جیسے اتنے لاکھ انسانوں کو اس طرح غیر انسانی حد تک برباد کر کے ذہنی اپاہج بنا دینا "مادر قدرت" کا ایک ادنیٰ سا کارنامہ ہو - اور جیسے ان لہروں نے اس سے پہلے اس طرح کے کئی کارنامے دیکھے ہوں - بابل میں، مصر میں، روم اور یروشلم میں، بلکہ خود ان ہی پنجاب کے میدانوں میں - جب نادر شاہ آیا تھا - جب تیمور آیا تھا - جب یہاں کے دراوڑوں کو مارتے کاٹتے ہوئے خود آریا لوگ آئے تھے ---- چنانچہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی -

وہ خاص طور پر نرملا کو مخاطب نہ کر کے کہنے لگا کہ "یہ لہریں ہمیشہ اسی طرح ہنستی گاتی رہی ہیں - اور قافلے گزرتے رہے ہیں - انھوں نے محمود غزنوی کی فوجیں بھی دیکھی ہیں - اور یونانیوں کے لشکر بھی - یہاں سے افغان، ہندو، سکھ اور انگریز فوجوں کے مسلح قافلے گزرے ہیں - کبھی فتح کے فخر میں جھومتے ہوئے اور کبھی شکست کی شرم سے سر جھکائے - اور یہ لہریں اسی طرح اُن پر بھی ہنستی رہیں - اور ان پر بھی - وہ آئے تھے - اور گزر گئے تھے - کوئی ابدی نہ تھا - کسی کی فتح یا شکست ابدی نہ تھی ... "

وہ کہہ رہا تھا - اور نرملا کو اسی قسم کی ایک بحث کے دوران میں کہے ہوئے خود آنند کے چند فقرے یاد آ رہے تھے - اور اس نے آنند کے ذہن کو اپنے گزشتہ نظریوں کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انھیں صرف دہرا دیا - کہ " دائمی ہے صرف ان لہروں کی ہنسی اور ان کا شانتی دائک سنگیت - اور یا پھر اس ہنستی گاتی ابدیت کے کنارے وچرنے والا وہ

ایک انسان ۔ جو ہر وقت میں ہر جگہ موجود رہا ہے ۔ کبھی عیسیٰ کی شکل میں ۔ کبھی محمد کی صورت میں یا بدھ، کرشن اور گاندھی کی شکل میں ۔۔۔ ۔۔۔ "

اور آنند ہی کا یہ فقرہ دہراتے ہوئے اس کے اندر سے ایک خواہش پیدا ہو رہی تھی ۔ کہ وہ آنند کا نام بھی ان ناموں کے ساتھ ہی لے دے ۔ لیکن اس نے ایسا کیا نہیں ۔ صرف آنند کا ہاتھ اور زور سے پکڑ لیا ۔

اور آنند اس کے فقروں پر غور کرتا ہوا سوچ رہا تھا کہ " ہاں ابدیت تو صرف اسی سکون ریز ترنم کو حاصل ہے ۔ یا پھر لہروں کی اس طنزیہ ہنسی کو یا سکون ابدی ہے یا طنز ۔ عمل ، فتح اور شکست ۔۔۔ ان کو دوام حاصل نہیں ۔" اور یہ سوچتے ہوئے اس کا جی چاہنے لگا ۔ کہ وہ اس عمل کے قافلے سے الگ ہو کر ان لہروں میں چھلانگ دے ۔ اور ان کے سکون اور طنز کا ابدی رفیق بن جائے ۔

اتنے میں نرملا کے ہاتھ کی گرفت مضبوط تر ہو جانے پر اس نے اس کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا ۔ جو پوچھ رہی تھیں کہ " کیا تم اس طرح ایک گرتے ہوئے پہاڑ کو سنبھال سکو گی ؟ "

نرملا جو اس کی نگاہوں کی گہرائیوں کو اب ناپنے لگ گئی تھی ، اس کے اس بے بسی کے انداز سے اُسے ایک چوٹ سی پہنچی ۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہوا ۔ جیسے ایک بچہ اپنا سب سے پیارا کھلونا ٹوٹ جانے پر روتے روتے ماں کے پاس چلا آیا ہو ۔ اس کا جی چاہا کہ آنند کو ماں کی طرح چھاتی سے چمٹا لے ۔ اور اُسے کہے کہ " نہیں میرے ہوتے تمہیں دکھی ہونے کی

ضرورت نہیں"۔ اور جس طرح روتے ہوئے بیٹے کو دیکھ کر ماں اس کے ہر قصور کو معاف کر کے اس کو مظلوم و معصوم سمجھنے لگ جاتی ہے۔ اسی طرح اُسے دیکھ کر آنندی کے پُرانے فقرے دہرانے کو اس کا جی چاہا کہ "اس فساد میں نہ ہندو کا کچھ بگڑا۔ نہ مسلمان کا نقصان ہوا۔ دونوں نے اِدھر کا نقصان اُدھر سے پورا کر لیا۔ صرف نقصان ہوا تو انسان کا ——— اور لٹ گئی تو انسانیت ——!"

بہرصورت وہ اس پل کو نہایت تیزی سے پار کر جانا چاہتی تھی۔ اس پار اسے سکون کی امید تھی۔ اس پار پہنچنے پر وہ آنند کا علاج کر سکے گی۔ قافلے کی سست رفتاری بلکہ بے رفتاری کے باوجود اُسے ایک ہلکا سا اطمینان تھا کہ آخر پل تو آ پہنچا۔ آنند اب تک بالکل نراش نہیں ہوا تھا۔ اور شاید اس کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے وہ ہندستان کی سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔

* * *

اور آخر جب پہلا قدم اس نے پل پر رکھا۔ تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے آدم خور راکھشسوں کی بستی سے نکل کر وہ دیوتاؤں کی دھرتی پر قدم رکھ رہی ہو۔ پل کے اکھڑے ہوئے پتھر اس کے پیروں کو اتنے نرم محسوس ہونے لگے جیسے وہ کھیر ساگر میں شیش ناگ کی شیّا پر قدم رکھ رہی ہو۔ جہاں بھگوان وشنو لیٹے ہوئے ہیں ——— بھگوان وشنو، جو سارے سنسار کو پالتے ہیں

وہ اس مقام تک ایک دیوتا کا ہاتھ پکڑے ہوئے پہنچ گئی تھی۔ یہ دیوتا بھی تو بھگوان وشنو کی طرح اس سنسار کو مرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا ——— اور اس نے عقیدت سے لدی ہوئی نگاہیں اٹھا کر آنند

کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لیکن وہاں اب بھی سکون نہیں تھا۔ وہ ابھی تک لڑ رہا تھا۔ دکھ اور مایوسی نے ابھی تک ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اور نراشا اور آشا کی سرحد پر کھڑا وہ بہادر اپنی طاقت کے آخری ذروں کو اکٹھا کر کے مقابلہ کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

پل کے کونے پر کھڑا پاکستان کا آخری سپاہی چند قدم پیچھے رہ گیا تھا۔ اور چند ہی قدم کی دوری پر پل کے دوسرے کنارے سے ہندستانی سپاہیوں کی قطار شروع ہوتی تھی۔ درمیان میں صرف یہ پل تھا۔ اور اس کے نیچے بہنے والی لہریں۔ جو ایک دوسری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ناچتی گاتی چلی جا رہی تھیں۔

انھیں اس طرح مست اور خوش دیکھ کر نرملا کے دل میں بھی اسی طرح خوشی سے لہرانے کی تمنا بیدار ہو رہی تھی۔ وہ آنند کو ڈھونڈتے ہوئے ہی نراشا اور اندھیرے کی بستی سے نکال لائی تھی۔ وہ تھک گیا دکھائی ضرور دیتا تھا۔ لیکن ہتھیار ڈال دینے کے آثار ابھی اس کے چہرے پر پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اور وہ اسے اسی طرح لڑتے لڑتے ہی روشنی اور امید کی حسین وادیوں میں لے جا رہی تھی۔ چند قدم ——— صرف چند قدم ... ... اور ... ...

"آنند۔ آنند" پیچھے سے کوئی آواز دے رہا تھا۔ جیسے نراشا کی بستی اسے واپس بلا رہی ہو۔

نرملا نے چاہا کہ آنند مڑ کر نہ دیکھے۔ وہ جانتی تھی کہ دکھ کے بوجھ سے وہ اس قدر پس چکا تھا۔ کہ اب ایک نیا تنکا بھی اس کی کمر توڑ کر رکھ دیگا چنانچہ اس نے آنند کا ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور ایک تیز قدم آگے بڑھایا۔

"آنند ۔۔۔!" آواز میں ایک درخواست تھی۔ اب کے آنند نے بھی سن لیا۔ اور مڑ کر دیکھا بھی۔

مولینا پل کے پچھلے کنارے پر کھڑے اُسے بلا رہے تھے۔ پاکستانی سپاہی نے انھیں آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ اور وہ آوازیں دیئے جا رہے تھے۔

مولینا کو دیکھ کر نرملا نے بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ اُن آوازوں نے جو ڈر اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ وہ ان کی صورت دیکھتے ہی ہوا ہو گیا۔ بلکہ اُسے ایک طرح کی راحت کا احساس ہونے لگا۔ کہ اب وہ آ گیا ہی جو اس تھکے ہوئے انسان کو تقویت پہنچائے گا۔ اور ایک نیا جوش،

آنند منہ موڑ کر عجیب سی نظروں سے مولینا کی طرف صرف دیکھتا رہا۔ ان کی طرف بڑھا نہیں۔ نرملا نے اس کے تذبذب کو نہ سمجھتے ہوئے کہا "مولینا بلا رہے ہیں ۔!"

"ہاں ۔۔۔ دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس بچے کی لاش پھر اٹھا لائے ہیں ۔ وہ مجھے کچھ بھولنے کیوں نہیں دیتے۔ وہ اُسے پھر کیوں لے آئے ہیں؟" ۔ آنند کی آواز جیسے اس کی آواز معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"نہیں ۔یہ تو ایک زندہ بچہ ہے" نرملا نے کہا

اتنے میں مولینا اس سپاہی سے اپنا آپ چھڑا کر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ سپاہی نے بندوق تان دی۔ اور نالی کا منہ ان کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ یہ پتہ نہ لگ سکا کہ وہ نشانہ کس کا لے رہا تھا۔ مولینا کا یا آنند کا۔

مولینا نے قریب آتے ہی گود میں اٹھایا ہوا بچہ آنند کی طرف بڑھا دیا: "خدا کا شکر ہے کہ تم آخری وقت میں بھی مل گئے۔ اب اس بچے کے متعلق بھی مجھے اطمینان ہو جائے گا"

"یہ کون ہے؟" آنند نے بڑے سرد سے انداز میں پوچھا

"یہ ۔۔؟" مولینا نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا: "تم اسے نہیں جانتے؟ اس ننھے آدم کو، اس آنے والی نسل کو، یہ آنے والے کل کا انسان ہے"۔

"آج کے انسان کے ساتھ جو تم نے کیا، کیا وہ کافی نہیں تھا؟ تم اتنے ظالم کیوں ہو گئے ہو مولینا۔ آج کی نسل کا خون کرنے کے بعد اس آنے والی نسل پر بھی کیوں ظلم توڑ رہے ہو۔ تم نے اسے مار کیوں نہیں ڈالا ۔۔؟"

"اسے مار ڈالتا ۔ میں؟"۔ مولینا نے اس کے پیارے سے نازک جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم اسے آرام سے کیوں مار ڈالتے؟" آنند کے چہرے

پرطنز مسکرا رہی تھی "تم تو یہ چاہتے ہو۔ کہ یہ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرے۔ اور پھر جب اس کی ماں ملے۔ تو اس کی چھاتیاں بھی کٹی ہوئی ہوں۔ میں اب تمھیں پہچان گیا ہوں۔ اوشا کو میرے ساتھ بھیج کر تم نے اسے زہر کھلا دیا۔ اس لڑکی کو کیمپ میں چھوڑ کر اس کے پیچھے سانپ بھیج دیئے۔ ماں کی چھاتیاں کاٹ کر تم بچوں کو دے جاتے ہو۔ میں تم سب کو پہچانتا ہوں۔ تم خدا کے ان بندوں کو ان ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس لئے زندہ رکھنا چاہتے ہو تاکہ یہ ہندستان اور پاکستان کے ریفوجی کیمپوں میں پڑے پڑے سڑ جائیں۔ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔ طوفانی دریاؤں میں ڈوب جائیں ——— لیکن وہ جو انھیں موت کا سکون بخشنا چاہتے ہیں۔ تم انھیں روکتے ہو۔ میں تمھیں جان گیا ہوں۔ تم سب انسان ہو۔ تم سب انسان ہو۔ میں اس معصوم کو تمھارے چنگل سے آزاد کراؤں گا۔ میں اسے بچاؤں گا۔"

اور یہ کہتے کہتے اس نے مولینا کے ہاتھ سے بچے کو چھین کر ایک گیند کی طرح پل کے اوپر سے اچھال کر دریا میں پھینک دیا۔

لہریں تجسس کے مارے ذرا ایک دوسری سے پرے ہٹ گئیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے پھر انھوں نے ایک دوسری کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اور اسی طرح ترنم اور طرب کی لے پر ناچنے لگیں۔

مولینا کی آنکھوں میں آنسو بھی نہ آسکے۔ انھوں نے پتھر کی طرح جمے ہوئے ہونٹوں کو بمشکل ہلاتے ہوئے اتنا ہی کہا ——— "افسوس

آخر انسان خودکشی کر رہا ہے"

"اگر وہ خودکشی نہیں کرے گا۔ تو میں اُسے مار ڈالوں گا۔ میں اسے مار ڈالوں گا ... ... میں اُسے مار ڈالوں گا۔" یہ کہتے کہتے آنند کے ہاتھوں کی گرفت مولینا کے گلے پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ وہ ان کا گلا گھونٹتا ہوا چلا جا رہا تھا ——— میں اسے مار ڈالوں گا ... ... میں اُسے مار ڈالوں گا ... ... انسان خودکشی کر رہا ہے ——— ہا ہا ——— انسان خودکشی کر رہا ہے ——— ہا ہا ... ... " اور آنند کے قہقہے لہروں کے طنزیہ شور سے بھی بلند تر ہونے لگے۔

چاروں طرف ایک ہنگامہ ہو گیا تھا۔ اور بے حد شور

"مسلمان کو مار ڈالا"

"نہیں۔ مسلمان نے مار ڈالا"

اور کسی کو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کہ کس نے کسے مار ڈالا۔ صرف ایک قہقہہ سنائی دے رہا تھا۔ اور اسی قہقہے میں شامل اجاگر سنگھ اپنا وہ کھلونے کا بنا ہوا بھالا کبھی مولینا کی چھاتی میں گھسیٹر دیتا اور کبھی اسے نکال لیتا۔

چاروں طرف آوازوں کا شور تھا

"مار ڈالا ——— مار ڈالا"

اور ان آوازوں کے اوپر ہی اوپر ایک اور آواز دی

"میں بچ گیا ـــ میں بچ گیا" اجاگر سنگھ خوشی سے پاگل ہو کر چلا رہا تھا۔

پاکستان کے سپاہی نے بندوق داغ دی

اس کے جواب میں ہندستان کے سپاہی نے بھی دھائیں دھائیں شروع کر دی۔

"دھائیں۔ دھائیں" پھر قہقہے ـــ "ہاہا ـــ ہاہا ـــ ہاہا ـــ مار ڈالا ـــ مار ڈالا ـــ میں بچ گیا ـــ ہاہاہا ـــ ہاہاہا ـــ"

اور پل کے دونوں کناروں سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

"ہندستان زندہ باد"

"پاکستان زندہ باد"

"ہندستان زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد"

اور ان آوازوں کی زد میں آئی ہوئی نرملا چاروں طرف سے آتی ہوئی آوازوں کی چوٹیں کھاتی ہوئی بے ہوش ہوتی جا رہی تھی۔ صرف ایک سوال بار بار آکر اس کے مفلوج ہوتے ہوئے دماغ سے ٹکرا رہا تھا۔ کہ کیا اب انسان کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے؟"

آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں "انسان خودکشی کر رہا ہے ... میں اسے مار ڈالوں گا ... مار ڈالا ... میں بچ گیا ... ہاہاہا ... ہندستان زندہ ... پاکستان ... "

اور ان نعروں کے اوپر ہی اوپر ایک اور نعرہ بجانے کہاں سے آ کر اس کے ذہن پر بھرپور ضربیں لگانے لگا۔ کوئی شیطانی قہقہہ پکار رہا تھا ——۔ انسان مردہ باد —— انسان مردہ باد۔"

اور پھر سب کچھ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گیا۔

"ہندستان زندہ باد —— پاکستان زندہ باد —— انسان مردہ باد —— انسان مردہ باد" ——————

(مطبوعہ قادری پریس لور منزل محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳)